ظفر علی خاں

ادیب و شاعر

تالیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ایم - اے، پی ایچ - ڈی

استاد شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی

سلسلہ مطبوعات ۱۱

مکتبہ خیابان ادب

۳۹ - چیمبرلین روڈ

لاہور

ظفر علی خاں

ادیب و شاعر

تالیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
ایم - اے، پی ایچ - ڈی
استاد شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی

مکتبہ خیابان ادب
۳۹۔ چیمبرلین روڈ
لاہور

سال طباعت : ۱۹۶۷ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار

مطبع : جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور

طابع و ناشر : مرزا نصیر بیگ

ادارہ : مکتبۂ خیابان ادب

قیمت : سات روپے پچاس پیسے



مولانا ظفر علی خان
(۱۹۱۲ء میں)

کچھ اس تالیف کے بارے میں

مولانا ظفر علی خاں کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے شعر و ادب سے کون ہے جو اس صدی کے نصف اول میں متأثر ہوئے بغیر رہا ہو۔ مولانا سے راقم کے ذہنی روابط کا سلسلہ سکول کے زمانۂ طالب علمی سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک کشمیر اور مسجد شہید گنج کا جوش و خروش تازہ تھا۔ "زمیندار" کا بالالتزام مطالعہ حوادث گرد و پیش اور افکار عالم سے با خبر رہنے کے علاوہ زبان و ادب کی تحصیل کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اپر مڈل کی جماعتوں میں ہمارے عربی و اردو کے استاد (جو کشمیر کے ایک سید تھے) خاص طور پر ہمیں تلقین کیا کرتے تھے کہ "زمیندار" اور خصوصاً مولانا ظفر علی خاں کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا کریں تا کہ زبان و بیان کا سلیقہ آئے۔ وہ خود بھی "زمیندار" کے خاص نمبر اور ہفتہ وار ایڈیشن بڑی حفاظت سے رکھا کرتے۔ مولانا کے شعر و ادب کا مطالعہ کرنے کے علاوہ انہیں دیکھنے اور ان کی گفتگو اور تقریر سننے کے بھی کئی مواقع میسر آئے۔ سیاسی شعور کی بیداری کے لحاظ سے بٹالہ پنجاب کے چند منتخب شہروں میں سے ایک تھا، جو تحریک خلافت کے بعد تحریک حریت کشمیر کا بھی ایک اہم مرکز رہا۔ مولانا کو اسی بنا پر اس شہر سے ایک خاص لگاؤ رہا اور وہ اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ ایک ادنیٰ عقیدت مند کی طرح راقم نے انہیں دور سے دیکھا، یا نجی مجلسوں میں کسی کونے میں بیٹھ کر ان کی باتیں

سنیں ۔ پاس ادب نے قریب نہ جانے دیا ۔ جو لوگ ذرا بے تکلف ہوتے وہ ان سے فرمائشی موضوعات پر شعر بھی سنتے اور ان کے شریک سیر ہونے کی جرأت بھی کرتے ۔ تقسیم ملک سے کچھ پہلے مولانا کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں ۔ تاہم وہ بٹالہ میں آتے رہے ۔ راقم نے آخری بار انہیں یہاں مرکزی اسمبلی کے انتخاب والے دن دیکھا ۔ سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لاہور، امرتسر مختلف شہروں کی انتخابی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے عصر کے وقت وہ بٹالہ پہنچے ۔ دس پندرہ منٹ کیمپ میں ٹھہرے اور پھر گورداسپور روانہ ہو گئے ۔ قسمت لاہور کے یہ اضلاع ان کے انتخابی حلقے میں تھے جہاں سے وہ بھاری اکثریت سے دوسری بار مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۔

قیام پاکستان کے بعد جب ہجرت کرکے ہم لاہور آئے تو مولانا صاحب فراش تھے ۔ چند ایک بار انہیں دور سے دیکھا ۔ اب وہ ماضی کا ایک افسانہ بن چکے تھے ۔ آخری بار انہیں کرم آباد میں دیکھا، جنوری ۱۹۵۵ء میں؛ غروب آفتاب کا وقت قریب آ چکا تھا! اس زمانے میں مولانا کے شعر و ادب پر کچھ لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا ۔ آغا شورش کاشمیری بھی مولانا کی حیات پر کام شروع کر چکے تھے ۔ لیکن بنیادی مآخذ نہ انہیں مل رہے تھے نہ راقم کو مل رہے تھے ۔ جن سے زیادہ توقع تھی، وہی سب سے زیادہ مایوس کر رہے تھے ۔ مولانا کے بھائیوں چودھری غلام حیدر خاں، پروفیسر محمود احمد خاں اور جناب حامد علی خاں سے ملا (پروفیسر حمید احمد خاں ان دنوں کیمبرج میں تھے) گفتگو کے دوران ان سے کچھ مفید باتیں معلوم ہوئیں لیکن مولانا کی حیات اور کارناموں کے مآخذ ان حضرات کی

دسترس سے بھی باہر تھے ۔ بعض بزرگوں کے بارے میں سنا تھا کہ ان کے پاس بہت کچھ محفوظ ہے ۔ حاضر ہوا ' خوش اخلاقی سے پیش آئے ' لیکن گوہر مقصود تک رسائی ممکن نہ ہوئی ۔ بعض دوستوں نے میری دستگیری کی اور دکن ریویو ' پنجاب ریویو اور ستارۂ صبح کے متفرق فائل مہیا کر دیے ۔ لیکن اصل مآخذ "زمیندار" کا فائل دستیاب نہ ہوا ۔ کچھ تھوڑا بہت کام کیا لیکن طبیعت نہ مانتی تھی کہ اسے چھاپا جائے ۔ اکثر احباب نے تقاضا کیا جسے میں ٹالتا رہا ۔ مصروفیات کا دائرہ بھی پھیلتا گیا ۔ کبھی کبھی نامکمل مسودات دیکھ کر خیال آتا تھا کہ یہ کام بھی کرنا ہے ۔ پھر اسے وعدۂ فردا پر ٹال جاتا تھا ۔

کشمکش کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ گزشتہ برس گرمی کی چھٹیوں سے ذرا پہلے آغا شورش کاشمیری صاحب' جناب احسان دانش کے ہمراہ کالج میں تشریف لائے اور ظفر علی خاں کے مسودے کے بارے میں گفتگو شروع کر دی ۔ میں نے بہت ٹال مٹول سے کام لیا اور مسودے کی ناتمامی اور اپنی عدیم الفرصتی کا عذر معقول بھی پیش کیا لیکن آغا صاحب کے سامنے یہ سب باتیں ریت کی دیوار ثابت ہوئیں ۔ بالآخر ان کے اصرار کے سامنے مجھے اپنی شکست ماننی پڑی اور وعدہ کیا کہ اس سال (۱۹۶۶ء) موسم گرما کی تعطیلات میں مسودے پر نظر ثانی کر کے طباعت کے لیے پیش کر دوں گا ۔ چنانچہ تعطیلات میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ "ظفر علی خاں" کے مسودے کو بھی دیکھنا ' بلکہ از سر نو لکھنا شروع کیا ۔ دو تین ابواب تیار ہوئے تھے کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں ۔ آغا صاحب سے طے ہوا تھا کہ مولانا کی

دسویں برسی (نومبر ۱۹۶۶ء) کے موقع پر یہ کتاب شائع ہو جائے گی۔ تیار شدہ مسودہ طباعت کے لیے بھیجنے کا ابھی ارادہ ھی کر رھا تھا که آغا صاحب سرکاری مہمان بن کر اسی مہمان خانے میں تشریف لے گئے جہاں ان کے استاد مولانا ظفر علی خاں تحریک خلافت کے سلسلے میں چار پانچ سال گزار چکے تھے۔

اب کیا ہو؟ اگر مسودہ مطبع میں نہ جائے تو آگے کام کرنے کی امنگ ختم ہو جاتی ھے۔ اسی شش و پنج میں تھا که مرزا نصیر بیگ نے کتاب کی طباعت کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ مسودہ ان کے حوالے کیا اور آگے کام جاری رکھا۔

اسی اثنا میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان سے اطلاع ملی که "زمیندار" اور "انقلاب" کے فائل سوسائٹی نے خرید لیے ھیں۔ جس گوھر نایاب کے دیکھنے سے دس بارہ سال پہلے محروم رھا تھا، وہ اب میسر آ گیا۔ بعض اہم اور ضروری امور طے کرنے کے لیے "زمیندار" کے فائل دیکھنے شروع کیے۔ زیر طبع مسودے میں کچھ ترمیم و اضافه کیا۔ پھر بھی بعض تسامحات باقی رہ گئے۔ مثلاً سفر انگلستان کے سلسلے میں بیان ھوا ھے که "ظفر علی خاں ابھی سفر ھی میں تھے که کانپور کی مچھلی بازار مسجد کا حادثه (اگست ۱۹۱۳ء) پیش آیا" (ص ۸۹) اور "جب ظفر علی خاں ستمبر ۱۹۱۴ء میں واپس وطن پہنچے تو جمہور نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور دهلی و لاھور میں ان کی آمد پر عظیم الشان جلوس نکالے" (ص ۹۰)۔ یه درست نہیں۔ اصل صورت یه ھے که مولانا نے اس زمانے میں دو بار انگلستان کا سفر کیا۔ پہلی بار نومبر ۱۹۱۲ء میں یہاں سے روانه

ہوئے اور انگلستان، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے استنبول (قسطنطنیہ) پہنچے - بارگاہ خلافت میں باریاب ہوئے - شتلجہ کے محاذ جنگ کو دیکھا اور پھر سلطنت ترکی کا دورہ کیا - مصر میں علما اور صحافیوں سے ملاقات کی - "حمیدیہ" جہاز پر غازی رؤف پاشا سے ملے، اور جولائی ۱۹۱۳ء میں واپس وطن پہنچے - اس موقع پر دھلی اور لاھور میں عظیم‌الشان جلوس نکلے - ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو زمیندار کی ضمانت ضبط ہوئی اور ۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء کو آپ پھر ولایت روانہ ہو گئے، جہاں پریس ایکٹ کے بارے میں تقریریں کیں اور ۲۰ ستمبر ۱۹۱۴ء کو بڑی خاموشی سے لاھور میں مراجعت فرمائی - ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا -

چند برس پہلے مولانا ظفر علی خاں پر آغا شورش کاشمیری اور جناب اشرف عطا کی کتابیں چھپ چکی ھیں - راقم نے ان سے بھی استفادہ کیا ھے جس کا اعتراف نہ کرنا کفران نعمت میں شمار ھوگا - تاھم راقم کا موضوع اور طریق کار اپنے پیش روؤں سے قدرے مختلف ھے اس لیے اس تالیف میں قارئین کو تکرار کا بہت کم احساس ھوگا - راقم بھی مولانا کا ایک عقیدت مند رھا ھے، اگرچہ قرب اور براہ راست استفادے سے محروم رھا - عقیدت سے قطع نظر اس تالیف میں تنقید کے فریضے سے عہدہ برآ ھونا تھا - اپنی کسی محترم شخصیت کے ادبی کارناموں کا جائزہ لے کر ان کی قدر و قیمت متعین کرنا بہت مشکل کام ھے - بہر حال اس مشکل سے دوچار ھونا پڑا - اب قارئین ھی فیصلہ کر سکتے ھیں کہ یہ تنقید کس حد تک بے لاگ ھے اور مولانا کے ادبی مقام کو متعین کرنے میں راقم کہاں تک کامیاب ھو سکا ھے -

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس تالیف کو طبع شدہ صورت میں منظرِ عام پر لانے کا سہرا جناب آغا شورش کاشمیری کے سر ہے۔ اگر وہ مُصِر نہ ہوتے تو شاید یہ مسودہ ابھی چار پانچ سال تک اور میری غفلت کا شکار رہتا۔ پھر زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ جو کام ہو جائے، وہی خوب ہے۔ راقم آغا صاحب کا بہت ممنون ہے، اگرچہ حالات کی مجبوری کے باعث وہ خود اس کی طباعت کا انتظام نہ کر سکے، تاہم اس کو طبع شدہ صورت میں دیکھ کر انہیں یقیناً خوشی ہوگی۔ مرزا نصیر بیگ کی توجہ اور محنت کا بھی ممنون ہوں۔ اپنی خامیوں اور نارسائیوں کا راقم کو اعتراف ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو اس سے راقم کو مطلع فرمائیں۔ اگر باردگر طباعت کا موقع آیا تو کرم فرماؤں کے مشوروں کو مدنظر رکھا جائے گا۔

میں ان احباب اور بزرگوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے بعض نایاب مآخذ کی فراہمی میں مدد دی۔ مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم) نے اس تالیف میں بہت دلچسپی لی تھی اور بعض مفید مشورے بھی دیے تھے۔ افسوس، اب اسے مطبوعہ صورت میں دیکھنے کے لیے وہ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر محمود احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ، جناب حامد علی خاں، پروفیسر علم الدین سالک اور دوسرے بزرگوں کی عنایات کے لیے بھی سپاس گزار ہوں۔

اورینٹل کالج، لاہور — غلام حسین ذوالفقار

۲۰ مئی ۱۹۶۷ء — استاد شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی

انتساب

تحریک خلافت اور تحریک پاکستان کے
ایک مخلص کارکن اور اسلام کے ایک پرجوش سپاھی

مولانا نور محمد خاں

کے نام

*

زندہ رہے پائندہ رہے نورِ محمد
اسلام کا نام اُس نے بٹالہ میں اچھالا

(ظفر علی خاں)

مندرجات

پہلا باب

ظفر علی خاں کا عہد

(سیاسی اور سماجی حالات کا مختصر جائزہ)

میں خود ہی اپنے جرم کا ہوتا ہوں معترف
ناحق وہ کر رہے ہیں مرے جرم کی تلاش
میرا گناہ یہ ہے کہ کیوں میں نے کر دیا
راز غلامی صد و پنجاہ سالہ فاش

ظفر علی خاں برعظیم پاکستان و بھارت کی اُن چند ہمہ گیر شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے تاریخ کے ایک ہنگامہ خیز دور میں آنکھ کھولی، زندگی کے ہنگاموں میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے خون جگر سے اپنے عہد کی داستان خونچکاں میں رنگ عمل بھرا۔ ظفر علی خاں ایک فرد نہیں تھے، بلکہ ایک قوم اور ایک عہد کی تاریخ تھے۔ اُن کی ذات میں سینکڑوں ہنگاموں نے پرورش پائی، بیسیوں تحریکوں نے جنم لیا اور جہاد آزادی کو منزل مراد تک پہنچایا۔ ظفر علی خاں کی سیرت و کردار اور اُن کے شعر و ادب کے مطالعے کے سلسلے میں سیاست، معاشرت اور تہذیب کی اُس وسیع تر رزم گاہ کو نگاہ میں رکھنا پڑے گا جس میں انہوں نے اپنے قول اور عمل

سے ولولۂ انقلاب کی روح پھونکی ۔ لہٰذا اس تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کا یہاں ایک اجمالی سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے ۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے برعظیم کی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا تھا ۔ قدیم عہد اپنی مخصوص تہذیبی و معاشرتی روایات کے ساتھ ختم ہوا ۔ جدید عہد اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ شروع ہوا ۔ قدیم عہد اپنی بعض خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود عام انسانی نقطۂ نظر سے نسبتاً پرسکون اور خوش حال زندگی کا آئینہ دار تھا ۔ نظام حکومت اگرچہ شخصی اور جاگیردارانہ تھا لیکن مسلمانوں کی روا داری اور مسلمان حکمرانوں کی وسیع المشربی اور عام رعایا کو اپنا کنبہ اور خود کو اس کنبے کا سربراہ سمجھنے کی روش نے اس ملک کے مختلف العقیدہ لوگوں میں یک رنگی کا ایک ایسا تصور پیدا کر رکھا تھا کہ جس کی بدولت عام باشندوں کے لیے معاشرتی انصاف، معاشی ترقی اور اپنے اپنے مذہبی طریقوں پر چلنے کے مواقع بڑی فراوانی سے میسر تھے ۔ مختلف نسلی گروہ اور مذہبی طبقے ملک میں موجود تھے لیکن اس اختلاف مذہب و مسلک نے کبھی ناخوشگوار سیاسی رنگ اختیار کر کے عداوت اور دشمنی کے بیج نہیں بوئے تھے ۔ بقول ذوق :

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

مغرب کی استعماری قوتوں نے مغلیہ حکومت کے سیاسی اختلال و زوال سے فائدہ اٹھا کر معاشرتی زندگی کے اس تار و پود کو بکھیرنا شروع کر دیا ۔ سامراجی تسلط کے نتیجے میں معاشی استحصال کے علاوہ یہاں کے مختلف نسلی اور لسانی تعصبات اور مذہبی احساسات کو اُبھار کر عداوت اور دشمنی کے بیج بوئے گئے ۔ '' پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو '' کی سامراجی حکمت[۱] کو جس کامیابی سے اس ملک میں بروے کار لایا گیا اور جس طرح یہاں کے بعض موقع پرست عناصر اس سامراجی حکمت کے آلۂ کار بنے ' اس کی مثال شاید ھی کسی دوسرے ملک کی تاریخ میں ملے ۔ انقلاب ۱۸۵۷ع میں

---

(۱) واقعۂ انقلاب کے ایک دو برس بعد لارڈ الفنسٹن (مؤلف تاریخ ھند) نے جو اس زمانے میں بمبئی کے گورنر تھے ' یہ فرمایا تھا :

'Divide et impera was the old Roman Motto, and it should be ours.' *(Minute May, 14, 1959.)*

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک قطعہ '' تدبیر قیام سلطنت '' اس حکمت عملی کی عکاسی بڑی عمدگی سے کرتا ہے :

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے ' اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

ہندوستانیوں کی ناکامی نے جہاں اُن کے اجتماعی نظام معاشرت کا یہ خوشگوار سلسلہ ختم کر دیا ، وہاں نئے نظام حکومت کے قیام کے بعد تعلیم اور معاش کے نئے سلسلے یہاں کی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار و روایات کو متأثر کرنے لگے - سیاسی محکومی کے بعد ذہنی محکومی کے خوش نما جال بچھ گئے - حاکم قوم کی تہذیب و معاشرت اور ان کی ہر ادا محکوموں کے لیے معیار تقلید بن گئی - بقول اکبر :

فتنہ اُن آنکھوں سے اٹھا تو مچی واہ کی دھوم
سچ یہ ہے صاحب اقبال کی ہر بات اچھی

۱۷۵۷ع میں پلاسی کی مختصر سی جنگ کے نتیجے میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے ضابطہ حکومت کا آغاز ہوا ، جس نے ایک سو سال کے عرصے میں بنگال سے پھیل کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا - ۱۸۵۷ع کے بعد ملک کی عنان اقتدار کمپنی کی بجائے تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئی اور ہندوستان کی باضابطہ محکومی کا دور شروع ہوا - ملک کی بدبختی کا یہ دور اگست ۱۹۴۷ع میں ختم ہوا ، اور محکوم برعظیم کی کوکھ سے دو آزاد مملکتیں پاکستان اور بھارت معرض وجود میں آئیں - باضابطہ محکومی کے اس دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) انیسویں صدی کا نصف آخر ــــ دور اصلاح !
(۲) بیسویں صدی کا نصف اول ــــ دور انقلاب !

دور اصلاح

علی گڑھ تحریک:

انقلاب ۱۸۵۷ع کے بھڑکتے ہوئے شعلے بعض وفادار ہندوستانیوں کی مدد سے بجھا دیے گئے۔ برطانوی سامراج کا ستارا چند ماہ گردش میں رہ کر پھر چمک اٹھا اور اس کے ساتھ ہی وحشت و درندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فتح کے نشے میں چور اور آتش انتقام سے مغلوب انگریزوں نے سقوط دہلی کے بعد قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ مغلوں کے مرکز سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ شاہراہوں پر پھانسیوں کے پھندے لگا دیے گئے جن پر ہزاروں بے گناہوں کو لٹکایا گیا۔ ہزاروں کو توپ دم کیا گیا۔ ہزاروں قید ہوئے اور لاکھوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ شرفا کی عزت و ناموس کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ بہادر شاہ ظفر کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹوں اور بھتیجوں کو گولیوں سے اڑایا گیا اور بوڑھے تیموری تاجدار کو بے کسی کی حالت میں سسک سسک کر مرنے کے لیے رنگون بھیج دیا گیا۔ اتنے مظالم کرنے کے باوجود فاتحین کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی اور جہاں تک مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنانے کا تعلق تھا ملکہ وکٹوریہ کے عفو عام سے بھی اس میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ کیونکہ انگریزوں نے اپنی سامراجی مصلحت اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق انقلاب

برپا کرنے کا سارا الزام مسلمانوں پر لگایا اور انہیں زندگی کے ہر میدان میں پسماندہ بنا کر ان کی اجتماعی قوت کو ختم کر دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔

یہ حالات تھے جن میں (سر) سید احمد خاں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر اور انقلاب کو کمپنی کی حکومت کی چند در چند انتظامی خامیوں کا نتیجہ قرار دے کر ہندوستانیوں کی بے گناہی ثابت کرنا چاہی۔ اس رسالے کو حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچانے کے بعد سید احمد خاں نے اجتماعی سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی لینی شروع کر دی اور خصوصاً انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے، انہیں دور کرنے، نیز انگریزوں اور مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر مفاہمت کی خاطر متعدد رسائل لکھے۔ لائل محمڈنز آوف انڈیا (۱۸۶۰—۱۸۶۱ع)، تحقیق لفظ نصاریٰ (۱۸۶۱ع) تبیین الکلام (۶۱—۱۸۶۲ع)، رسالہ احکام طعام اہل کتاب (۱۸۶۸ع) وغیرہ اسی سلسلے کی کاوشیں تھیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حکومت بھی یہ محسوس کرنے لگی کہ مسلمانوں کو اس طرح تعلیمی، معاشی و معاشرتی لحاظ سے پسماندہ بنا دینے سے مسائل ملکی حل نہیں ہو سکتے۔ اس احساس کے پیدا کرنے میں سید احمد خاں کی کاوشوں کو خاصا دخل تھا۔ اس سیاسی

حکمت عملی کو اختیار کرنے کے بعد سید احمد خاں نے مسلمانوں کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی تنظیم نو کی دعوت دینی شروع کی اور اُن کی تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی اور معاشی اصلاح کے لیے باقاعدہ ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا آغاز تہذیب الاخلاق کے اجراء سے ہوا جسے سید احمد خاں نے انگلستان کی سیاحت سے واپس آ کر دسمبر ۱۸۷۰ع میں جاری کیا۔ یہ پرچہ جس کی پیشانی پر یہ عبارت تحریر تھی :

'Social Reformer of Indian Mohammadans'

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا داعی تھا اور تہذیب و معاشرت کا یہ تصور مغربی سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں :

''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سولیزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلاویں۔''

سر سید احمد خاں تہذیب و معاشرت کے جو مظاہر انگلستان کے دبستانوں میں دیکھ کر آئے تھے وہ اُن کے نزدیک معیاری اور قابل تقلید تھے اور اُن کو اختیار کر کے ہی ہندوستانی مسلمان کامل درجے کے مہذب بن سکتے تھے اور

حکمرانوں کی نگاہ میں معزز کہلا سکتے تھے - یہ قدرتی بات تھی - محکومی کے بعد ایسا بھی ہوا ہی کرتا ہے کہ محکوموں کو اپنے ہاں کا خوب بھی ناخوب اور ہنر بھی عیب نظر آنے لگتا ہے - سرسید اپنے ایک مضمون ''وحشیانہ نیکی'' میں لکھتے ہیں :

''میں اپنی قوم کو مہذب قوم سے ملنے اور شائستہ ملک میں جانے کی ترغیب کرتا ہوں اور اس خیال سے ہمیشہ رنج میں رہتا ہوں کہ ہماری قوم میں جس قدر نیکیاں ہیں، وہ بھی نامہذب ہیں - دنیاوی برتاؤ، آپس کا ملاپ، دوستوں کی دوستی، دینداروں کی دینداری، امیروں کی امیری نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے واقع ہوئی ہے - اگر وہ عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاوے تو انسان کے لیے اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں دونوں میں نہایت ہی مفید ہو - ''

اپنی قوم کی یہ مکروہ اور بھیانک تصویر مصلحانہ روش کی پہلی کڑی تھی - کیونکہ جب تک اپنی قوم اور اپنی معاشرتی زندگی کے اندر چن چن کر کیڑے نہ نکالے جائیں اُس وقت تک اُسے تعلیم و ترقی کی نئی شاہراہ پر ڈال کر تہذیب کی اُس ''اُونچی'' سطح پر لانا ممکن نہیں تھا، جہاں اہل مغرب پہنچ چکے تھے - اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بہت سی خرابیاں تھیں - زوال

آمادہ تمدن میں بہت سے ناسور پیدا ہو چکے تھے اور اگر اُن کی بروقت اصلاح نہ کی جاتی تو مزید کیڑے پڑنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ یہ زندگی سرتاپا وحشیانہ تھی اور اس کی نیکیاں بھی بدیاں تھیں اور ہنر بھی عیب تھے، مصلحانہ تعصب اور تنگ نظری کی آخری حد ہے۔ یہ گھناؤنی تصویر اُس عہد کے معاشرے کی ہے جو زمانۂ زوال میں بھی شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، حاجی امداد علی مہاجر مکی، حکیم مومن دہلوی، مرزا اسد اللہ خاں غالب، شیخ ابراہیم ذوق، مصطفیٰ خاں شیفتہ اور بہت سے دوسرے علما، فضلا، شعراء، ادباء کی نواؤں سے معمور تھا، اور بزرگان سلف کو گزرے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ عقل اس بات کو نہیں مانتی کہ کوئی معاشرہ دفعتاً اتنا پست ہو جائے کہ اُس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کی جائیں۔ ہاں البتہ یہ درست ہے کہ:

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا، چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا

سر سید احمد خاں کی بصیرت ضروریات زمانہ کو محسوس کرکے اُس خلا کو پُر کرنا چاہتی تھی جو سیاسی محکومی کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں پیدا ہوا تھا۔ اُن کے نزدیک اس کی واحد صورت یہ تھی کہ انگریزوں کے دل سے

مسلمانوں کے بارے میں مغالطوں کو رفع کر دیا جائے اور مسلمان ایک ایسی طرز زندگی کو اپنا لیں جو انھیں حکمرانوں کی نظروں میں معزز بنا کر اُن کے وقار کو بڑھا دے ۔ حاکم و محکوم کے ذہنی و عملی تفاوت کو دور کرکے خوش آئند زندگی اور ترقی کے خواب دیکھنا یقیناً اچھی بات تھی لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں ہاتھ ایک سے ہوں ۔ جو کچھ سرسید سوچتے تھے، کیا حکمران قوم بھی ایسا سوچ سکتی تھی ؟ یہ دور از کار بات ہے ۔ بہر کیف ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء سے علی گڑھ تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔

سید احمد خاں کی پر کشش شخصیت نے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور قوم کے ہمدردوں کا تعاون حاصل کرکے اپنی تحریک کو ملک گیر بنا دیا ۔ اصلاح مذہب و معاشرت کے سلسلے میں سر سید نے بہت سے مضامین لکھے جن میں مغربی طرز معاشرت کی دل کھول کر تعریف کی جاتی اور اسی تفریط سے اپنی معاشرتی زندگی کے نقائص بیان کیے جاتے اور اُن کی مذمت کی جاتی ۔ اس قسم کے مضامین کی وجہ سے علی گڑھ تحریک کی پرزور مخالفت بھی ہوئی اور سر سید اپنے ان معاشرتی افکار اور مذہبی عقائد کی وجہ سے مسلمانوں میں ''نیچری'' اور ''کرسٹان'' کہلائے ۔ ''تہذیب الاخلاق''

کے بعد سرسید نے دوسرا اہم قدم "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ" کے قیام کے لیے اٹھایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے صفحات پر جب اس کالج کے قیام کا چرچا ہوا، تو لوگوں نے اس کی بھی پرزور مخالفت شروع کر دی۔ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی تھی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لیے ہوئی تھی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سر سید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنھیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔[۱] انھیں اندیشہ تھا کہ ایسے مدرسے اور ماحول میں رہ کر مسلمان بچے اپنے دین و ایمان پر ثابت قدم نہیں رہ سکیں گے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور علوم کی تعلیم سے اتنا اختلاف نہیں تھا جتنا اس طرز معاشرت اور تربیت سے تھا جسے سر سید بقول مولانا حالی "تعلیم سے بھی زیادہ ضروری" سمجھتے تھے۔[۲]

سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء علی گڑھ کالج کو ہندوستانی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے جہاں وہ نئے حالات کے مطابق اور اپنے قومی تقاضوں کی روشنی میں نئی نسل کی ذہنی نشو و نما کر سکیں۔ شدید مخالفت کے پیش نظر اور لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کے

---

(۱) محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، صفحہ ۷۷۔

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین، حیات جاوید، صفحہ ۲۳۸۔

لیے مدرسے کا فوری قیام ضروری تھا۔ چنانچہ رفقاء کے مشورے کے مطابق ۱۸۷۵ء میں ابتدائی مدرسہ قائم کر دیا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں کالج کی جماعتیں، ۱۸۸۱ء میں ایم۔ اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کی جماعتیں شروع کر دی گئیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام تو چند برس میں کر دیا گیا لیکن سر سید کا اصل مقصد تو اس کے نتائج پر منحصر تھا۔ سر سید کا یہ پختہ عقیدہ بن گیا تھا کہ مسلمانوں میں جدید اصولوں پر اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کر کے ہی عالی ہمتی اور رفعت خیال پیدا ہو سکتی ہے۔ اس عقیدے کو انہوں نے مشعل راہ بنا لیا اور اس کی تکمیل میں تمام رکاوٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ ان حالات میں مشرقی علوم اور صنعتی تعلیم کے شوق کو بھی بیسود سمجھتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریز اساتذہ مقرر کیے اور نہ صرف تعلیمی در و بست بلکہ اصلاح معاشرت اور حکومت اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کا کام بھی انہیں کو سونپ دیا۔[۱] ان میں سے بیشتر اساتذہ نے طلبہ میں اعلیٰ علمی، ادبی مذاق پیدا کرنے کی بجائے انگریزی طرز معاشرت، کھیل کود، ڈنر کلب میں لیڈیوں اور انگریز جنٹلمینوں سے رابطے کا شوق اور حصول ملازمت کے بعد صاحبوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ بقول سید رضا علی ''مسٹر بیک (پرنسپل)

---

(۱) محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، صفحہ ۹۵۔

کے چہیتے طلبہ سب کھلاڑی تھے۔[1]"

طلبہ کی اس بے راہ روی پر مخالف ہی نکتہ چیں نہیں تھے بلکہ سر سید کے رفیق اور دست و بازو بھی معترض تھے۔ لیکن "ڈسپاٹک مزاج"، گرد و پیش کے حالات اور انگریز مشیروں نے جو تغیر ان کے خیالات میں پیدا کر دیا تھا، اس کے اثرات ان کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگے تھے:

"میرا وہ مقصد جس پر میں نے کالج کی بنیاد ڈالی تھی کسی قدر حاصل ہوا۔ پس اس باب میں جو مخالفین مخالفت کرتے ہیں، اس کی ذرہ برابر بھی وقعت نہیں کر سکتا، اور نہ میں بورڈنگ ہاؤس کو اس حالت پر رکھنا چاہتا ہوں، جو وہ پسند کرتے ہیں۔ اگر میرا یہ مقصد اس کالج سے حاصل نہ ہوا تو کالج کو آج غارت کر دینا اس کے قائم رکھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہم اس کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے ذریعے سے آپس میں مسلمانوں اور انگریزوں کی دوستی و محبت پیدا کرنی چاہتے ہیں نہ کہ نفرت و عداوت۔[2]"

سر سید کی اس خود رائی سے جو آخر عمر میں درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی، ان کے عزیز ترین رفقاء کو بھی بہت رنج ہوتا

---

(۱) رضا علی، (سر) سید، اعمال نامہ، صفحہ ۷۵۔

(۲) لیکچر کانفرنس ۱۸۸۹ع۔

تھا ۔ ان کے نزدیک سر سید نے اپنی ذاتی رائے کو (جو کالج کے انگریز اساتذہ سے متأثر تھی) قومی معاملات میں اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی بات کو جو ان کی رائے سے مختلف ہو، سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے ۔ اس اختلاف نے بڑھ کر بد مزگی کی صورت اختیار کر لی اور ٹرسٹیز بل کے موقع پر (۱۸۸۹ع) ان کے بعض پرانے رفیق ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے ۔ سر سید کی یہ روش بہت حد تک ان کے تجربات زندگی اور مشاہدات پر مبنی تھی ۔ ''انھوں نے انگریزی حکومت کے عروج و اقبال کے ساتھ ھی مغربی علوم کی روشنی اور چمک دیکھی تھی ۔ دوسری جانب اپنی قوم کی تنگ خیالی، تعصب اور جہالت کی تاریکی نے ان کو مایوس کر دیا تھا ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ع کے بعد سے مرتے دم تک وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات اور موانست و محبت پیدا کرنے کی تدبیریں کرتے رہے اور اس کوشش میں ان کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کے علوم و فنون، ان کی ترقیات و ایجادات یقیناً ایسی کار گر ھیں اور نئے علوم و فنون اس قدر بلند و برتر ھیں کہ ان کے مقابلے میں نہ کسی کی قومی عصبیت چل سکے اور نہ کوئی مذھبی حجت ٹھہر سکے ۔ گویا وہ جدید ترقیات سے اس درجہ متأثر اور مرعوب ہو چکے تھے کہ بغیر غور و فکر کے ان کو قبول و تسلیم کر لیتے تھے ۔ چنانچہ ان کے اکثر کاموں میں یہ مغرب پرستی یا اس کا غیر محسوس اثر نمایاں

ہے۔ مذہبی اجتہاد کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا کہ اول انھوں نے مغربی علم و حکمت کو حقائق سمجھ لیا اور پھر مذہب میں تاویل کی لے اس قدر بڑھائی کہ بجائے مغربی علوم کے مذہب ہی کو جھکنا پڑا۔ مجتہدانہ حیثیت میں یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔"[۱]

باین همہ سر سید احمد خاں کا یہ کارنامۂ خاص تھا کہ انھوں نے اس دور انتشار میں مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسا مرکز قائم کر دیا جو ان کی تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی در و بست کا مرجع تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں مفاہمت اور مغربی تہذیب و معاشرت سے مصالحت کے وقتی فوائد سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ دو برابر کے فریقوں کی مفاہمت ہوتی اور دو برابر کی تہذیبیں آپس میں مصالحت کرتیں، تو یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوتا اور اس کی حیات جاوید میں بھی شبہہ نہ کیا جا سکتا۔ لیکن یہ حاکم و محکوم کی ایک ایسی مصالحت تھی جو ہنگامی ضرورتوں اور وقتی مصلحتوں کے تقاضے سے ابھری تھی — اور کسی مصلح کا اسے دائمی فرض کر لینا، سادگی، خلوص اور بھول پن کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن حقیقت نہیں بن سکتی۔ بہر کیف، ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے:

---

(۱) نورالرحمٰن، حیات سرسید، صفحہ ۱۰۷۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برق خرمن کا ہے خون گرم دھقاں کا

علی گڑھ تحریک کا رد عمل بھی اسی کے اندر پوشیدہ تھا۔ اس تعلیمی مرکز نے جہاں بے شمار ''صاحب بہادر'' پیدا کیے جن کی روش کو دیکھ کر سر سید اور ان کے مخلص اور دردمند ساتھیوں کو بھی افسوس ہوا، وہاں ایسے حریت پسند بھی پیدا کیے جنھوں نے برعظیم کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد علی، شوکت علی، عزیز مرزا، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اسی سلسلے کے اہم رکن تھے جنھوں نے اپنے حریت پرور فکر و عمل سے انگریزی استعمار کے قصر رفیع میں ایسے شگاف ڈال دیے کہ اس کو دوبارہ سنبھلنا نصیب نہ ہوا۔

علی گڑھ تحریک کے اجتماعی امور سے قطع نظر اس کا ایک اہم کارنامہ اُردو ادبیات کا فروغ و ترقی ہے۔ اردو ادبیات، جس کا بیشتر سرمایہ اب تک حسن و عشق کے تصورات اور خیالی داستانوں پر مشتمل تھا، تہذیب الاخلاق کی بدولت زندگی کے ہمہ گیر مسائل اور موضوعات کا ترجمان بن گیا۔ سرسید کی ادبی خدمات کا پر زور الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے

آفتاب بن گئیں ، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سر سید ھی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی ، سیاسی ، اخلاقی ، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر ، وسعت و جامعیت ، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشاء پرداز موجود ھیں ، جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ھیں ، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں، جو سر سید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ھیں ، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا ، تاھم سر سید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔"

(مقالات شبلی، جلد ۲ ، صفحہ ۵۷)

انڈین نیشنل کانگرس :

سرسید احمد خاں نے رسالہ اسباب بغاوت ھند میں حکومت کو اس امر کا احساس بھی دلایا تھا کہ نظم و نسق میں ملکی باشندوں کی رائے شامل ھونی چاھیے ۔ اس احساس کے مطابق حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے کی کونسل میں تین ھندوستانی رکن ھوں ۔ ملک میں نئی تعلیم کے پھیلنے

سے یہ احساس اور بڑھنے لگا۔ ۱۸۸۰ع میں لارڈ رپن وائسرائے ہند نے حکومت کی طرف سے ''البرٹ بل'' پیش کرایا جس کا مقصد یہ تھا کہ گوری نسل کے مجرموں کے مقدمات ہندوستانی میجسٹریٹوں کے سامنے بھی پیش ہو سکیں تاکہ گورے اور کالے کا یہ تفاوت دور ہو اور ہندوستانیوں پر سے ذلت کا یہ دھبہ مٹ جائے۔ بعض انگریزوں اور اینگلو انڈین طبقے کو یہ امر سخت ناگوار گزرا، اور انھوں نے شورش برپا کر کے اور منظم کوشش کے ذریعے اس بل کو ناکام بنا دیا۔ ہندوستانیوں کے احساس پر یہ ایک تازیانہ تھا جسے وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ لبرل خیال کے بعض انگریزوں کو بھی، جو ہندوستانیوں کی آئینی ترقی کے حامی تھے، اپنے ہم قوموں کی اس ذہنیت پر رنج پہنچا۔ چنانچہ ایک لبرل انگریز مسٹر اے۔ او ہیوم ہندوستانیوں کی اس بے چینی کو محسوس کر کے اُن کی سیاسی رہنمائی کے لیے اٹھے۔ انہوں نے ہندوستانی گریجویٹوں کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں انھیں اپنے حقوق کا احساس دلایا اور ان کے حصول کے لیے منظم ہونے کی تلقین کی۔ کنسرویٹو خیالات کے انگریزوں نے اس کے برعکس ہندوستان کے مختلف طبقوں کے مذہبی اور لسانی اختلافات کو ابھارنا شروع کر دیا، تاکہ اس قسم کی تنظیم کا خواب شرمندۂ معنی نہ ہو سکے۔

مسٹر اے۔ او ہیوم کے مراسلے کا خاطر خواہ اثر ہوا،

اور ہندوستانی گریجویٹ ایک ملک گیر سیاسی تنظیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ اس ضرورت کے احساس نے انڈین نیشنل کانگرس کو جنم دیا۔ کانگرس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ع کو بمبئی میں زیر صدارت مسٹر سی۔ ڈبلیو بینرجی وکیل کلکتہ منعقد ہوا۔ کانگرس کے اس اجلاس میں کچھ تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل تھے لیکن زیادہ تر بنگالی ہندو سرگرم عمل تھے۔ شاید اس لیے کہ تعلیم کے میدان میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ اس اجلاس میں کانگرس کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

(۲) اور اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسی حالت کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستانیوں کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہو۔ اور اس طریقے سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا[1]۔

سرسید احمد خاں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ع کو محمڈن

---

(۱) طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۲۶۷۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنئو میں کانگرس کے خلاف ایک پُر زور لیکچر دیا ۔ اسی موقع پر کانگرس کا تیسرا سالانہ اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا ۔ سرسید نے چند در چند وجوہ کی بنا پر کانگرس کی مخالفت کی ۔ بعض وجوہ بڑی ٹھوس تھیں اور بعض بالکل سطحی اور جذباتی تھیں ۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی ' نیز عددی قلت ' ایک ایسے ماحول میں جبکہ بعض ہندو تنظیمیں مذہب اور زبان کے مسائل پیدا کر کے تعصب کو ہوا دے رہی تھیں ' متحدہ قومیت کے تصور کے منافی تھی ۔ سرسید نے بڑی دور اندیشی سے اس کے نتائج و عواقب کا اندازہ لگایا ۔ اگرچہ وہ نظریے کے اعتبار سے متحدہ قومیت کے تصور کے خلاف نہیں تھے بلکہ کئی موقعوں پر وہ اس قسم کی قومیت کا واضح طور پر اظہار بھی کر چکے تھے :

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے ...... یاد رکھو ! کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ' ورنہ ہندو ' مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں ' اس اعتبار سے ایک قوم ہیں ۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ' ایک ہونا چاہیے ...... اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے

دو قومیں سمجھی جائیں۔[1]"

ایک دوسرے موقع پر تمثیلی انداز میں ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں:

"ہم نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔[2]"

سرسید کے ان خیالات میں اور کانگرس کے مقاصد میں کتنی یک جہتی ہے۔ لیکن اس کے باوصف سرسید نے کانگرس کی مخالفت میں پُر زور آواز اٹھائی تو اکثر لوگوں کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ غالباً اس موقعے پر سرسید اس سیاسی قومیت کے نتائج سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ۱۸۵۷ع کے بعد مسلمانوں کی بیچارگی اور پس ماندگی اُن کی نگاہ میں تھی۔ اُردو زبان کے بارے میں ہندوؤں کا رویہ اور بعض ہندو تنظیموں کی متعصب ذہنیت اُن کے سامنے آ چکی تھی۔ مذکورہ بالا اتحاد پرور خیالات کے باوجود سرسید حقیقت میں مسلمانوں کے رہنما

---

(۱) مجموعہ لیکچر سر سید، صفحہ ۱۶۷۔

(۲) سرسید کے آخری مضامین، صفحہ ۱۳۹۔

تھے اور اس حیثیت سے وہ ان باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے ۔ سرسید خود ایک سیاسی مفکر تھے لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مسلمان، جو انقلاب ۱۸۵۷ع کی ابتلا سے گزر چکے ہیں، دوبارہ اس میدان پُر خار میں قدم رکھیں ۔ وہ بڑے خلوص سے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنی تعلیمی اور معاشی حالت درست کریں ۔ اسی احساس کے تحت انہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی ۔ کانفرنس کے قیام کے موقع بر انہوں نے یہ بڑی پتے کی بات کہی تھی: ''جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہو گی اس سے میں اتفاق نہیں کرتا، بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں''۔ سرسید کا یہ خیال اُس وقت کے حالات کے مطابق بالکل درست تھا، اور اگر وہ اسی پر کار بند رہتے تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا ۔ لیکن وہ سیاست کے میدان میں کودے اور کانگرس کی مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنا کر اُس کا واحد نصب العین یہ قرار دیا کہ بات بات پر کانگرس کی مخالفت کرے اور انگلستان کے باشندوں کو ہر طرح یقین دلائے کہ مسلمان کانگرس کے ساتھ نہیں ہیں ۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوا ہے کہ اس موقع پر سرسید کی یہ روش اُن کے اپنے فکر کا نتیجہ تھی یا آوردۂ غیر تھی؟ بقول

شبلی نعمانی :

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشن سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
اُن کی جو بات تھی آورد تھی، آمد تو نہ تھی

سرسید رضا علی مرحوم جو اُس زمانے میں علی گڑھ کالج کے ایک طالب العلم تھے، اس زمانے کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''اعمال نامہ'' میں لکھتے ہیں :

''۱۸۸۵ء میں کانگرس کے قائم ہونے کے بعد حالات کی صورت یہ تھی کہ گورنمنٹ اور مسلمان دونوں کا فائدہ اس میں تھا کہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ حسن اتفاق سے اسباب بھی ایسے مہیا ہو گئے۔ مسلمانوں کا مرکز علی گڑھ بن چکا تھا۔ سرسید کی زبردست شخصیت نے ہر صوبہ کے مسلمانوں کا سیاسی اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ یو۔پی کے لیفٹننٹ گورنر سر آکلینڈ کالون سرسید کے خاص احباب میں تھے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک تھے جن کو برائے نام تعلیمی معاملات سے اور درحقیقت سیاسی مسائل سے دلچسپی تھی۔ کالون صاحب اور بیک صاحب انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کو انگریزی حکومت کے لیے خوفناک سمجھتے تھے۔

سرسید غدر ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات بچشم خود دیکھ چکے تھے - موصوف کی عمر جوں جوں بڑھتی گئی، ان کا یہ یقین مستحکم ہوتا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے - سرسید کا خیال تھا کہ اگر مسلمان گورنمنٹ کے وفادار رہیں اور گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرے تو کانگرس کے لمبے چوڑے دعووں کو نہ کبھی ملک میں قبولیت حاصل ہو گی، نہ انگلستان کے باشندے کانگرس کو کبھی ملک کا صحیح نمائندہ سمجھیں گے - مسٹر بیک بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے - موصوف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سرسید کی دوراندیشی اور سیاسی دانشمندی کے دن رات ملار گا کر سرسید کی طبیعت میں ایسا دخل حاصل کر لیا تھا کہ مرنے سے چند سال پہلے علی گڑھ کا واجب الاحترام سیاسی مقتدیٰ اہم پولٹیکل معاملات میں جس رائے کا اظہار کرتا تھا، وہ آواز تو بے شک اس مقتدیٰ کی ہوتی تھی، مگر خیالات تقریباً تمام تر مسٹر بیک کے ہوتے تھے -"[1]

اصلاحی دور کا سیاسی ماحول حکومت سے نیازمندانہ عرض داشتوں سے معمور تھا - فرق یہ تھا کہ کانگرس کا لہجہ رفتہ

---

(۱) رضا علی، (سر) سید، اعمال نامہ، صفحہ ۱۶۹ -

رفتہ شوخ اور بے باک ہوتا جا رہا تھا اور علی گڑھ تحریک کے رہنما سیاست کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے اور اگر ضروری سمجھتے تھے تو اس حد تک آگے جاتے تھے کہ ”مسلمان کانگرس سے علیحدہ ہیں ۔“[۱]

دیگر اصلاحی تحریکیں و ادارے :

انیسویں صدی کے اصلاحی دور میں علی گڑھ تحریک اور انڈین نیشنل کانگرس کے علاوہ اور بھی بہت سے علمی و ادبی ادارے اور مذہبی و معاشرتی تحریکیں ملک میں سرگرم عمل تھیں ۔ ان میں دیو بند اور ندوۃ العلماء مذہبی تعلیمی اداروں کی حیثیت سے ، اودھ پنچ ادبی و صحافتی حیثیت سے ، آریہ سماج ، سناتن دھرم اور قادیانی فرقے مذہبی معاشرتی حیثیت سے قابل ذکر ہیں ۔

انقلاب ۱۸۵۷ع میں جن علماء نے سرگرم حصہ لیا تھا ، انقلاب میں ناکامی کے بعد اُن کے لیے دو ہی راستے رہ گئے تھے ، یا تو ملک سے ہجرت کر جائیں اور یا گوشہ نشین ہو کر خاموشی سے زندگی گزار دیں ۔ کچھ لوگ تو ہجرت کر گئے ۔ بعض جلا وطن کر دیے گئے اور بعض نے گوشہ نشینی تو اختیار کی لیکن خاموش رہنے کی بجائے عمل کی ایک دوسری راہ اختیار کی ۔ یعنی دینی تعلیم کی شمع کو روشن کیا اور قال اللہ و قال الرسول کے مسلک کو جاری رکھا ۔ ان علما کا

---

(۱) رضا علی ، (سر) سید ، اعمال نامہ ، صفحہ ۱۱۳ ۔

مرکز دیو بند میں بنا جہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک دارالعلوم قائم کیا ۔ یہ دارالعلوم بہت جلد ایشیا کا ایک بہت بڑا دینی مرکز بن گیا ۔ یہ مرکز حکومت کی اعانت سے بے نیاز ہندوستان کے مختلف حصوں کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ممالک کے ہزاروں طالب علموں کے لیے کشش کا باعث بنا رہا ۔ یہاں دینی نقطۂ نظر سے طلبہ کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی ۔ دنیوی مسائل کا پشتارا ارباب دیو بند نے اصحاب علی گڑھ کے لیے چھوڑ رکھا تھا ۔ ندوۃ العلما جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا ان دونوں کے بین بین یعنی دینی اور دنیوی ضرورتوں کے امتزاج اور شبلی کے تعلیمی نظریات کا آئینہ دار تھا ۔ یہ تینوں تعلیمی مرکز ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان تینوں اداروں کے زاویہ ہائے فکر و نظر کو سمجھنے کے لیے لسان العصر اکبر الہ آبادی کا ذیل کا بلیغ قطعہ کافی ہو گا :

ہے دل روشن مثال دیوبند
اور ندوہ ہے زبان ہوش مند
ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز
گو کہ فکر آخرت ہے اصل چیز

بیسویں صدی کے عملی تقاضوں نے جب مجبور کیا تو

دیوبند کے علما بھی گوشہ نشینی ترک کرکے میدان عمل میں نکل آئے اور اپنی روایتی حریت پسندی کا ثبوت جد و جہد آزادی میں دینے لگے - ۱۹۰۹ع میں مولانا عبیداللہ سندھی نے جمعیت الانصار بنائی جس کا مقصد طلبہ کے باھمی تبادلے سے علی گڑھ اور دیوبند کو قریب لانا تھا - ۱۹۱۳ع میں یہ مرکز نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے دھلی منتقل ھوگیا - سیاسی ضرورتوں کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی کے کابل چلے جانے سے اس ادارے کی سرگرمیاں متاثر ھوئیں - تاھم تصور باقی رھا اور اسی تصور کے مطابق جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تأسیس کی گئی تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا :

''اے نونہالان وطن ! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار جس میں میری ھڈیاں پگھلی جارھی تھیں ، مدرسوں اور خانقاھوں میں کم اور اسکولوں و کالجوں میں زیادہ ھیں ، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اس طرح ھم نے ھندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا - ''[1]

ظفر علی خاں اگرچہ علی گڑھ کے پروردہ تھے لیکن دینی احساس اور حریت فکر کے سلسلے میں دیوبند کے مدرسۂ فکر

---

(۱) محمد اکرام ، شیخ ، موج کوثر ، صفحہ ۲۳۲ -

سے بھی متأثر تھے - ''دیوبند'' پر اُن کا ایک قطعہ اس دارالعلوم کی عظمت کو بیان کرنے کے علاوہ خود ان کے احساس کا بھی ترجمان ہے :

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند
حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تونے دوچند
اسم تیرا با مسمیٰ ضرب تیری بے پناہ
دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار
قرن اول کی خبر لائی تری اُلٹی زقند
تو علم بردار حق ہے حق نگہباں ہے ترا
خیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند
ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کرلیا اُن عالمان دین قیم نے پسند
جان کردیں گے جو ناموس پیمبرؐ پر فدا
حق کے رستہ میں کٹا دیں گے جو اپنا بند بند
کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند
اس میں قاسم ہوں کہ انور شہ کہ محمودالحسن
سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمیٔ ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایات سلف کا سربلند
(رنگون ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء)

ندوۃ العلما کا مسلک قدیم طرز کے اسلامی مدرسوں میں انگریزی اور مغربی علوم کو شامل کرکے ملک و قوم میں روشن خیالی کو فروغ دینا تھا - ندوہ سے علیحدگی کے بعد شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کرکے علمی ادبی شمع روشن کی - شبلی اور ان کے تلامذہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے علمی و ادبی کارناموں کو مؤثر انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرکے یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ہر زمانے میں علوم کی سرپرستی کی ہے اور جدید سائنس کی دنیا میں بھی اسلام ہی اس منصب سے بہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہے - شبلی نعمانی کی کاوشوں کا یہ ایک خوشگوار پہلو ہے کہ انھوں نے محض گریجویٹ ہی پیدا نہیں کیے بلکہ مصنف بھی پیدا کیے، جن کے دیدہ و دل اپنی قومی، اسلامی روایات سے منور تھے - ظفر علی خاں اس علمی، ادبی اور تاریخی سرچشمے کے بھی فیض یافتہ تھے -

اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی :

۱۸۷۷ء میں لکھنئو سے منشی سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' نکالا - انیسویں صدی میں اردو کا یہ ایک اہم مزاحیہ پرچہ تھا جو ظرافت کے پیرائے میں معاشرتی اصلاح کا فریضہ سرانجام

دیتا تھا ۔ تہذیب الاخلاق کی طرح ''اودھ پنچ'' کو بھی اپنے زمانے کے بعض نامور ادیبوں کا تعاون حاصل تھا ۔ اس وجہ سے یہ محض ایک صحیفہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ بھی تھا ۔ سیاسی مسلک کے اعتبار سے ''اودھ پنچ'' کانگرس کا حامی تھا ' تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے مشرقیت کا دلدادہ اور مغرب کا حریف تھا ۔ اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کی طنز و ظرافت کا پیرایہ خاصا شوخ اور بعض معارضوں کی صورت میں حد اعتدال سے تجاوز کرکے سوقیانہ ہو جاتا تھا ۔ بہر کیف مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف اودھ پنچ نے جو محاذ قائم کیا ' وہ ہندوستان کی تہذیبی و معاشرتی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے ۔ ''اودھ پنچ'' ہی کے صفحات پر اکبر الہ آبادی نمودار ہوئے ۔ اکبر نے مشرق و مغرب کی اس تہذیبی آویزش میں جو ان دنوں بڑے زوروں پر تھی ' ایک ظریف مفکر شاعر کی حیثیت سے بھرپور حصہ لیا اور اہل مشرق علی الخصوص مسلمانوں میں آس احساس خود شناسی کو ابھارا جس کے بغیر اُن کے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا ۔ اکبر کی یہ صدائے پُر درد ' جو ظرافت کے پیرائے میں ظاہر ہوئی ' بعد میں ظفر علی خاں کی للکار و پیکار اور اقبال کے فکر و فلسفے میں ڈھل گئی ۔

دیگر مذھبی، معاشرتی تحریکیں :

عیسائی مشنریوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سنگینوں کے

سائے میں عیسائیت کی تبلیغ اور مذہبی مباحث کا جو سلسلہ ۱۸۵۷ع سے پہلے شروع کیا تھا ، وہ ہندوستان کے تاج برطانیہ کے زیر سایہ آجانے کے باوجود جاری رہا ۔ مذہبی مناظروں اور مباحثوں نے تعصب کی جو فضا پیدا کی اس میں بعض نئے نئے فرقوں نے جنم لیا ۔ ہندوؤں میں پورانک اور ویدک عہد کی طرف لوٹنے کا رجحان پیدا ہوا ۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک تعلیم یافتہ ہندوؤں کی نسبتاً اعتدال پسند تحریک تھی ۔ اس کے مقابلے میں بال گنگا دھر تلک روایتی ہندو تہذیب کے انتہا پسند نمائندے تھے جو ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا دیس اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی بدیسی سمجھتے تھے ۔ آریہ سماج کی بنا پنجاب میں دیانند سرسوتی نے ۱۸۷۵ع میں ڈالی ۔ ہندو سوسائٹی کی اصلاح کے علاوہ اس کا مقصد مسلمانوں کو ترغیب یا تہدید کے ذریعے ہندو بنانا بھی تھا ۔ ہر چند کہ "ہندو مذہب ایک مشنری مذہب نہیں ۔ آریہ سماج کے آغاز سے پہلے ہندوؤں کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر قوموں میں اپنا مذہب پھیلائیں ۔"[1] لیکن آریہ سماجیوں نے شدھی کا ایک انوکھا طریقہ وضع کرکے ملک کی فضا کو تعصب اور منافرت سے بہت مکدر کردیا ۔ خصوصاً ترک موالات کے فوراً بعد شدھی اور سنگھٹن کی مہم جس دلآزار طریقے سے چلائی گئی اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں

---

(۱) محمد اکرام ، شیخ ، آب کوثر ، صفحہ ۲۱۵ ۔

کے درمیان دشمنی کی گہری خلیج حائل ہوگئی اور فتنے و فساد کی آگ ملک بھر میں پھیل گئی۔

بحث و مناظرے کی اسی فضا نے پنجاب میں قادیانی فرقے کو جنم دیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء خصوصاً مولوی چراغ علی نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور مذہب اور سائنس میں تطابق پیدا کرنے کے سلسلے میں مسائل مذہبی کی بعض من مانی تاویلات تو کیں لیکن کوئی نیا مذہبی فرقہ قائم نہ کیا اور نہ ھی اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا، لیکن پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۷ - ۱۹۰۸ع) نے پہلے مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر ظلی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کرکے اپنا ایک نیا فرقہ بنایا۔ مرزا غلام احمد قادیانی بعض مسائل مذہبی میں سرسید اور مولوی چراغ علی سے متأثر تھے۔ مسئلۂ جہاد کے بارے میں وہ مولوی چراغ علی کے ہم خیال تھے اور حضرت عیسیٰ کے متعلق اُنہوں نے سر سید کے خیالات کی پیروی کی۔ اُن کی وفات کے بعد حکیم نورالدین ان کے جانشین ہوئے اور حکیم نورالدین کی وفات کے بعد مرزا بشیرالدین محمود جانشین ہوئے، جن کی جانشینی کے ساتھ ھی قادیانی فرقے میں اختلافات شروع ہوگئے۔ ایک گروہ قادیانی دوسرا گروہ لاہوری کہلایا۔ قادیانی گروہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالکل الگ سمجھتا تھا۔ لاہوری گروہ دوسرے مسلمانوں سے تعلق قائم رکھنے کے حق میں تھا۔ بعض مذہبی تاویلات میں بھی ایک

گروہ دوسرے سے مختلف تھا ۔

تحریک اتحاد اسلامی :

ہندوستانی مسلمان اپنے ملک میں اقتدار اعلیٰ سے محروم ہو چکے تھے لیکن ابھی انہیں یہ اطمینان تھا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں ۔ جس روحانی رشتے سے وہ ایک عالم گیر اسلامی برادری کے سلسلے سے منسلک تھے اس کا یہ پہلو اس لحاظ سے خوشگوار تو ضرور تھا لیکن بے اطمینانی کی سیاہ گھٹائیں رفتہ رفتہ وہاں بھی چھا رہی تھیں ۔ مغرب کی سامراجی طاقتیں ہر جگہ ریشہ دوانیوں کا جال بچھا رہی تھیں اور مختلف خفیہ معاہدوں کی رو سے اسلامی ممالک کے حصے بخرے کر کے اپنے اپنے دائرۂ اقتدار میں شامل کر رہی تھیں ۔ انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے بہت سے یورپی حصے دول یورپ کی امداد سے خود مختاری کا علم لہرانے لگے تھے ۔ روس (زار شاہی) اور روم (عثمانی سلطنت) میں اکثر جنگ و پیکار کا سلسلہ گرم رہا ۔ جنگ کریمیا (۵۳–۱۸۵۶ع) میں برطانیہ اور فرانس نے بظاہر روس کے خلاف روم کا ساتھ دیا لیکن معاہدۂ پیرس کی رو سے عثمانی حکومت پر دباؤ ڈال کر بہت سے حقوق حاصل کر لیے گئے ۔ برطانیہ نے قبرص ہتھیا لیا ۔ برلن کی خفیہ کانفرنس میں دول یورپ نے عثمانی سلطنت کے افریقی مقبوضات کی تقسیم کا فیصلہ کیا ۔ مصر میں نہر سویز کا آغاز ہو چکا تھا اور برطانیہ کا اثر و رسوخ وہاں بھی نوآبادیاتی شکل اختیار کر

چکا تھا۔ ایران کو بھی روس اور برطانیہ اپنے حلقۂ اقتدار میں تقسیم کر چکے تھے۔ غرض کہ مختلف اسلامی ممالک بظاہر آزاد نظر آ رہے تھے لیکن سامراجی طاقتیں ہر جگہ اپنے پنجے گاڑنے کی فکر میں تھیں۔ ہندوستانی مسلمانوں تک ان ملکوں کی جو خبریں مغربی ذرائع سے پہنچتی تھیں، وہ ان سے متأثر ہوتے تھے۔

انیسویں صدی میں ایک طرف مغربی سامراج اپنے پاؤں پھیلا رہا تھا تو دوسری طرف اسلامی ممالک میں بھی اصلاح و ترقی کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ طیونس میں خیرالدین پاشا اور الجزائر میں امیر عبدالقادر استعمار پرست طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر مقاومت کا ثبوت دے رہے تھے۔ لیبیا میں سنوسی تحریک اور نجد میں وھابی تحریک مسلمانوں کی داخلی اصلاح و تجدید میں مصروف تھیں۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے۔ ترکیہ میں بھی جنگ کریمیا کے بعد اصلاحات کے نفاذ کے سلسلے میں دستوری تحریکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سامراجی طاقتیں اگرچہ ترکی کو ''یورپ کا مرد بیمار'' قرار دے رہی تھیں لیکن اس مرد بیمار کے آہنی پنجے سے خائف بھی تھیں۔ غرض ایک طرف اگر شیرازۂ اوراق اسلامی بکھرتا جا رہا تھا، تو دوسری طرف اس منتشر شیرازے کی شیرازہ بندی کے لیے اصلاحی کاوشوں کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ ان اصلاحی کوششوں میں ربط پیدا

کر کے بلاد اسلامیہ میں حیات نو کی روح پھونکنے کے لیے قدرت نے اسی زمانے میں سید جمال الدین افغانی کے نام سے ایک یگانۂ روز گار ہستی پیدا کر دی۔

سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۸ع میں سعد آباد (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ع میں ہندوستان کے راستے حج کے لیے بیت اللہ شریف گئے اور مختلف اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے ۱۸۶۱ع میں واپس اپنے وطن پہنچے۔ سات آٹھ برس تک افغان سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ بالآخر وہاں کی خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر رخت سفر باندھا اور اپنے بلند عزائم کی تکمیل کے لیے نئے میدانوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ دس سال تک مصر اور ترکیہ میں رہ کر وہاں حریت افکار کے بیج بوتے رہے اور ان اسلامی مرکزوں کے عوام کو مغربی سامراج کے خلاف درس اتحاد دیتے رہے۔ انگریزی سامراج نے ۱۸۷۹ع میں انہیں مصر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ عرابی پاشا کی تحریک آزادی کے فرو ہونے تک وہ حیدر آباد (دکن) اور کلکتہ میں رہے۔ ۱۸۸۳ع میں کلکتہ سے لندن ہوتے ہوئے سیاسی مہاجرین کے مرکز پیرس پہنچے اور وہاں سے مارچ ۱۸۸۴ع میں ''عروۃ الوثقیٰ'' جاری کیا۔ اس رسالے نے مشرقی ممالک کی پسماندگی اور ان پر مغربی ممالک کی بے جا دست اندازیوں اور ظلم و ستم پر بے لاگ تنقید کی۔ اس جریدے کا لہجہ اتنا تند و تیز اور جارحانہ تھا کہ یورپ و ایشیا کے بہت سے دفاتر

خارجہ اور قونصل خانوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ''یورپ کے مدبرین اس کے عادی نہ تھے کہ خود انہیں کے گھر میں بیٹھ کر کوئی شخص ان سے احتساب کرے۔ غیر ملکوں میں وہ اس قسم کی شورش کو بہ آسانی دبا سکتے تھے لیکن اپنے آزاد ملک میں اس قسم کی نکتہ چینی کو بند کرنا ان کے لیے آسان نہ تھا''۔[1] مشرق و مغرب میں حق کی اس بے باک آواز نے تہلکہ ڈال دیا۔ برطانیہ نے بوکھلا کر اپنے زیر اقتدار ملکوں میں اس جریدے کا داخلہ بند کر دیا۔ لیکن ''عروۃ الوثقیٰ'' اپنا کام کر چکا تھا۔ پیرس کے زمانۂ قیام میں افغانی نے دو بار روس کا سفر کیا۔ ناصر الدین شاہ قاچار کے بلاوے پر ایران گئے لیکن شاہ نے بد عہدی کر کے انہیں ایران بدر کر دیا۔ آپ واپس لندن آگئے اور وہاں سے سلطان عبدالحمید کی دعوت پر ۱۸۹۲ع میں ترکیہ پہنچے۔ سلطان روم بہت سی داخلی و خارجی الجھنوں میں گرفتار تھے۔ انہیں ایک زبردست شخصیت کے تعاون کی ضرورت تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ افغانی کے ادنٰی اشاروں پر مصر، سوڈان اور ایران میں انقلاب و آزادی کی زبردست تحریکیں جاگ اٹھیں۔ اس لیے افغانی کی شخصیت میں سلطان کو اپنے مقاصد کی تکمیل کی صورت نظر آئی۔ سلطان اور افغانی دونوں اتحاد اسلامی کے خواہاں تھے لیکن دونوں کے مقاصد میں بنیادی فرق تھا۔ سلطان اپنے تخت و تاج کی

---

(۱) عبدالغفار قاضی، آثار جمال الدین صفحہ ۱۷۶۔

حفاظت اور اپنے اقتدار کی بقا کے لیے اسلامی ممالک کا اتحاد چاہتے تھے - افغانی کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی اتحاد کی ایک ایسی شہر پناہ تعمیر ہو جائے کہ مغربی سامراج کے تند و تیز ریلے مسلمانوں کی عزت و آزادی کو نقصان نہ پہنچا سکیں—وہ طبعاً حریت پسند تھے - ملوکیت کے ساتھ ان کا سمجھوتہ ممکن نہیں تھا - اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے بالآخر سلطان، افغانی سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور استنبول میں ان کی نگرانی شروع ہو گئی - نظر بندی ھی کی حالت میں ۹ مارچ ۱۸۹۸ع کو سید جمال الدین افغانی نے وفات پائی -

سید جمال الدین افغانی نے مختلف اسلامی ممالک (ترکی، مصر، ایران) میں حریت و آزادی کی روح پھونکی - مشرق، علی الخصوص مسلمانوں کو درس اتحاد دے کر انہیں مغربی سامراج کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جانے کا پیغام دیا - "سید جمال الدین افغانی رح کا اصلی کارنامۂ غیر فانی یہ تھا کہ زمانے نے خود اس کو کام کرنے کی مہلت بہت کم دی - لیکن وہ اپنے اندر ایک ایسی قوت تخلیق رکھتا تھا کہ جہاں جاتا تھا اپنی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے نئے "جمال الدین" پیدا کر لیتا تھا"-[1]

مغرب کے سامراجیوں نے اس تحریک کو "پان اسلامک تحریک" یا "پان اسلام ازم" کا نام دے کر بدنام کرنا چاہا -

---

(۱) "الہلال" بابت ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ع

بہر کیف اتحاد اسلامی کی یہ تحریک کسی کے خلاف جارحانہ تحریک نہیں تھی - اس کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ مسلمان ممالک بیدار ہوں، متحد ہوں، اور اپنی عزت اور آزادی کا تحفظ کر سکیں - اگر ڈاکوؤں کے خلاف اپنے مال و جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنا جارحانہ اقدام ہے، تو پھر اس تحریک کو بھی جارحانہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں - بیسویں صدی میں اسلامی ممالک کی اصلاح و بیداری کی جد و جہد میں اتحاد اسلامی کے اس تصور نے اہم کام کیا - ہندوستان کی اسلامی سیاست بھی اس سے بہت متاثر ہوئی اور نوجوان مسلم رہنما محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں آزادیٔ وطن کے علاوہ اتحاد اسلامی کے اس جذبے سے بھی سرشار تھے -

دور انقلاب

بیسویں صدی کا آغاز — دور رد عمل :

سرسید احمد خاں کی وفات (۱۸۹۸ع) کے کچھ عرصے بعد تک مسلمانوں کی سیاست کالج کے انگریز پرنسپل اورھزآنر لفٹننٹ گورنر کی چشم التفات کی منتظر رہی اور مسلمان بالعموم یہی سمجھتے رہے کہ اس ملک میں اُن کے حقوق کا تحفظ مستحکم انگریزی حکومت کے قیام پر منحصر ہے - سر انطونی میکڈونل نے اپنے زمانۂ گورنری میں جو پالیسی اُردو ہندی کے تنازعے کے سلسلے میں اختیار کی تھی، اُس سے

اس خیال کا بطلان لازم آتا تھا مگر گورنمنٹ پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے کا جو سبق بقول رضا علی "سرسید اور مسٹر بیک نے مسلمانوں کو عرصۂ دراز تک پڑھایا اس کو یک قلم فراموش کرنا مشکل تھا"۔[1] سیاسیات میں مسلمانوں کی عام خاموشی سے مطمئن ہو کر گورنمنٹ بجا طور پر یہ سمجھنے لگی تھی کہ حکومت اپنی جو پالیسی بھی بنائے مسلمان اس کے خلاف کوئی شورش برپا نہ کریں گے۔ لیکن یہ بات قدرت کے مکافات عمل کے خلاف تھی۔ نئی صدی اپنے جلو میں نئی ذہنی و نفسیاتی تبدیلیاں لا رہی تھی۔ نئی تعلیم یافتہ پود کا ذہین اور حساس طبقہ ملک کی سیاسی محکومی اور مختلف طبقوں کی باہمی آویزش کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ مقامی صورت حال اور بین الاقوامی مد و جزر ملکی سیاسیات کو متأثر کرنے لگے تھے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کا بے حس و حرکت رہنا ممکن نہیں تھا۔

کانگرس میں بنگالی ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کو توڑنے کے لیے لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے دسمبر ۱۹۰۳ء میں بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا جس کے خلاف بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں شدید احتجاج ہوا۔ لارڈ کرزن اس مخالفت کو برداشت نہ کر سکے اور ۱۹۰۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ہندوستانیوں کے بارے

---

(۱) رضا علی، (سر) سید، اعمال نامہ، صفحہ ۱۰۸۔

میں کچھ نازیبا کلمات کہے جس پر بنگالیوں نے ایک طوفان برپا کر دیا اور ایک بڑے جلسۂ عام میں لارڈ کرزن اور آن کی پالیسی پر ملامت کی ۔ اس پر لارڈ کرزن سخت مشتعل ہوا ، اور بنفس نفیس ڈھاکہ پہنچ کر وھاں مسلمانوں کے ایک جلسے میں خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ ’’ تقسیم بنگال سے آن کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ بنگال کی گورنمنٹ کے انتظامی بوجھ کو ھلکا کیا جائے بلکہ ایک اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو‘‘ ۔[۱] لارڈ کرزن —— اتنے بڑے دبدبے کے وائسرائے کا خود چل کر مسلمانوں کے پاس ڈھاکہ آنا اور انہیں ایک اسلامی صوبے کے قیام کا مژدہ سنانا ، یقیناً بے زبان مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی بات تھی ——!

انہی ایام میں منٹو مارلے ریفارمز کا چرچا ہوا ۔ حکومت ہندوستانیوں کو کچھ سیاسی حقوق دینا چاہتی تھی ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی ضرورت تھی ۔ خود حکومت کو بھی اس بات کا احساس تھا ۔ چنانچہ باھمی افہام و تفہیم کے بعد نواب محسن الملک ایک وفد کی تشکیل کرتے ھیں جس میں سر کردہ ہندوستانی مسلمان شامل کیے جاتے ھیں ۔ یہ وفد ہزھائنس سر آغا خاں کی قیادت میں ۱۹۰۶ع کی گرمیوں میں شملہ پہنچا اور وائسرائے ہند کی خدمت میں باریاب ہوا ۔ مسلمانوں کا مطالبہ مذھبی بنیادوں پر حق انتخاب

(۱) طفیل احمد منگلوری ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ، صفحہ ۳۴۴

مان لیا گیا - جداگانہ حق انتخاب کی بدولت مسلمانوں کی الگ قومی حیثیت مسلّم ہو گئی ، اگرچہ اُن کی اقلیت کے مقابلے میں باقی سب ہندوستانی اقوام کو ایک صف میں کھڑا کر کے غالب اکثریت کی صورت مل گئی - اس وفد کی باریابی کے فوراً بعد مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کے لیے مسلمان اکابر کو ڈھاکہ مدعو کیا گیا - دسمبر ۱۹۰۶ع میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکے میں ہو رہا تھا - اسی موقعے پر نواب سلیم اللہ ہال میں مسلم لیگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا - نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے ہاتھوں میں قیادت کی باگ ڈور تھی - نواب وقار الملک کے ارد گرد نئی نسل کے چند نوجوانوں کا گروہ بھی تھا جس میں عزیز مرزا ، محمد علی ، شوکت علی ، مظہر الحق ، ظفر علی خاں ، حسن امام ، خواجہ غلام الثقلین وغیرہ شامل تھے - پرانے بزرگ خار زار سیاست میں پھونک کر قدم رکھ رہے تھے لیکن نوجوان رہنماؤں کی قوت عمل اب اپنے لیے ہنگامہ و پیکار کا ایک وسیع میدان مانگ رہی تھی -

مسلمانوں کے بارے میں حکومت کا رویہ بظاہر اطمینان بخش نظر آ رہا تھا - شملہ وفد کے مطالبات تسلیم کیے جا چکے تھے - بنگال کی تقسیم اگرچہ حکومت کا انتظامی مسئلہ اور بنگالی ہندوؤں کے خلاف ایک تادیبی کارروائی تھی ، تاہم اس سے مسلمانوں کو بھی کچھ فائدے کی توقع تھی - وزیر ہند

نے بھی اپنے اعلان میں تقسیم بنگال کو ایک طے شدہ مسئلہ قرار دے دیا تھا - اس لیے مسلمان رہنما مطمئن تھے - لیکن یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا - سامراجی حکومت کو مسلمانوں کی خوشی و اطمینان سے زیادہ اپنا مفاد عزیز تھا ' اور اپنے مفاد کی خاطر اُس کا اپنے اعلانات اور مواعید سے منحرف ہو جانا اس کے نزدیک کوئی بد اخلاقی کی بات نہ تھی- دسمبر ۱۹۱۱ع میں حضور ملک معظم قیصر ہند کا شاہی دربار دھلی میں بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوا - اطاعت گزار رعایا کے وفادار نمائندے ملک کے طول و عرض سے بڑی بڑی امیدیں لے کر شاہی دربار میں پہنچے - جشن تاج پوشی ہوا ' اور عین اس پر مسرت موقعے پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا گیا ——!

اطاعت گزار ' وفادار اور حکومت کے هم نوا مسلمانوں کی تذلیل اور دل شکنی کا سامان اور کیا ہو سکتا تھا - بقول نواب وقار الملک :

”گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا ' بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہو گی“[1]-

نواب وقار الملک نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ع کو علی گڑھ

---

(۱) محمد امین زبیری ' مکاتیب محسن الملک و وقار الملک ' صفحہ ۱۱۷ -

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد " ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ حالت" پر وہ پُر جوش مضمون لکھا جو مسلمانوں کی آئندہ پالیسی کا پیش لفظ تھا ۔ آپ نے فرمایا :

" یہ آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے، لاحاصل مشورہ ہے ۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا ۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیے، وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے، اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے"۔[1]

یہ زخم ابھی تازہ تھا کہ ۳ اگست ۱۹۱۳ع کو کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا خونین واقعہ پیش آیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا ۔ بیرونی حادثات اس کے علاوہ تھے ۔ ان پیہم حادثات نے مسلمانوں کے ذہن و فکر کا رخ بدل دیا ۔ وہ علی گڑھ تحریک کے حصار عافیت سے نکل کر جہد و عمل کی نئی راہوں پر چل پڑے ۔ قیادت کی باگ ڈور پرانے بزرگوں کے ھاتھ سے نکل کر نوجوان احرار رہنماؤں کے ھاتھ میں چلی گئی ۔ نئے دور کے رہنما برصغیر کے تین عظیم صحیفہ نگار تھے ـــ محمد علی جوہر مدیر کامریڈ و ہمدرد، ابوالکلام آزاد مدیر الہلال، اور ظفر علی خان مدیر زمیندار ۔ یہ دور ہندوستان کی

---

(۱) محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، صفحہ ۲۴۲ ۔

سیاسی و ادبی تاریخ میں ”اتحاد اسلام دور“ کہلاتا ہے۔

اتحاد اسلام دور:

۱۹۰۴ع میں بین الاقوامی سطح پر ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ روس، جو ایشیائی و یورپی سیاسیات میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا، جاپان سے شکست کھا گیا۔ یورپ کا سفید ریچھ اس ایشیائی خرگوش کے تیز دانتوں کی تاب نہ لا سکا۔ روس کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹے سے جزیرے کی قوم سے شکست کھا جانا بیسویں صدی کی ابتدا کا ایک بہت بڑا نفسیاتی واقعہ تھا جس سے بیداریٔ مشرق کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی نوجوان نسل جو سیاسی محکومی کی زنجیروں کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی، اس واقعے سے بہت متأثر ہوئی۔

اسلامی ممالک میں جو واقعات ظہور میں آ رہے تھے، وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کو جذباتی طور پر بہت متأثر کر رہے تھے۔ ۱۹۰۷ع میں روس اور برطانیہ نے ایران کا بٹوارہ کر کے یہاں اپنے حلقہ ہاے اثر قائم کر لیے لیکن ایرانی قوم پرستوں نے ایک سال بعد ہی انقلاب برپا کر کے قاچار شاہی کا خاتمہ کر دیا اور اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ ۱۹۰۹ع میں ترکان احرار نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے سلطنت عثمانیہ میں اصلاح و ترقی کے منصوبوں کو عملی شکل دینا چاہی۔ اسلامی ممالک کے ان داخلی انقلابات کو یورپ کی سامراجی

طاقتیں تشویش کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں - پیشتر اس سے
کہ سلطنت عثمانیہ اپنی داخلی اصلاح و تطہیر کی کوشش
کرے، سامراجی طاقتوں نے یورپ کے مرد بیمار کو ٹھکانے
لگانے کا بندوبست شروع کر دیا - منصوبے کے مطابق پہلے
اطالیہ نے (۱۹۱۱ع میں) طرابلس (لیبیا) پر حملہ کیا - طرابلس
میں سنوسی اخوان اور ترکان احرار نے مل کر حملہ آوروں کا
مقابلہ کیا اور اطالیہ کو دندان شکن جوابی حملوں سے
پریشان کر دیا - ہنوز یہ لڑائی جاری تھی کہ ریاست ہائے
بلقان نے (۱۹۱۲ع میں) یورپی ترکی پر یورش کر دی اور
ادرنہ (ایڈریانوپل) پر قبضہ کر لیا - شاہ یونان نے اسے
صلیبی جہاد قرار دیا - برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایسکوئتھ اور
وزیر خارجہ ایڈورڈ گرے نے فاتحین کو مبارکباد کے پیغام
بھیجے - طرابلس کے محاذ جنگ سے انور پاشا سمیت بہت سے
ترک جرنیل پُر اسرار طور پر بلقان کے محاذ پر پہنچ گئے اور
گھمسان کی جنگ کے بعد صلیبیوں کے ناپاک منصوبے خاک
میں ملا دیے گئے - ہندوستان کے مسلمان ان دلخراش خبروں
کو سن سن کر تڑپ رہے تھے - امید و بیم اور درد و الم کا
یہی وہ نازک زمانہ تھا جب ایک طرف شاعر مشرق اقبال اپنی
مینائے شعر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھر کر پیش کر
رہے تھے، اور حضور باری تعالیٰ میں شکوے شکایتوں کے
دفتر کھول رہے تھے - دوسری طرف شبلی نعمانی شہر آشوب

اسلام لکھ کر اپنا اور ہندوستان کے مجبور و بے بس مسلمانوں کے دل کی آہوں کا دھواں فضائے آسمانی میں بکھیر رہے تھے۔ نوجوان رہنماؤں نے اس نازک موقعے پر جو کچھ اُن کے بس میں تھا، کیا۔ چندے جمع کر کے ترکی بھیجے۔ ایک طبّی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں محاذ جنگ پر زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے گیا۔ زمیندار، الہلال، ہمدرد، مسلم گزٹ، کامریڈ نے اپنی بساط کے مطابق صحافت کے ذریعے اپنے مسلمان ترک بھائیوں کی حمایت میں لکھا۔

طرابلس اور بلقان میں آتش جنگ کی چنگاریاں ابھی پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھیں کہ یورپ میں پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴—۱۹۱۸ع) کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اگست ۱۹۱۴ع میں جرمنی و آسٹریا اور اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس) کے مابین ہنگامۂ کار زار گرم ہو گیا۔ نومبر ۱۹۱۴ع میں ترکی بھی جرمنی کا حلیف بن کر جنگ عظیم میں شامل ہوگیا۔ جنگ کا دائرہ یورپ اور مشرق وسطیٰ تک پھیل گیا۔ ہندوستان میں قانون تحفظ ہند نافذ کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو رانچی میں، مولانا محمد علی و شوکت علی کو چھندواڑہ میں مولانا حسرت موہانی کو فیض آباد میں اور مولانا ظفر علی خاں کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ ملک میں مرگ نما سکوت طاری ہوگیا۔ نوجوان احرار رہنماؤں کے نظر بند ہو جانے سے سیاسی جماعتوں میں اعتدال کی فضا غالب آگئی

جسے کسی حد تک ہوم رول تحریک کی معمولی سی شورش نے وقتی طور پر توڑا - ۱۹۱۶ع میں کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین میثاق لکھنئو ھوا - برطانوی حکومت نے جنگ میں ہندوستانیوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے کچھ وعدے کیے - گاندھی جی سمیت بعض کانگرسی رہنماؤں نے حکومت سے تعاون کا ثبوت دیا - نومبر ۱۹۱۸ع میں جنگ ختم ہو گئی - ہندوستانیوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کا وقت آیا تو سامراجی حکومت نے اپنی روایتی شان سے پہلو تہی کی اور ہندوستانیوں کی امیدوں و آرزوؤں کو رولٹ ایکٹ ایسے جابرانہ قوانین سے دبانا چاھا - اس سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی - کانگرس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں عوام کے اس جوش و خروش کو ایک منظم تحریک کی صورت دے دی - ۱۹۱۹ع کے اوائل میں ستیہ گرہ کی بنیاد رکھی گئی جس کے مطابق کانگرس کا ہر رکن یہ عہد کرتا تھا کہ اگر رولٹ ایکٹ ہم پر نافذ ہوا تو ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے - اپریل میں ایک دن ستیہ گرہ منائی گئی - سارے ملک میں پر امن ہڑتال کی گئی - حکومت نے اس پُر امن تحریک کے خلاف متشددانہ رویہ اختیار کیا - پہلے دھلی میں جہاں ستیہ گرہ کا دن ایک ہفتہ پہلے ۳۰ مارچ کو منایا گیا تھا، اور پھر ۶ اپریل کو امرتسر میں نہتے لوگوں پر گولی چلا دی گئی - امرتسر کے جوشیلے عوام بے قابو ہو گئے اور

انھوں نے اشتعال میں آ کر چند انگریزوں کو قتل کر دیا اور بنکوں میں آگ لگا دی ۔ اس کے بعد پنجاب پر انگریزی حکومت کا قہر و غضب ٹوٹ پڑا ۔ ۱۰ اپریل کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کے حکم سے فوج کے ایک دستے نے پر امن جلسے کو گھیرے میں لے کر مشین گن سے اتنی گولہ باری کی کہ سارا بارود ختم کر دیا ۔ ہزارہا آدمی مقتول و مجروح ہوئے ۔ اس کے بعد پنجاب میں مارشل لا نافذ کر کے مختلف شہروں پر ہوائی جہازوں سے لوگوں پر گولہ باری کی گئی ۔ امرتسر کے قتل عام اور مارشل لا کی سختی اور ذلت کے خلاف سارے ملک میں غم و غصے کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا وہ خون جو جلیانوالہ باغ میں بہا، ہندوستان کے مختلف طبقوں کے درمیان ربط و اتحاد کا ذریعہ بن گیا ۔

مسلمانوں کی آتش غضب کے بھڑکنے کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ فتح کے بعد اتحادیوں نے سب سے زیادہ انتقام دولت عثمانیہ سے لیا ۔ عہد نامہ سیورے کی رو سے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے ۔ شام پر فرانس قابض ہو گیا ۔ عراق و فلسطین پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ۔ انگریزوں کی زیر سر پرستی شرق اردن میں شاہ عبداللہ اور حجاز میں شریف مکہ کی حکومتیں قائم کر دی گئیں ۔ استنبول پر اتحادی افواج قابض ہو گئیں ۔ ایشیائے

کوچک کا ساحلی علاقہ یونانیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ترکوں کے پاس صرف اناطولیہ کا پہاڑی علاقہ رہ گیا۔ یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر کے وہاں قتل عام کا بازار گرم کر دیا۔ ان دلخراش خبروں نے ہندوستانی مسلمانوں کو انتہائی کرب میں مبتلا کر دیا۔ خلافت کے تحفظ کے لیے خلافت کمیٹی قائم کر دی گئی اور کانگرس کے ستیہ گرہ کے ساتھ ساتھ تحریک خلافت شروع ہو گئی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پر جوش قومی میلہ تھا جس میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ بڑے جوش و خروش سے اکٹھے ہوئے۔ نظر بند سیاسی رہنما زندانوں سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ خلافت کمیٹی میں مسلمانوں کا انگریزی دان طبقہ اور علماء دونوں مل بیٹھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کے مشترکہ مقصد نے خلافت کمیٹی کو کانگرس کے ساتھ مکمل اتحاد عمل پر آمادہ کر دیا۔ مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی کے عدم تعاون کے پروگرام کو کانگرس سے پہلے منظور کر کے جہاد آزادی میں ہراول دستے کا کام دیا۔

۱۹۲۰ء میں کانگرس کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں بر عظیم کے سارے نمائندوں نے متفقہ طور پر تحفظ خلافت اور سواراج کے حصول کے لیے ترک موالات کا

پروگرام منظور کر کے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے خلاف پُر امن بغاوت کا اعلان کر دیا - چند ماہ کے اندر ہزارہا ہندوستانیوں نے جیلوں کو آباد کر دیا - ہزارہا مسلمان ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے - فروری ۱۹۲۲ع تک سب با اثر رہنما گرفتار ہو چکے تھے - صرف گاندھی جی باہر رہ گئے تھے - حکومت کی حکمت عملی (پالیسی) اور تشدد کا سلسلہ دراز ہوا، جس سے عوام مشتعل ہونے لگے - مالا بار کے موپلوں کی شورش کو حکومت نے وحشیانہ تشدد سے دبا دیا - مارچ ۱۹۲۲ع میں چورا چوری کے مقام پر مشتعل ہجوم نے ایک پولیس چوکی کو نذر آتش کر دیا - اس پر گاندھی جی نے سول نافرمانی کے پروگرام کو معطل کر دیا - ہندوستانیوں کے آتشیں جذبات ایک دم سرد پڑ گئے - حکومت نے بڑے اطمینان سے گاندھی جی کو گرفتار کر کے چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا -

برعظیم میں ہندو مسلم اتحاد کے اس خوش کن عہد کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا اندوہناک سلسلہ شروع ہوگیا - بعض آریہ سماجی لیڈروں کو خاص مصلحت کے تحت جیلوں سے رہا کردیا گیا - ہندوؤں کا مصلحت پسند گروہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی رہنمائی میں پہلے ہی اس عمومی تحریک سے الگ تھلگ اپنے پروگرام میں سرگرم تھا - اب آریہ سماجی لیڈروں نے نہایت دلآزار طریقے سے اسلام اور بانیٔ اسلام صلعم

پر رکیک حملے شروع کردیے۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز تحریکوں کو شروع کرکے اتحاد کے تانے بانے کو تار عنکبوت کی طرح توڑ دیا۔ کئی شہروں میں فسادات ہوئے۔ ہندو فرقہ پرستوں کی ان اشتعال انگیزیوں کے مقابلے میں مسلمان رہنماؤں نے اپنی تنظیم اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ملک کے طول و عرض میں خوابیدہ فتنے جاگ اٹھے۔ سامراج کی حکمت عملی کامیاب رہی۔ سواراج کی منزل نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

مسلمانان ہند کو امید و بیم کے ایک اور ہنگام کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۲۲ء میں ترکان احرار نے مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں دریائے قیساریہ کی جنگ میں یونانیوں کو عبرت ناک شکست دے کر سمرنا کو بھی واپس لے لیا اور استنبول پر بھی قبضہ کرلیا۔ معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط صلح کے بعد لوزان میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی اور معاہدہ صلح فاتح ترکوں کی مرضی کے مطابق طے ہوا۔ اسلامیان ہند ترکوں کی اس فتح مبین پر خوشیاں مناتے ہیں۔ شعرا پرجوش نظمیں لکھتے ہیں۔ لیکن بہت جلد یہ خوشیاں مایوسی کی نذر ہوگئیں۔ عثمانی ترکوں نے جو گذشتہ سات سو سال سے اسلام کی حفاظت کے لیے شمشیر بکف رہے تھے، ۱۹۲۴ء میں خلافت کی قبا چاک کر ڈالی اور اپنی حکومت کو لادینی حکومت قرار دے دیا۔ ہندوستانی مسلمان جو اتحاد اسلامی

کے تصور سے سرشار خلافت کے تحفظ و بقا کے لیے اتنی قربانیاں دے رہے تھے ، اس فیصلے سے از حد مایوس ہوئے۔ تحریک خلافت انتہائی عروج پر پہنچ کر انتشار و اضمحلال کا شکار ہوگئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی جذباتی نصب العین نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان کی اپنی صفوں میں بھی تشتت و افتراق پیدا ہوگیا ، اور جو قوت سامراج کے خلاف استعمال ہو رہی تھی ، وہ مختلف گروہ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے لگے۔

۱۹۲۴ع میں گاندھی جی علالت کی بنا پر رہا کردیے گئے۔ ملک میں وحشیانہ فسادات کو روکنے کے لیے انہوں نے برت رکھا۔ ہندو ، مسلم اکابر کو بھی قدرے ہوش آیا۔ لیکن برعظیم کے بھلے دن اب خواب و خیال ہوگئے تھے۔ دلوں میں جو کدورتیں پیدا ہوگئی تھیں ، ان کا دور ہونا اب ممکن نہیں تھا۔ خود کانگرس کے اندر بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک مصلحت پسند گروہ جو حکومت سے موالات کرکے اور کونسلوں میں جا کر سواراج کی جنگ لڑنا چاہتا تھا ، اور دوسرا اصول پسند گروہ جو ترک موالات کا حامی تھا اور اس پر کاربند رہنا چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کے سرخیل پنڈت موتی لال نہرو تھے اور مسلمان رہنما ثانی الذکر گروہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں بڑی مشکل سے ایک منفی قسم کا سمجھوتہ ہوا۔

۱۹۲۶ء میں نجد کے امیر سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے انگریزوں کے حلیف شریف حسین والیٔ حجاز کو شکست دے کر حجاز کی مقدس سرزمین کو اس غدار اسلام کے وجود نامسعود سے پاک کردیا ۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس واقعے سے ایک گونہ خوشی ہوئی ۔ اتحاد عالم اسلامی کے تصور میں امید کی ایک کرن چمکی ۔ حریفوں نے نجدیوں کے خلاف قبہ شکنی کے سلسلے میں معاندانہ پروپیگنڈا کرکے انتشار پیدا کرنا چاہا جس سے کچھ سادہ لوح مسلمان متأثر بھی ہوئے ۔ سلطان نجد وحجاز نے ان مغالطوں کو دور کرنے اور ایک اسلامی مرکزیت کے قیام کی خاطر مختلف ممالک کے مسلمانوں کی ایک مؤتمر بلائی ۔ ہندوستان کے مختلف مسلمان اکابر بھی اس میں شریک ہوئے ۔ بہت سے مغالطے تو دور ہوگئے لیکن عالم اسلامی کے مرکز کے بارے میں کوئی ٹھوس نتیجہ نہ نکل سکا ۔ اس قسم کے تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ابھی فضا بھی سازگار نہیں تھی ۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کرنے کے لیے ۱۹۲۷ء میں ایک کمشن مقرر کیا ۔ سائمن کمشن کا تقرر کرتے ہوئے وزیر ہند لارڈ بروکن ہیڈ نے اہل ہند کو کمشن کے سامنے کوئی متفقہ آئین پیش کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ پیش گوئی بھی کر دی کہ ”وہ ہرگز متفقہ آئین پیش نہ کر سکیں گے“۔ اس کمشن کے سارے

ارکان انگریز تھے ۔ وزیر ہند کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے ہندوستانیوں کی بڑی خواہش تھی کہ وہ کوئی متفقہ آئین ترتیب دے کر پیش کریں ۔ اتحاد و اتفاق کی باتیں پھر زبانوں پر آنے لگیں ۔ سائمن کمشن کے مقاطعہ کا متحدہ فیصلہ کیا گیا ۔ فروری ۱۹۲۸ع میں جب سائمن کمشن نے ساحل ہند پر قدم رکھے تو ہندوستانیوں نے مکمل ہڑتالوں اور مخالفانہ مظاہروں سے کمشن کا استقبال کیا ۔ سر جان سائمن نے اس صورت حال سے متأثر ہو کر چند ہندوستانی ممبران اسمبلی کو بھی کمشن میں شریک کر لیا ۔ لیکن ملک کے جمہور اور عوامی جماعتوں نے سائمن کمشن کا پُر زور مقاطعہ جاری رکھا ۔ البتہ بعض رجعت پسند ہندو، مسلمان جماعتیں اور افراد اپنی اپنی عرضداشتیں کمشن کے سامنے پیش کرکے حکومت کی نظروں میں سرخرو ہو رہے تھے ۔

سائمن کمشن کے جواب میں پنڈت موتی لال نہرو نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے تعاون سے دستور اساسی کا ایک خاکہ ڈومینین اسٹیٹس کی بنیاد پر بنایا ۔ اس دستور پر قریب قریب سب جماعتیں متفق ہو گئی تھیں، البتہ فرقہ پرست ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے (جس میں علی برادران بھی شامل تھے) اس سے اختلاف کیا ۔ فرقہ وارانہ مسئلہ، جس کی جڑیں بہت گہری ہو چکی تھیں، لاینحل ہی رہا جس کے نتیجے میں ہندو مسلم کشیدگی روز

بروز بڑھتی جا رہی تھی - خود مسلمانوں کی صفوں میں بھی انتشار رونما ہو چکا تھا - مسلمانوں کے ایک طبقے نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں مسلم لیگ سے الگ ہو کر نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنا ڈالی - پنجاب کی خلافت کمیٹی نے مجلس احرار اسلام کی شکل اختیار کر لی تھی - یہ جماعتیں آزادی کی جد و جہد میں کانگرس کی ہم نوا تھیں -

دسمبر ۱۹۲۸ع میں کانگرس کے اجلاس کلکتہ نے نہرو رپورٹ اس شرط پر منظور کر لی کہ ایک سال کے اندر اندر حکومت اسے تسلیم کرے ، ورنہ یہ رپورٹ خود بخود کالعدم ہو جائے گی - ایک سال گزر گیا لیکن کانگرس کا مطالبہ پورا نہ ہوا - ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ع کو کانگرس کے اجلاس لاہور نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی ہے - آدھی رات گزرنے کے بعد رہنماؤں نے رضا کاروں کے ساتھ مل کر راوی کے کنارے رقص آزادی کا مظاہرہ کیا - ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ع کو ملک بھر میں آزادی کا حلف اٹھایا گیا ، اور مارچ میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک شروع کر کے سول نافرمانی کا بگل بجا دیا -

سائمن کمشن کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستانی مسئلہ حل کرنے کے لیے لندن میں گول میز کانفرنسوں کا

سلسلہ شروع کیا ۔ فرقہ وارانہ مسئلے کی پیچیدگی نے ان کانفرنسوں کو کسی نتیجے پر نہ پہنچنے دیا ۔ بالآخر حکومت نے اپنے نامزد کردہ ارکان کے مشورے سے آئینی اصلاحات کی ایک تجویز ایکٹ ۱۹۳۵ع کی شکل میں منظور کی ۔ اس ایکٹ کے ایک جزو کے مطابق ۱۹۳۷ع میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے ۔ کانگرس کو گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں نمایاں اور دو میں جزوی اکثریت حاصل ہوئی ۔ کانگرس نے ان صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں اور مسلم لیگ کو بالکل نظر انداز کر دیا ۔ مسلمانوں کے سیاسی خلفشار نے کانگرس کی ہندو ذہنیت کو خاصی تقویت پہنچائی ، اور پنڈت جواہر لال نہرو یہاں تک کہہ گئے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ، کانگرس اور برطانوی حکومت ـــــ اس نازک صورت حال میں قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی اور چند برس میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کر کے اور اسے ایک فعال عوامی جماعت بنا کر کانگرسی رہنماؤں کے نشۂ پندار کو توڑ دیا ۔ کانگرس پر مہا سبھائی ذہنیت اس قدر غالب آ چکی تھی کہ رفتہ رفتہ مسلمان رہنما و کارکن اس کا ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور ہو رہے تھے ۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات نے شدت اختیار کر کے ہندو اور مسلم دو قوموں کی باہمی آویزش کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۰ع) میں تقسیم ملک کی قرارداد

منظور کر کے مسلمانوں کی ایک خود مختار مملکت کا تصور پیش کیا، جہاں وہ اپنے اسلامی اسالیب حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس نصب العین کی تعیین اور حصول نے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیا، اور چند برس کی جد و جہد میں وہ اپنی خود مختار مملکت ''پاکستان'' کے حصول (اگست ۱۹۴۷ع) میں کامیاب ہو گئے۔

ظفر علی خاں بیسویں صدی کے اس سیاسی مد و جزر کے، جس کا خاکہ اوپر پیش کیا گیا، ایک اہم کردار تھے۔ انھوں نے نہ صرف ایک عوامی رہنما کی حیثیت سے خطۂ مینو سواد پنجاب میں، جو برطانوی شہنشاہیت کی بقا کے لیے رنگروٹوں کی ایک منڈی بنا ہوا تھا، حریت و انقلاب کی روح پھونکی، بلکہ شعر و ادب اور صحافت کی ایک نئی، عظیم اور جان دار روایت قائم کی۔ سیاسی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ آج کے آتشیں مسائل کل تاریخ کا حصہ بن کر کسی سرد خانے کی زینت بن جاتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ان مسائل سے وابستہ شخصیتیں تاریخ ماضی کا کردار بن کر عام نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً ہنگامی حالات اور ہنگاموں کی پروردہ شخصیتیں حالات معمول پر آنے کے بعد تاریخی پس منظر میں غائب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی حال بیسویں صدی کے اس ہنگامہ خیز دور اور اس سے وابستہ اہم شخصیتوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لیکن کوئی دیانت دار مؤرخ اس حقیقت سے انکا

نہیں کر سکتا کہ اس دور جد و جہد میں ظفر علی خاں ایک اہم کردار اور نمایاں شخصیت تھے ۔

اس تاریخی حیثیت کے علاوہ ظفر علی خاں کی ایک اور حیثیت بھی ھے، اور وہ ھے اُن کی ادبی حیثیت، جو اتنی جان دار اور منفرد ھے کہ اُسے تاریخ ماضی کا افسانہ سمجھ کر فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ اُردو ادبیات کی آبیاری میں ظفر علی خاں نے اپنے خامۂ بہار آفریں سے اہم خدمات سر انجام دی ھیں ۔ انیسویں صدی کا ادب اصلاحی رجحانات کا آئینہ دار تھا جس کا مقصد قوم کو اس کی خستہ حالی کا احساس دلا کر اصلاح احوال پر آمادہ کرنا تھا ۔ اس لیے اس کے لہجے میں مرثیہ خوانی کا انداز غالب تھا ۔ اکبر نے ظرافت کا کچھ سامان پیدا کیا لیکن یہ ظرافت بھی معاشرے کے المیے اور شاعر کے سوز دروں کی آئینہ دار تھی ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ کیفیت بدل گئی تھی ۔ قوم اصلاح کی منزلوں سے گزر کر جہد و عمل کی شاہراہ پر آ گئی تھی ۔ اس مقام پر اسے مرثیہ خوانی کی بجائے رجز خوانی کی ضرورت تھی، اور اس رجز خوانی کے لیے مردانہ لہجہ درکار تھا ۔ یہ لہجہ ادبیات اردو کو پنجاب کے نامور شاعروں و ادیبوں نے عطا کیا :

حاسدان تیرہ باطن کے جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب! اقبال اور ظفر پیدا ہوئے

دوسرا باب

احوال و کوائف

ظفر علی خان پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹ میرتھ (متصل ریلوے سٹیشن سوہدرہ، تحصیل وزیر آباد) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۰ ھجری (مطابق ۱۸۷۳ عیسوی) اُن کا سال ولادت ہے۔ شروع میں اُن کا نام خدا داد رکھا گیا جسے بعد میں ظفر علی کے تاریخی نام سے بدل دیا گیا[1]۔ ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں محکمہ ڈاک و تار میں ملازم تھے اور سلسلۂ ملازمت کی وجہ سے انہیں مختلف مقامات پر جانا پڑتا تھا لیکن اس متواتر نقل مکانی کے باوجود انھوں نے ظفر علی خاں کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ مولوی سراج الدین احمد خاں سرسید کی تعلیمی و معاشرتی تحریک کے بڑے حامی تھے۔ مذہبی اقدار و روایات انہیں بہت عزیز تھیں اور مشرقی علوم و ادبیات سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اس ماحول میں ظفر علی خاں کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مڈل تک تعلیم مشن اسکول

(۱) ظفر علی سے اُن کا سال ولادت نکلتا ہے (ظ = ۹۰۰ + ف = ۸۰ + ر = ۲۰۰ + ع = ۷۰ + ل = ۳۰ + ی = ۱۰ = ۱۲۹۰ ہجری۔

وزیر آباد میں حاصل کی ۔ اس دوران میں ایک بار انہیں علی گڑھ کے مدرسے میں بھی بھیجا گیا لیکن وہ کچھ عرصہ وھاں رہ کر واپس چلے آئے اور مڈل کا امتحان مشن اسکول وزیر آباد ھی سے پاس کیا ۔ اس کے بعد ظفر علی خاں کو اُن کے پھوپھا مولوی محمد عبداللہ خاں پروفیسر عربی مہندر کالج پٹیالہ کے پاس بھیج دیا گیا ۔ اپنے پھوپھا کی زیر نگرانی انہوں نے یہاں سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ۔ مولوی سراج الدین احمد خاں ان دنوں ملازمت کے سلسلے میں بھوانی میں تھے ۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ظفر علی خاں کو ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں بھیج دیا گیا ۔ یہاں سے ۱۸۹۲ع میں انٹرمیڈیٹ (ایف ۔ اے) کا امتحان پاس کیا ۔ مولوی سراج الدین احمد اُن دنوں کشمیر میں ڈاک و تار کے افسر اعلیٰ تھے ۔ انھوں نے ظفر علی خاں کو سری نگر بلا لیا اور اسی محکمے میں ملازم کرا دیا ۔ لیکن یہ ملازمت ظفر علی خاں کو راس نہ آئی ۔ اُن کا مزاج اس قسم کی سرکاری ملازمت کے لیے ساز گار نہیں تھا ۔ چنانچہ بہت جلد اپنے ایک افسر سے الجھ پڑے ۔ اس کی ھجو لکھی اور ملازمت سے دست کش ھو کر ۱۸۹۳ع میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوبارہ علی گڑھ پہنچ گئے ۔

اس زمانے میں ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں علامہ شبلی نعمانی عربی کے پروفیسر تھے ۔ مسٹر ٹی ۔ ڈبلیو ۔

آرنلڈ (جو بعد میں لاهور چلے آئے اور علامه اقبال کے استاذ هوئے) فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان اساتذه کی نگرانی میں کالج میں علمی و ادبی فضا قائم تھی۔ علم و ادب کے فروغ کے لیے کالج میں دو انجمنیں قائم تھیں۔ ایک انجمن ''اخوان الصفا'' تھی جس کے سیکرٹری پروفیسر آرنلڈ تھے۔[1] ظفر علی خاں اس کے رکن تھے۔ اس انجمن کے ارکان مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے تھے۔ دوسری انجمن ''لجنة الادب'' تھی جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔[2] ظفر علی خاں اس کے بھی رکن تھے۔ ''ستارۂ صبح'' کی اشاعت یکم دسمبر ۱۹۱٦ع میں ''صلائے خاص ہے یاران نکته چیں کے لیے'' کے عنوان سے قارئین کرام کو مضمون نویسی کی دعوت دیتے هوئے علی گڑھ کے اس دور کے تأثرات ظفر علی خاں یوں بیان کرتے هیں:

''یادش بخیر پروفیسر آرنلڈ جس زمانه میں مدرسة العلوم کی شاندار روایات کو اپنی مسیحا نفسی سے ایک نئی زندگی بخش رہے تھے جنھوں نے اس دارالعلوم کو مشرق کا سب سے زیاده سر برآورده مرکز معارف بنا دیا ہے، تو آپ وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو ایسی قیمتی نصیحتیں فرماتے رهتے تھے جو آپ هی کے وسیع تجربے اور صحیح

---

(۱) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، صفحه ۲۳۸ -

(۲) حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، صفحه ۸۴۴ -

ذوق علمی کا حصہ ہیں۔ مثلاً ایک لطیف نکتہ ایک موقع پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہر طالب علم کو چاہیے کہ کسی موضوع پر کوئی سی ایک نئی کتاب خواہ بغرض مطالعہ خواہ بطور تفنن طبع دیکھنا شروع کرے اور ایک ہفتہ میں اُسے ختم کر کے برسبیل تبصرہ اُس کے تمام مضامین کا ایک علمی صحبت میں آ کر اعادہ کر دیا کرے۔ گویا کہ یہ اس کتاب کا ایک جامع ریویو ہو جس سے نہ صرف خود تبصرہ خواہ مکرر مستفید ہو سکے بلکہ حضار محفل کے معلومات میں بھی جدید اضافہ کی صورت نکل آئے اور اس طریقہ سے ہر ہفتہ کی علمی صحبت میں متعدد قابل دید کتب پیش نظر ہو جایا کریں۔

افتاد مذاق کے لحاظ سے طبایع مختلف ہوتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ کی گراں مایہ موعظت اُن کے جن تلامذہ کا آویزۂ گوش ہوئی اُن کی تعداد اگرچہ قلیل تھی لیکن پھر بھی خواجہ غلام الثقلین مرحوم[1] کی طرح جن اہل بصیرت نوجوانوں نے اس پر عمل کیا وہ آگے چل کر اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔ کاش ہر وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی دھن میں

---

(۱) خواجہ غلام الثقلین مدیر ”عصر جدید“ (کلکتہ) ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو وفات پا گئے تھے۔

چراغ نیم شبی سے لو لگاتا ہے اس مشورہ پر عمل کر سکے ۔ مگر جس طرح ہر شخص بو علی سینا نہیں ہو سکتا ، اسی طرح ہر شخص کو درس اشارات و شفا کہنے کی اہلیت بھی نہیں دی گئی :

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر !''

اس علمی و ادبی ماحول میں ظفر علی خاں کی فطری صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں ۔ جو بات انہوں نے استعارةً خواجہ غلام الثقلین کے بارے میں کہی ہے ، وہ خود اُن پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے ۔ اُن کی بعد کی تصنیفی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ علی گڑھ کی فضا نے اُن کو اُردوے معلیٰ کی محاوراتی چاشنی بخشی ، انگریزی علم و ادب کے مطالعے نے اُن کے طرز نگارش میں مغرب کے نقادانہ وصف کو اجاگر کیا ــــ عربی نے اُن کی تحریر میں زور پیدا کیا اور فارسی نے نفاست خیال اور نزاکت بیان ! پروفیسر آرنلڈ کے فیض تربیت کا اظہار مذکور بالا عبارت میں ہوا ہے ۔ علامہ شبلی کے فیض صحبت (جو علی گڑھ کے بعد حیدر آباد میں بھی انہیں میسر آیا) کا اعتراف ظفر علی خاں نے اس شعر میں کیا ہے :

یہ فیض صحبت علامہ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

علی گڑھ کی ادبی فضا ان دنوں حالی و شبلی کے قومی نغموں سے گونج رہی تھی ۔ ظفر علی خاں ، جنہیں مبدءٔ فیاض

نے ملکۂ شعری بچپن ہی سے ارزانی فرمایا تھا ، اس فضا سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ۔ چنانچہ شعر و شاعری کی طرف اُن کا فطری میلان اور بھی زیادہ ہونے لگا ۔ انہوں نے کالج کی مختلف تقریبات میں فارسی اور اُردو میں نظمیں پڑھنی شروع کیں ۔ یہ نظمیں کالج کی ضروریات اور قومی حالات کے متعلق ہوا کرتی تھیں ۔ علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو کالج میں ایک بڑا جلسہ ہوا ۔ اس جلسے میں ظفر علی خاں نے اپنے استاذ کے حضور ہدیۂ عقیدت کے طور پر ایک فارسی قصیدہ پڑھا جو بقول سید سلیمان ندوی ”اُن کا ابتدائی کلام ہے مگر سالے کہ نکواست از بہارش پیدا ست ۔“[1] اسی طرح ایک مرتبہ کالج میں ایک بڑا ڈنر تھا ۔ اس موقعے پر اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا ۔ سرسید احمد خاں اور دوسرے قومی زعما ڈائس پر رونق افروز تھے ۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا ۔ ظفر علی خاں نے ڈائس پر آ کر اپنی ایک فارسی نظم بڑے پر جوش لہجے میں پڑھی ، جس میں سرسید احمد خاں کی قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کے پر تاثیر شعر کہے گئے تھے :

مسخر کرد نطقم کشور جادو بیانی را
بہ دام آورد طبعم صید وحشیٔ معانی را

---

(۱) حیات شبلی ، سید سلیمان ندوی ، صفحہ ۲۵۱ ۔

ببین آن سید احمد کمر از همتش محکم
که ماهر هست یکسر چارۂ درد نہانی را
ریاض قوم آب از اشک ہائے چشم او گیرد
فلک چشم تو گاہے دیدہ است این باغبانی را

ظفر علی خان کے ان اشعار پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے، اور سرسید مرحوم نے فرط مسرت سے اس نوجوان کو گلے لگا لیا۔[1]

ظفر علی خاں نے ۱۸۹۵ع میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ نواب محسن الملک ان دنوں حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ غلام الثقلین کے مستعفی ہونے کے بعد نواب صاحب کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی وساطت سے ظفر علی خاں کا تقرر اس جگہ ہوا، اور وہ پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے نواب صاحب کی انگریزی خط و کتابت کا جواب دینے کے علاوہ اُن کے ایما و ارشاد پر فلسفے کے مضامین اور کتب وغیرہ کا اُردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ مسٹر بیلفور کے مضامین اسی زمانے میں اُردو کے قالب میں ڈھالے گئے اور ولیم ڈریپر کی تصنیف کے ترجمے "معرکۂ مذہب و سائنس" کا ڈول بھی اسی زمانے میں ڈالا گیا۔

---

(۱) علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر) ۵۵ — ۱۹۵۴ع، صفحہ ۵۹۔

تقریباً ایک سال تک ظفر علی خاں نواب محسن الملک کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے - اسی دوران میں مولانا شبلی نعمانی بمبئی آئے اور ظفر علی خاں نے اُن سے حیدر آباد کے کوائف سن کر وہاں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا - انگریزی حکومت کی ملازمت کے وہ طبعاً مخالف تھے - خیر، نواب صاحب اور مولانا شبلی کے مشورے سے حیدر آباد گئے اور نواب افسر الملک بہادر سپہ سالار افواج نظام کے ماتحت فوج میں ملازم ہو گئے - سیر و شکار اور ورزش کا شوق شروع ہی سے تھا - علی گڑھ کالج میں بھی تعلیم سے دلچسپی کے علاوہ کھیل کے میدان میں خوب حصہ لیا - فوجی زندگی اختیار کرنے کے بعد اس شوق کو اور جلا ملی - فنون حرب اور شہسواری و نیزہ بازی میں بھی انہوں نے جلد ہی نام پیدا کر لیا -

نواب افسر الملک کے ماتحت کام کرتے ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ مولوی عزیز مرزا (ہوم سیکرٹری)[1] کی نگاہ انتخاب اُن پر پڑ گئی اور انہوں نے ظفر علی خاں کی

---

(۱) مولوی عزیز مرزا (متوفی ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء) علی گڑھ کالج کے گریجویٹوں کی پہلی کھیپ کے ایک سر کردہ رکن تھے - مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس کے سیکرٹری بھی رہے - منصبی اور سیاسی خدمات کے علاوہ ادب سے بھی تعلق رہا - ''خیالات عزیز'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے - کالیداس کے ڈرامے وکرم اروسی کو اُردو کے قالب میں ڈھالا - بہمنی عہد کے نامور وزیر محمود گاواں کی سوانحعمری لکھی -

خدمات ہوم آفس میں مترجم کے عہدے کے لیے حاصل کر لیں - یہاں کچھ عرصے بعد وہ لیجسلیٹو کونسل کے رجسٹرار ہو گئے - اس منصب کی تنخواہ ۳۵۰ روپے ماہوار تھی - ظفر علی خاں نے اس منصب کے فرائض اس خوش اسلوبی سے سر انجام دئیے کہ کچھ عرصے کے لیے انہیں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے منصب پر فائز کر دیا گیا جس کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار تھی -[1] اس زمانے میں میر محبوب علی خاں حیدرآباد کے نظام تھے - ظفر علی خاں کچھ عرصہ ولی عہد سلطنت میر عثمان علی خاں کے اتالیق بھی رہے - ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں نے علمی و ادبی مشاغل بھی جاری رکھے اور ملازمت کے دوران شعر و ادب کی تخلیق ، انگریزی کتب کے تراجم اور ادبی جرائد کے اجرا کا سلسلہ قائم رکھا - اس زمانے میں دکن میں رود موسیٰ کی طغیانی ایک حادثۂ عظیم تھی جس نے حیدر آباد میں حشر برپا کر دیا تھا - خانماں برباد لوگوں کے لیے شہر میں مختلف امدادی مرکز قائم کیے گئے - افضل گنج کے علاقے کا انتظام ، جہاں تقریباً پچاس ہزار تباہ حال انسانوں کے کھانے ، کپڑے اور رہائش کا سامان مہیا کیا گیا تھا ، ظفر علی خاں کے سپرد ہوا - انہوں نے نہایت ہمدردی اور جاں سوزی سے مسلسل اٹھارہ دن تک شب و روز یہ خدمت سر انجام دی -

---

(۱) فوق ، محمد دین ، اخبار نویسوں کے حالات زندگی ، صفحہ ۱۲ -

حکومت نظام نے آن کی ان خدمات اور حسن انتظام پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس قیامت خیز طغیانی کے بارے میں ظفر علی خاں نے ایک پر تاثیر نظم ''شور محشر'' کے عنوان سے لکھی، جسے ہزاروں کی تعداد میں چھاپا گیا اور اس کی آمدنی رود موسیٰ کے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے وقف کر دی گئی۔ ظفر علی خاں نے یہ نظم ایک بہت بڑے جلسے میں بھی سنائی، جس میں مہاراجہ سر کشن پرشاد (مدارالمہام حکومت نظام) کے علاوہ بہت سے دوسرے حیدر آبادی امرا بھی موجود تھے۔ ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں میں اس نظم کا بڑا شہرہ ہوا۔

ظفر علی خاں نے حیدرآباد میں سنہ ۱۹۰۲ع کے اواخر میں ''افسانہ'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن کا ترجمہ ''اسرار لندن'' کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ کچھ عرصے بعد ۱۹۰۳ع میں انہوں نے ''دکن ریویو'' جاری کیا۔ ''مخزن'' کی طرح یہ بھی ایک معیاری علمی و ادبی رسالہ تھا اور اسی تقطیع اور ضخامت کا حامل تھا۔ اس میں مشرق و مغرب کے اچھے خیالات کا امتزاج پیش کیا جاتا اور ادبیات اردو کو مغرب کے تنقیدی اصولوں کے مطابق جانچا جاتا۔ ان تنقیدی تحریروں کو ملک میں نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔[1] ان

---

(۱) زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، روح تنقید، صفحہ ۲۵۔

تنقیدی تحریروں میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں کی فطری شوخی اور طنز و ظرافت بھی جھلکنے لگتی تھی جس کا ہدف ہم عصروں کے علاوہ کبھی کبھی اُن کے اساتذہ بھی بن جاتے تھے۔ مولوی عبدالحق ایک واقعہ بیان کرتے ھیں کہ "قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا (حالی) سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ دکن ریویو نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ھے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی۔ لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ھے۔"[1]

مولوی عزیز مرزا (ہوم سیکرٹری) کا تبادلہ بحیثیت ڈپٹی کمشنر گلبرگہ ہو گیا تو اُن کی جگہ نواب سربلند جنگ ہوم سیکرٹری مقرر ہوئے۔ نواب صاحب قدرے ترش رو

(۱) عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۸۔

اور چڑچڑے مزاج کے تھے - ظفر علی خاں کی جودت طبع کو ایک مضمون ھاتھ آ گیا - قلم اٹھایا اور ھجو لکھ ماری - آدھر سربلند جنگ کو خبر ھوئی ' ادھر ظفر علی خاں رخصت لے کر اپنے دوست اور علی گڑھ کالج کے ھم جماعت میر محفوظ علی بدایونی کے پاس بربرہ (سومالی لینڈ) چلے گئے-[1] میر صاحب بھی کچھ ملازمت سے بیزار تھے- دونوں دوستوں نے مل کر بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی - چنانچہ بمبئی میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا اور اوریئنٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ بنا ڈالا گیا - جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ھاتھی دانت کا سامان درآمد کیا گیا ' مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی - دونوں دوست ادیب تھے' اور یہ مسئلہ کاروبار کا تھا جس کے لیے تخیل سے زیادہ حقیقت پسندی کی ضرورت تھی - تھوڑے دنوں میں کاروبار ٹھپ ھو گیا - میر محفوظ علی تو دل شکستہ ھو کر اپنے گھر بدایوں چلے گئے اور ظفر علی خاں نے بمبئی سے ''دکن ریویو'' نکالنے کا فیصلہ کیا - چند پرچے نکالے تھے کہ بقول خود بمبئی میں ''سکر کا بھاؤ مدھم'' دیکھ کر پھر حیدرآباد چلے آئے جو ''دکن ریویو'' کا جنم بھوم تھا -[2]

(۱) سید محفوظ علی بدایونی (وفات ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ع بعمر ۷۳ سال) اس زمانے میں سومالی لینڈ (افریقہ) میں ججی کے عھدے پر فائز تھے- بعد میں مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''کامریڈ'' و ''ہمدرد'' میں شریک کار رہے-

(۲) دکن ریویو ' جلد ۱ نمبر ۵ (مارچ ۱۹۰۷ع) ' صفحہ ۵۶ -

حیدرآباد کے زمانۂ قیام ھی میں ظفر علی خاں نے انگریزی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا - ان کے یہ مضامین بمبئی گزٹ اور ٹائمز آف انڈیا میں چھپا کرتے تھے - بمبئی میں ظفر علی خاں نے سٹوڈنٹس برادر ھڈ کی ایک مجلس میں جنگ روس و جاپان کے نفسیاتی اثرات پر انگریزی میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ بھی دیا - اس سے قبل وہ اس جنگ سے متعلق ایک ضخیم ڈراما بھی لکھ چکے تھے - پنجاب کے اردو رسائل و اخبارات (مخزن ، زمیندار ، پیسہ اخبار ، وطن وغیرہ) سے بھی اُن کے قلمی تعلقات قائم ھو چکے تھے - شیخ سر عبدالقادر مدیر مخزن فرماتے ھیں کہ ''ظفر علی خاں کی کئی نظمیں ''مخزن'' کے ابتدائی دور میں شائع ھوئیں اور بہت پسند کی گئیں - مگر اُن کے اپنے ادبی رسالوں اور اخبار کی زبردست ضروریات اور دیگر سیاسی اور معاشرتی مصروفیات کے سبب مخزن اُن کے رشحات قلم سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکا ، جتنی پہلے توقع تھی - ''[۱]

حیدرآباد میں قیام کا یہ زمانہ ظفر علی خاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا درخشاں دور تھا - دلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلیں جب سونی پڑ گئیں تو حیدرآباد ھی ایک ایسا مرکز تھا جہاں ابھی قدیم تہذیبی شمعیں فروزاں تھیں اور شاعر و ادیب پروانوں کی طرح یہاں کھچے چلے آ رہے تھے -

---

(۱) مخزن ، جنوری ۱۹۳۹ع ، صفحہ ٦ -

داغ دہلوی ، امیر مینائی ، ظہیر دہلوی اور دوسرے اساتذۂ سخن یہاں جمع تھے - مولانا شبلی نعمانی جب علی گڑھ کی معلمی سے سبکدوش ہوئے تو حیدرآباد میں اُن کا تقرر بحیثیت ناظم سررشتۂ علوم و فنون ہو گیا - ۱۹۰۵ع تک وہ یہاں رہے - اس دور میں شبلی کی اہم تصانیف الکلام ، علم الکلام ، الغزالی ، سوانح مولانا روم ، موازنۂ انیس و دبیر وغیرہ منظر عام پر آئیں - ظفر علی خاں نے ان کی تصنیف "الفاروق" کا انگریزی میں ترجمہ بھی اسی زمانے میں کیا - مولانا حالی کو بھی دربار حیدرآباد سے تصنیفی کاموں کے سلسلے میں وظیفہ ملتا تھا اور وہ اکثر حیدرآباد کی ادبی محفلوں کو رونق بخشتے تھے - اس علمی ماحول اور ادبی فضا میں ظفر علی خاں کے ذوق ادبی کو بڑی جلا ملی - ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ "پنجاب ریویو" میں لکھتے ہیں :

"ہندوستان کا وہ اسلامی تمدن جس کے بھرے میلے مغربی تہذیب کی آمد آمد کے ساتھ بچھڑنے لگے تھے ، اگرچہ اب آفتاب لب بام ہے لیکن اس آفتاب کی زرد اور بیمار شعاعوں میں بھی ہمیں کریمانہ اخلاق اور فلسفیانہ تبحر کی ایسی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں ، جن سے دہلی و بغداد اور بخارا و اندلس کی یاد تازہ ہو ہوگئی ہے - ہم لوگوں کے لیے جن کی نگاہیں نئی روشنی کی خوگر ہو چلی ہیں اس سے زیادہ فخر ، اس سے زیادہ

نازش کا مقام کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نے سید احمد جیسے مجدد وقت کا زمانہ دیکھا ہے، محسن الملک کی جادو بیانیوں کے موتی جیب و داماں میں بھرے ہیں، داغ جیسے قادر الکلام شاعر کے فیض صحبت سے استفادہ کیا ہے، شبلی جیسے "وحید العصر و یکتائے زمن" کے خرمن فیوض سے خوشہ چینی کر رہے ہیں اور حالی کی عدیم النظیر سخنوری و سخن سنجی سے مذاق سلیم کو بہرہ اندوز بنا رہے ہیں"۔[1]

ظفر علی خاں، جنہیں مبدء فیاض سے شاعرانہ صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں، علی گڑھ اور حیدر آباد کے اس ادبی ماحول میں نشوونما پا کر اپنی علمی، ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں سے اہل علم کو متأثر کرنے لگے۔ زبان کی صفائی، محاورات کی برجستگی، تراکیب کی چستی اور عبارات کی بندش میں وہ اہل زبان سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ اُن کو اپنی زباں دانی اور مرصع بیانی پر بجا طور پر ناز بھی تھا:

میں نے ادب کی بزم کو رخشندہ کر دیا
دہلی و لکھنئو کا ہے میری زباں میں لوچ

ہے لکھنئو کو بھی آج اتفاق دہلی سے
مرے کلام مرصع کی لاجوابی پر

---

(۱) پنجاب ریویو، جلد ۱ نمبر ۲، صفحہ ۳۷۔

ظفر علی خاں حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے۔ اساتذہ کا کلام سنتے، اپنا کلام سناتے۔ لارڈ کرزن کی تصنیف 'Persia and Persian Question' کا ترجمہ ''خیابان فارس'' کے عنوان سے کیا تو اس کے بعض حصے نواب مرزا داغ دہلوی کو پڑھ کر سنائے۔ انھوں نے بعض جگہ اصلاح بھی دی اور ظفر علی خاں کے اسلوب نگارش کی تعریف بھی کی۔ شاید اس بنا پر مولوی احسن مارہروی شاگرد داغ دہلوی نے ظفر علی خاں کو بھی داغ کا شاگرد قرار دیا ھے۔ اقبال اور ظفر علی خاں کی شاگردی کا مسئلہ بحث طلب ھے۔ ظفر علی خاں نے ایک اخباری انٹرویو میں اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہا ھے کہ ''علامہ اقبال کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور میرا خیال ھے کہ وہ شاگرد نہیں تھے۔ ممکن ھے ایک آدھ غزل پر رسماً اصلاح لی ھو۔ لیکن جہاں تک استاد شاگرد کے حقیقی مفہوم کا تعلق ھے، وہ داغ کے شاگرد نہ تھے۔ رھا میرا معاملہ، تو میں نے داغ سے کبھی اصلاح نہیں لی۔ وہ حیدرآباد میں ملک‌الشعراء تھے اور میر محبوب علی خاں کے استاد۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بے حد وسیع تھا، مگر میں ان میں نہ تھا۔ اور یوں بھی شاعری میں میرا کوئی اُستاد نہیں۔ داغ مرحوم کی عادت تھی کہ جو شخص بھی اُن کے پاس بیٹھا، اُس نے شاعری کے ایک آدھ نکتے پر بات چیت کی یا

ایک آدھ غزل سنا کر مشورہ طلب کیا ، تو وہ اس کو اپنے شاگردوں کی فہرست میں شامل کر لیتے اور پھر شاگردی کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے تھے ۔ ادھر میں نوجوان تھا (مولانا نے عمر رفتہ کا تصور باندھ کر فرمایا) ۔ حیدرآباد کا ماحول تھا ۔ داغ کے ہاں اکثر شعر و سخن کی محفلیں جمتیں ۔ میں بھی شریک ہوتا ۔ ممکن ہے میرے قلم کے تیور دیکھ کر انہوں نے مجھے بھی ، جیسا کہ ان کے بعض شاگردوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے ، اپنے شاگردوں میں شامل کر لیا ہو ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے لارڈ کرزن کی کتاب خیابان فارس کا اردو میں ترجمہ کیا تو انہیں بھی سنایا ، اور شاید انہوں نے ایک آدھ جگہ زبان کے معاملے میں مشورہ بھی دیا ، مگر یقینی نہیں ۔ اس سے انہوں نے یا اُن کے بعض تلامذہ نے مجھے بھی شاگرد سمجھا ۔ اس سے قیاس پڑتا ہے کہ اقبال کا معاملہ بھی شاید ایسا ہی تھا ۔ داغ کی شہرت کا عہد تھا ۔ اقبال نے بقول شیخ عبدالقادر ایک آدھ غزل بھیج دی ہوگی اور انہوں نے اصلاح کر کے فہرست میں نام لکھ لیا ہوگا ۔ میرے اور اقبال کے شاگرد ہونے کی غلط فہمی اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم دونوں نے داغ کے مرثیے لکھے ہیں ۔ ہم نے جو کچھ لکھا وہ ان کی سخنوری کو خراج تھا ۔ مگر لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم ان کے شاگرد ہیں ۔ خیر اس سے کیا ہوتا ہے کہ ہم داغ کے شاگرد تھے یا

نہیں - داغ ' اقبال اور میرے حدود شعر ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ہم نے جو کچھ کہا وہ شعریت کی یکسانیت کے باوجود بلحاظ اسلوب (غالباً موضوع ؟) مختلف المعنی ہے۔''[1]

حیدرآباد کی ادبی محفلوں کے بعض دلچسپ کوائف ظفر علی خاں نے بعد میں سنائے ہیں - ایک دلچسپ واقعہ وہ ''ستارۂ صبح'' میں پیش کرتے ہیں - عنوان ہے ''دریائے لطافت کی دو موجیں'' :

''زمانہ قیام حیدر آباد دکن، میں ہمیں دھلی کے ایک بزرگ ''میرن صاحب'' سے ملنے کا اتفاق ہوا - آپ مرزا غالب کے رفقائے خاص میں سے ہیں اور اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہیں جو ہندوستان کے خاتم الشعراء کی رنگینیٔ افکار سے بہارستان بنا ہوا تھا - میرن صاحب کو میرزا نوشہ کے ساتھ بے انتہا عقیدت ہے اور یہ عقیدت عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے - ایک دن حلقۂ احباب میں میرزا کی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی - میرزا کی مشہور غزل ہے :

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

اس کے دو اشعار جن میں سے ہر ایک بیت الغزل ہے' یہ ہیں :

---

(۱) ایک انٹرویو — ''زمیندار'' بابت ۱۸ اپریل ۱۹۵۰ع -

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ہر ایک نے ان اشعار کو سنا اور سر دھنا۔ باتوں باتوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ جب تک کوئی شخص ذوق مے خواری سے آشنا نہ ہو، اس قسم کے شعر نہیں کہہ سکتا۔ ایک صاحب نے جو اردو زبان کے ایک بہت بڑے نقاد ہیں، کہا کہ "غالب تو شراب کے رسیا تھے۔ پھر اُن سے بہتر اس مضمون کو اور کون ادا کر سکتا تھا۔" میرن صاحب نے جو یہ بات سنی تو آگ بگولا ہو گئے اور نہایت برافروختگی کے لہجہ میں کہا کہ "آپ لوگ اس حقیقت کو کیا سمجھیں۔ غالب اور شراب خوار! معاذ اللہ!!" ہم لوگوں نے میرن صاحب قبلہ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے دبی زبان سے عرض کی کہ "حضت، پھر وہ پیتے کیا تھے؟" میرن صاحب نے فرمایا کہ "میرزائے مرحوم کی صبوحی تو ایک آسمانی زلال ہوتی تھی جس میں گلاب کا ریحانی عصارہ ملا ہوتا تھا۔ آپ دنیا والے کیا جانیں کہ وہ کیا چیز تھی!"[1]

---

(۱) "ستارۂ صبح" بابت ۸ دسمبر ۱۹۱۶ع، صفحہ ۲۲۔

ظفر علی خاں حیدر آباد ہی میں تھے جب دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں ہوا، اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اور دوسرے مسلمان رہنماؤں نے سلیم اللہ ہال میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا۔ مولوی عزیز مرزا، ظفر علی خاں اور ان کے نوجوان رفقاء اس اجتماع میں موجود تھے اور ڈھاکہ سے واپسی پر ان کی سیاسی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہونے لگا۔ انہی دنوں ایک برطانوی رقص پارٹی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہوئی حیدر آباد پہنچی۔ سرکاری طور پر رقص کا انتظام کیا گیا اور رقص کے اختتام پر ظفر علی خاں کے ذمے شکریے کا فرض کیا گیا۔ ظفر علی خاں نے اس موقعے پر شکریہ ادا کرنے کی بجائے مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ شروع کر دیا، اور مغربی تہذیب کو حیا سوز اور اخلاق باختہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ "میرا ضمیر اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسے حیا سوز مظاہروں کا شکریہ ادا کروں۔" اس واقعے نے ریاست کے انگریز افسروں کو آتش زیر پا کر دیا۔ سر مائیکل اوڈوایر ان دنوں ریاست حیدرآباد میں ریزیڈنٹ تھے۔ انھیں یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ خواجہ حسن نظامی الگ اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں مولوی عزیز مرزا، ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر اور صفی الدین کو حکومت کے

خلاف سازش کرنے کے الزام میں چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر ریاست بدر کر دیا گیا - تاہم حسن خدمات کے عوض ظفر علی خاں کو ریاست سے ۱۲۵ روپے ماہوار وظیفہ ملتا رہا -

ریاست حیدر آباد سے نکلنے کے بعد ظفر علی خاں اپنے آبائی گاؤں کرم آباد (متصل وزیر آباد) چلے آئے - اُن کے والد مولوی سراج الدین احمد قریب المرگ تھے - انھوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ ظفر علی خاں "زمیندار" کو زندہ رکھیں گے - یہ ہفتہ وار پرچہ مولوی سراج الدین احمد نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور سے جاری کیا تھا اور بعد میں کرم آباد سے نکلتا رہا - یہ پرچہ زمینداروں کی معاشرتی و معاشی بہبود کے لیے جاری کیا گیا تھا - ۶ دسمبر ۱۹۰۹ع کو مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہوا - ظفر علی خاں نے والد مرحوم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے زمیندار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا - ریاست بدر ہونے کے بعد اُن کا خیال تھا کہ لاہور سے ایک انگریزی جریدہ نکالیں گے - لیکن اب نئی ذمے داریوں نے اس خیال کا رخ بدل دیا - "زمیندار" کی ترتیب کی ابتدا میں یہ صورت رہی کہ ظفر علی خاں دو تین گھنٹے بیٹھ کر اتنا مضمون لکھ دیتے کہ کاتب سارا دن مصروف رہتا، اور خود شکار کھیلنے کے لیے نکل جاتے - اس طرح سیر و شکار کا دلپسند مشغلہ بھی جاری رہتا اور زمیندار بھی وقت پر نکل آتا - لیکن ظفر علی خاں کے بلند تخیلات ایک

ہفتہ وار معاشرتی اخبار کی محدود فضا میں نہیں سما سکتے تھے۔ چنانچہ اپنے بلند حوصلوں کی جولانی کے لیے اُنھوں نے ایک دوسری صورت یہ پیدا کی کہ کرم آباد ہی سے اگست ۱۹۱۰ع میں ماہنامہ ''پنجاب ریویو'' جاری کر دیا جو ''دکن ریویو'' کا نقش ثانی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ میدان بھی کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ بہر کیف یہ سلسلہ بھی تقریباً سوا سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں ظفر علی خاں نے مختلف مقامات پر اُردو زبان و ادب کے مسائل اور مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی احوال پر تقریریں کیں۔ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے علمی حلقوں میں تو وہ پہلے ہی خاصے متعارف ہو چکے تھے، اب عوامی حلقوں میں بھی اُن کی شہرت ہونے لگی۔ اسی دوران میں لاہور کے بعض احباب [چودھری (سر) شہاب الدین] نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کرم آباد سے لاہور آ جائیں اور اس تہذیبی مرکز میں بیٹھ کر اپنے مستقبل کو درخشاں بنائیں۔ ظفر علی خاں نے یہ صائب رائے فوراً مان لی اور کرم آباد سے لاہور چلے آئے۔ مئی ۱۹۱۱ع سے ہفتہ وار ''زمیندار'' اور ماہوار ''پنجاب ریویو'' دونوں لاہور سے شائع ہونے لگے۔ ''زمیندار'' میں کاشتکاروں کے بجائے رفتہ رفتہ اسلامی رنگ جھلکنے لگا، اور مقامی اور بین الاسلامی سیاسی مسائل کا اظہار ہونے لگا۔ اہل لاہور نے اس انداز کے پرچے کو بہت پسند کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ''زمیندار'' کی

اشاعت دو ہزار تک جا پہنچی - چند ماہ تک ''پنجاب ریویو'' بھی باقاعدگی سے نکلتا رہا - پنجاب ریویو اور مخزن اس دور میں اردو زبان کے اعلیٰ پائے کے ماہوار علمی و ادبی رسائل تھے - بقول حکیم احمد شجاع : ''شیخ عبدالقادر اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے کسی مضمون کا انتخاب اور مخزن اور پنجاب ریویو میں کسی مضمون نگار کی تصنیف کی اشاعت اس زمانے میں فضل و کمال کی ایسی معراج تھی جو کسی کسی کو نصیب ہوتی تھی -''[۱]

ظفر علی خاں کی جوانی علی گڑھ اور حیدرآباد کے ماحول میں گزری تھی - لاہور کی فضا اپنی ساری رونقوں اور گہما گہمیوں کے باوجود اُن کے لیے نئی تھی - لاہور سے اُن کے ادبی روابط کا سلسلہ اگرچہ بہت پہلے حیدرآباد ھی سے شروع ہو چکا تھا - تاہم یہاں پہنچ کر اُنہیں احباب کا ایک حلقہ بنانا پڑا - علّامہ اقبال، شیخ عبدالقادر، چودھری شہاب الدین اس زمانے میں لاہور کی ثقافتی فضا کی روح رواں تھے - ان حضرات سے ظفر علی خاں کے دوستانہ مراسم بہت جلد قائم ہوگئے - ان باکمال ھستیوں کے اجتماع سے دھلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے علاوہ لاھور بھی اردو ادبیات کا ایک بہت بڑا گہوارہ بن گیا - ان ھستیوں کا باہم مل بیٹھنا ھی ادبیات اردو کی حیات نو کا پیش خیمہ تھا - صبح و شام ملاقاتیں ہوتیں - بہت سے معاشرتی

---

(۱) احمد شجاع، حکیم، خوں بہا، صفحہ ۲۰۸ -

مسائل زیر بحث آتے اور انہی مباحث کا ماحصل شعر و ادب کا جامہ پہن کر لوگوں کے سامنے آ جاتا ۔ مثلاً ۱۰ جولائی ۱۹۱۲ع کی ایک صحبت میں ''چند حسرت آفرین حقیقتیں'' گفتگو کا موضوع تھیں ۔ ظفر علی خاں نے اس پر ارتجالاً ایک طویل قطعہ کہہ ڈالا ، جس کے چند اشعار یہ ھیں :

جب سے ہم میں ''آنریبل'' اور ''سر'' پیدا ہوئے
سوئے فتنے جاگ اٹھے اور شر پیدا ھوئے
طاق نسیاں پر اسے اسلامیوں نے رکھ دیا
جس غرض سے حضرت خیرالبشرؐ پیدا ھوئے
انتخاب ھفت کشور خطۂ پنجاب ھے
اس میں کیا کیا نکتہ سنج اور نکتہ ور پیدا ھوئے
حاسدان تیرہ باطن کے جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب! اقبال اور ظفر پیدا ھوئے

لاھور میں علم و ادب اور سیاست و معاشرت کے بارے میں یہ مباحث اور ان کی ادبی باز آفرینی کا یہ معتدل سلسلہ جاری تھا کہ اسی زمانے میں اطالیہ نے طرابلس پر یورش کر دی ۔ ظفر علی خاں نے ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ع سے ''زمیندار'' کا روزانہ ایڈیشن بھی جاری کر دیا ۔ روزنامہ ''زمیندار'' میں جنگ کی خبریں اور بلاد اسلامیہ کے بارے میں معلومات افروز مضامین ایسے دلچسپ پیرائے میں چھپنے شروع ھوئے کہ اخبار کی مانگ روز بروز بڑھنے لگی ۔ ''زمیندار'' کے مضامین ،

منظومات اور تقریروں سے (جو ان ایام میں اکثر ہوتی تھیں) ملک بھر میں ظفر علی خاں کی آتش بیانی کی دھوم مچ گئی۔ اُنہوں نے اپنے زور بیان سے ہنگامی حالات پر جذبات انگیز تحریریں لکھ کر نہ صرف اخبار کی اشاعت ہی کو بڑھایا بلکہ طرابلس کے مظلوموں کے لیے بھی ستمبر ۱۹۱۲ع تک یعنی ایک سال کے عرصے میں لاکھوں روپے چندہ جمع کرکے ترکی بھجوایا۔ طرابلس کی آتش جنگ کے شعلے ابھی بھڑک رہے تھے کہ دول فرنگ کے خفیہ منصوبوں کے مطابق ریاستہائے بلقان نے متحد ہو کر یورپی ترکی پر حملہ بول دیا اور یلغار کر کے ادرنہ (ایڈریانوپل) پر قبضہ کر لیا۔ دارالخلافت استنبول خطرے میں پڑ گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ گزر گئی۔ اقبال نے "شکوہ" لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ شبلی کے خامۂ خونچکاں نے "شہر آشوب اسلام" لکھ کر بے بس مسلمانوں کے پُر درد جذبات کی ترجمانی کی:

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

ظفر علی خاں کی آتش نوائی نے اس موقعے پر ملک میں چاروں طرف ایک آگ سی لگا دی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر علی خاں کی تحریر اور تقریر کا آفتاب عین نصف النہار پر پہنچ چکا تھا!

لیکن یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ اس ہیجان انگیز زمانے میں روز نامہ ''زمیندار'' کی پیشانی پر اس شعر کے ساتھ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

تاج کی تصویر اور نظام حیدر آباد میر محبوب علی خاں کا یہ شعر درج ہوتا تھا:

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

دراصل اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات بیرونی اسلامی ممالک کے مصائب و آلام سے شدید طور پر متأثر تو ضرور تھے لیکن اپنے ملک میں برطانیہ کے پھندے سے گلو خلاصی کا احساس ابھی گہری نیند سو رہا تھا۔ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ سے جو صدمہ مسلمان رہنماؤں کو پہنچا تھا، اس سے خوابیدہ احساس نے ایک کروٹ تو ضرور لی، لیکن حکومت سے وفاداری کا تصور قائم رہا۔ ظفر علی خاں کا وہ سپاس نامہ بھی اسی تصور کا آئینہ دار تھا، جو انہوں نے استنبول میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد خامس کی خدمت میں پیش کیا تھا:

''ہندوستان میں ہمارے دو بادشاہ ہیں۔ ایک جارج خامس، دوسرے محمد خامس۔ جارج خامس ہماری جان کے مالک ہیں لیکن محمد خامس کا قبضہ دلوں پر ہے۔ اور ہماری دلی تمنا ہے کہ ان دونوں تاجداروں کے

تعلقات برادرانہ رہیں، تاکہ ہماری جان حزیں ہمارے دل ناشاد سے الجھنے نہ پائے۔"[1]

۱۹۱۲ع میں مسلمانان ہند کا سیاسی زاویۂ نگاہ یہی تھا:

عشق لندن دل میں سودا سر میں استنبول کا
ہم مسلمانوں کی ہستی کا یہ اصلی راز ہے

طرابلس و بلقان کی جنگ کے دوران ظفر علی خاں کی تحریر اور تقریر سے عام لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہو رہے تھے اور حکومت اس صورت حال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران میں (۱۹۱۲ع) ظفر علی خاں کے "حیدرآبادی کرم فرما" سر مائیکل اوڈوائر پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بن کر آ گئے۔ اوڈوائر کی پنجاب میں آمد ظفر علی خاں اور "زمیندار" دونوں کے لیے خطرے کا الارم تھی۔ لیکن قبل اس سے کہ اوڈوائر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے، ظفر علی خاں دسمبر ۱۹۱۲ع کے اواخر میں خاموشی سے انگلستان روانہ ہو گئے۔ انگلستان پہنچ کر انہوں نے پریس ایکٹ کی قباحتوں کے خلاف انگریزی زبان میں سو صفحے کا ایک کتابچہ شائع کیا جس میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پریس ایکٹ کی جمہوریت کشی اور آزادیٔ تحریر کے مسئلے پر بحث کی گئی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین کے سامنے بھی انہوں نے انڈین پریس ایکٹ کی مضرتوں اور

---

(۱) بحوالہ "زمیندار" گولڈن جوبلی نمبر، صفحہ ۳۷۔

اس ایکٹ کے اندھا دھند استعمال پر بڑی مدلل تقریر کی جسے لبرل اخبارات نے بڑا پسند کیا ۔ ظفر علی خاں کی یہ انگریزی تقریریں بھی اہل زبان سے خراج تحسین وصول کیے بغیر نہ رہ سکیں ۔ خواجہ کمال الدین نے اس سلسلے میں اپنے تأثرات ایک مضمون میں بیان کیے ہیں :

”ایک روز کا ذکر ہے کہ میں ووکنگ مسجد سے بیس میل کے فاصلے پر آیا ہوا تھا ۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں بیگم بھوپال نے شاہجہان مسجد کے نام سے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی ۔ میں نے دیکھا کہ گرجا کی سڑک کے حاشیے پر مولانا ظفر علی خاں کے حلیے کا ایک شخص تیز تیز قدم اُٹھائے چلا جا رہا ہے ۔ سر پر ترکی ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی ۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور کچھ دور جا کر پوری گھن گرج کے ساتھ آواز دی ۔ مولانا نے برقی سرعت کے ساتھ اپنے سر کو عقبی جنبش دی اور مجھ پر ایک نظر ڈالی ۔ بس پھر کیا تھا ۔ مولانا جھپٹے اور قریب پہنچ کر مجھے اپنے بازوؤں کی آہنی گرفت میں لے لیا اور بولے :

”کمال الدین تو یہاں کیسے ؟“

”پہلے آپ بتلائیے کہ آپ کیسے یہاں وارد ہوئے“ میں نے دریافت کیا ۔

”بھئی ! کیا پوچھتے ہو ۔ اس انگریز نے تو ہندوستان

میں آفت مچا رکھی ہے ۔ یہ حرامی رہی سہی تہذیب اور بچے کھچے تمدن کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے ۔ میں یہاں اس کا ٹینٹوا دبانے آیا ہوں ۔" مولانا نے جواب دیا ۔

"مولانا ! یہ لندن ہے ۔ آپ تو اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے حروب صلیبی کے مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی آپ ہی ہیں ۔ مولانا یہاں زبان پر قابو رکھیے ' ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے" میں نے کہا ۔

"کمال الدین ! تو اتنے تن و توش کا آدمی ہے ' پھر ایسی بزدلی اور کم ہمتی کی باتیں کر رہا ہے ۔ میں سمجھا ' تو ان ٹامیوں کو میٹھے سروں میں نغمۂ توحید سنانے آیا ہے ۔ کمال الدین ' یہ بندر تیری ڈگڈگی پر ناچنے سے رہے ۔ انہیں تو میں تگنی کا ناچ نچانا چاہتا ہوں ۔" مولانا ظفر علی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ۔ پھر مولانا نے کسی قدر توقف کے بعد کہا ۔ "چلو خواجہ میرے ساتھ ۔ مجھے ایک دو جگہ تقریریں کرنی ہیں ۔"

میں نے حیرت سے پوچھا ۔ "مولانا ! لندن میں تقریر کس زبان میں کریں گے ؟ اُردو میں یا انگریزی میں !" میں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ میں نے مولانا کی تقریریں اُردو میں تو سنی تھیں لیکن کبھی انگریزی زبان میں آپ کی تقریر نہیں سنی تھی ۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ "ارے ! چل تو سہی ۔ جس زبان میں تقریر کروں گا ' تو بھی سن لے گا ۔"

یہ کہا اور مولانا چل کھڑے ہوئے۔ مشکل سے ہم ایک فرلانگ ہی چلے ہوں گے کہ مولانا ایک ہال میں مجھے ساتھ لیے ہوئے داخل ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ میں نے ایک گوشے میں پناہ لی اور مولانا ڈائس پر پہنچ گئے اور بغیر کسی توقف کے انگریزی میں تقریر شروع کر دی ۔ اس زناٹے کی تقریر کی کہ لطف آگیا ۔ جچے تلے الفاظ ، مرصع جملے ، لب و لہجہ کے زیر و بم کے ساتھ اس خوش اسلوبی سے خطابت کے سانچے میں ڈھالے کہ میں نے دیکھا کہ اُن کے ہر جملے پر سامعین جھوم جھوم گئے ۔ تقریر کا موضوع تھا پریس ایکٹ اور اس کے نقائص ۔ پون گھنٹے کی تقریر کے بعد مولانا ڈائس سے اُترے اور مجھے ہمراہ لیے پھر سڑک پر آگئے۔ ہم دس بیس قدم چلے ہوں گے کہ مولانا بولے :

''کمال الدین ! بتلا کیسی تقریر تھی؟ تجھے میری انگریزی میں کوئی کلام تھا ۔''

میں نے جواب دیا ۔ ''اُردو خطابت کا تو میں پہلے ہی قائل تھا لیکن آج آپ کی انگریزی تقریر نے بھی دل پر سکہ جما دیا ہے ۔ مولانا ایک تقریر ووکنگ میں بھی ہو جائے۔ کیا خیال ہے ۔''

مولانا نے جواب دیا ۔ ''مجھے استنبول جانا ہے ۔ اگر ایک دن اور ٹھہرنا ہوا تو ووکنگ میں بھی تقریر ہوجائے گی ۔''[۱]

---

(۱) بحوالہ اشرف عطا ، مولانا ظفر علی خان ، صفحہ ۵۰ — ۵۲ ۔

انگلستان میں ظفر علی خاں نے خواجہ کمال الدین کو ماہوار انگریزی جریدہ ''مسلم انڈیا اینڈ اسلامک ریویو'' کے اجراء کے سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ ''زمیندار'' میں چھپنے کے لیے بھی وہ وقتاً فوقتاً مضامین ارسال کرتے رہے۔ ایک مضمون، جس کا عنوان تھا:

چہار چیز است تحفۂ لندن   خمر، خنزیر، روزنامہ و زن

جب زمیندار میں شائع ہوا، تو حکومت نے زمیندار کی دس ہزار روپے کی ضمانت اور مطبع دونوں ضبط کر لیے۔ سر مائیکل اوڈوائر کو یقین تھا کہ اس گراں قدر ضمانت اور قیمتی مطبع کی ضبطی کے بعد ''زمیندار'' کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی، لیکن اس کا یہ گمان باطل ثابت ہوا۔ ''زمیندار'' اس وقت تنہا ظفر علی خاں کا نہیں، بلکہ جمہور کا اخبار بن چکا تھا، اور انھوں نے یہ گراں قدر رقم جمع کر کے چند روز میں ''زمیندار'' کو دوبارہ زندہ کر دیا جس پر اوڈوائر بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔[1]

ظفر علی خاں ابھی سفر ہی میں تھے کہ کانپور کی مچھلی بازار مسجد کا حادثہ (اگست ۱۹۱۳ع) پیش آیا۔ اس کے فوراً بعد ہی زمیندار کی ضبطیٔ ضمانت کا مذکورہ بالا واقعہ پیش آیا۔ گویا سانحات کا ایک سلسلہ تھا جو یکے بعد دیگرے ظہور میں آ رہا تھا۔ لیکن ہندوستانی مسلمان اب باعزت طور پر زندہ رہنے

---

(۱) O' Dwyer, Sir Michael, *India as I knew It.* P. 173.

کا عزم کر چکے تھے اور ہر نیا تازیانہ اُن کے اس عزم میں پختگی پیدا کر رہا تھا ۔ ظفر علی خاں انگلستان سے روانہ ہو کر استنبول پہنچے اور قصر خلافت میں سلطان محمد خامس نے انہیں شرف باریابی بخشا ۔ ظفر علی خاں نے فارسی میں ایک دلآویز قصیدہ پیش کیا ۔ خلیفۃ المسلمین نے انہیں ہندوستانی مسلمانوں کے نام خوشنودی کا پیغام دیا ۔ جب ظفر علی خاں ستمبر ۱۹۱۳ع میں واپس وطن پہنچے تو جمہور نے اُن کا پرجوش استقبال کیا اور دہلی و لاہور میں اُن کی آمد پر عظیم الشان جلوس نکالے ۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی سطح پر ظفر علی خاں ایک بطل جلیل بن چکے تھے ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ظفر علی خاں کی ملکی و ملی خدمات سے متأثر ہو کر ایک پر تاثیر نظم لکھی جس میں انہیں خراج تحسین پیش کیا ۔ جب ظفر علی خاں استنبول سے بمبئی پہنچے اور لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا حالی نے انہیں یہ نظم سنانے کے لیے پانی پت آنے کی دعوت دی ۔ لیکن ظفر علی خاں پروگرام کے مطابق دہلی سے براستہ بٹھنڈا لاہور پہنچ گئے ۔ مولانا حالی نے یہ نظم لاہور بھیج دی جو ''زمیندار'' میں چھپی اور بعد میں ظفر علی خاں کے مجموعہ کلام ''بہارستان'' کے شروع میں درج کی گئی ۔ اس نظم کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

اے مالک دفتر زمیندار   اے نازش قوم و فخر اقران
اے روح رواں جمع احباب   اے چشم و چراغ بزم اخوان
اے دین کے امتحاں میں جانباز   اے نصرت حق میں تیغ عریاں

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر — اے شیر دل، اے ظفر علی خاں!
ڈالا یہ تری پکار نے غل — جی اٹھے وہ مردے جو تھے بیجان
جو دل غم قوم سے تھے بے حس — چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
پنجاب کو تجھ پہ ہوا اگر فخر — ہے اس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ ملک اور ملت — ہوں زندہ دل ایسے جس میں انسان

"یہ اُس جلیل القدر شاعر اور رقیق القلب، درد مند قوم کا خراج تحسین ھے جس پر ظفر علی خاں اور علی گڑھ دونوں کو بجا طور پر ناز ھو سکتا ھے۔"[۱]

انگلستان اور ترکی کے سفر سے واپس آنے کے بعد ظفر علی خاں کا قلم شعلۂ جوالا بن گیا۔ اتحاد اسلامی پر اُن کے پر زور مضامین سے قصر استعمار کے در و دیوار لرزنے لگے۔ سر مائیکل اوڈوائر اس زمانے کے اپنے تأثرات لکھتے ھوئے کہتے ھیں:

"اخبار 'زمیندار' پان اسلام ازم پر اعتقاد رکھنے والے طبقے کا آتش بار ترجمان تھا۔ اس اخبار کا ایڈیٹر آتش مزاج (Fire Brand) رسوائے عالم (Notorius) ظفر علی خاں تھا۔ اُس نے ۱۹۱۲ع میں ھلال احمر ترکی کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر یہ رقم وزیراعظم ترکی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے خود قسطنطنیہ گیا۔ ترکی سے واپسی کے بعد اُس کا انداز بیان پہلے سے زیادہ شوخ اور تند و تیز ھو گیا۔ اسے متعدد بار منع کیا گیا۔ بالآخر میں پریس ایکٹ

---

(۱) علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر) بابت ۵۵ — ۱۹۵۴ع، صفحہ ۶۱۔

کے ماتحت اس کی ضمانت ضبط کرنے پر مجبور ہوگیا ۔ مزید ضمانت طلب کی گئی جو داخل کر دی گئی اور ''زمیندار'' پھر نکلا ۔ اب کے اس کا انداز تحریر پہلے سے بھی زیادہ معاندانہ اور باغیانہ تھا ۔ وہ جمہور کو برطانوی حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت پر ابھارتا رہا ۔ ظفر علی خاں نے برطانوی حکومت اور وزیراعظم ایسکوئتھ کے خلاف انتہائی آتشیں مضامین لکھے ۔ اب کے مجھے پہلے سے بھی زیادہ شدید قدم اٹھانا پڑا ۔ نہ صرف اس کی ضمانت ضبط کر لی گئی بلکہ مطبع کی ضبطی کے احکام بھی جاری کرنے پڑے ۔ عدالت عالیہ نے اس حکم کو بحال رکھا اور ''زمیندار'' کا مطبع ضبط کر لیا گیا ۔''[۱]

۱۹۱۳ء میں ترکی کونسل جنرل لاھور آیا اور خلیفة المسلمین کی طرف سے ایک خوبصورت قالین بادشاھی مسجد کے لیے بطور تحفہ لایا ۔ چند ھفتے بعد انجمن ھلال احمر کے دو ڈاکٹر بھی مسلمانان ھند کا شکریہ ادا کرنے لاھور آئے ۔ لاھور میں اسلامی اخوت اور محبت کا یہ مظاھرہ سرمائیکل اوڈوائر کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا اور وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ ھندوستان کے پرجوش مسلمان ترکی کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کوئی سازش کا منصوبہ

---

(۱) O' Dwyer, Sir Michael, *India as I knew it*. P. 172.

تیار کر رہے ہیں - پیہم ضمانت طلبیوں اور ضمانت ضبطیوں کے
باوجود ''زمیندار'' آسمان صحافت پر چمکتا رہا اور برطانوی
حکومت کے لیے وجہ پریشانی بنا رہا - اگست ۱۹۱۴ع میں
پہلی جنگ عظیم کا آتشیں لاوا پھوٹ پڑا اور نومبر ۱۹۱۴ع
میں سلطنت ترکی بھی اس کی لپیٹ میں آگئی - ہندوستان میں
''ڈیفنس آف انڈیا رولز'' نافذ کر دئیے گئے - ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ع
کو حکومت پنجاب کے حکم سے ظفر علی خاں کو کرم آباد
میں نظر بند کر دیا گیا - ''زمیندار'' جون ۱۹۱۵ع تک
نکلتا رہا جس پر پہلے ظفر علی خاں کا نام ایڈیٹر کی بجائے
بطور مالک چھپتا رہا ' پھر ۱۹۱۵ع سے بیگم صاحبہ مولوی
ظفر علی خاں کا نام درج ہوتا رہا -

جنگ کے زمانے میں ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند
رہے - اُن کی پرخروش جذباتی طبیعت اور سیمابی فطرت کے لیے
یہ نظر بندی سخت عقوبت کی بات تھی - زبان پر بھی پابندی
تھی اور قلم پر بھی - بلند حوصلوں کی جولانی کے لیے سب
میدان تنگ تھے - اسی دوران میں انہیں ایک باولے کتے نے
کاٹا - گورنر کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا - وہاں سے فی الفور
اجازت مل گئی اور انہیں علاج کے لیے کسولی (شملہ) پہنچا دیا
گیا (پنجاب میں اُس زمانے میں باولے کتے کے کاٹے کا علاج وہیں
ہوتا تھا) - اس کے بعد نظر بندی کی پابندیاں بھی کسی قدر
نرم کر دی گئیں - نظر بندی کے دوران میں ظفر علی خاں نے

علمی و ادبی مشاغل جاری رکھنے کے لیے ایک دائرۃ المعارف بنانے کا منصوبہ بنایا اور حکومت سے اس امر کی اجازت چاہی - یہ درخواست رد کر دی گئی - لیکن ظفر علی خاں نے اپنی کوشش برابر جاری رکھی - حتیٰ کہ حکومت نے انہیں ۱۹۱۶ع کے اواخر میں ہفتہ وار ''ستارۂ صبح'' جاری کرنے اور ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کی اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ اس میں سیاسی مسائل زیر بحث نہیں لائیں گے - ظفر علی خاں نے اس کو بھی غنیمت سمجھا ' اور علم و ادب کے میدان میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانے لگے - ''ستارۂ صبح'' کی اشاعت یکم جنوری ۱۹۱۷ع میں لکھتے ہیں :

بنا ہی دائرہ ہم نے لیا معارف کا
محال ہے کہ ہمارا کوئی ادارہ نہ ہو

حیدرآبادی دور کے بعد کرم آباد کی نظر بندی کے دوران جبری فرصت کے یہ لمحات ظفر علی خاں کی ادبی ' علمی خدمات کے سلسلے میں بہت اہم تھے - قدرت نے ظفر علی خاں کو جو تخلیقی صلاحیتیں عطا کی تھیں ' وہ سیاست کے خار زار میں قدم رکھنے سے ہنگاموں کی نذر ہو رہی تھیں - ادبی نقطۂ نظر سے اُن کی یہ نظر بندی مفید ہی ثابت ہوئی - اُن کو خود بھی اس امر کا احساس تھا - چنانچہ ایک قطعے میں ''سرمائیکل اوڈوائر کے اس احسان'' کا ذکر یوں کرتے ہیں:

کرم آباد کو سر سائیکل نے بنایا ہے مری علمی حوالات
اگر اس وقت میں آزاد ہوتا دکھا سکتا نہ شاید یہ کمالات
نہ ہوتی ترجمے کی مجھ کو فرصت کتابوں میں نہ کٹتے میرے دن رات
نہ ھوتا نعت ہی کا سر میں سودا نہ دل ہی سے نکل سکتی مناجات
پرو سکتا نہ موتی روز ایسے چمک سے جن کی ہیں شمس و قمر مات
گنواتا شاید اپنے وقت کو میں دلاتی شرم مجھ کو میری اوقات

''ستارۂ صبح'' کچھ عرصے تک کرم آباد سے نکلتا رہا ، پھر لاھور آ گیا اور ھفتہ وار سے روزنامہ ھو گیا ۔ سیاسی مباحث ان دنوں ظفر علی خاں کے لیے شجر ممنوعہ تھے ۔ علمی ادبی ، تاریخی ، اخلاقی اور مذھبی موضوعات کا میدان اُن کے لیے کھلا تھا ۔ شروع شروع میں وہ بڑے صبر و تحمل سے ان موضوعات میں داد تصنیف دیتے رہے ۔ اسلوب نگارش بھی خوشگوار رھا اور طنز کی تلخی پر ظرافت کی چاشنی غالب رھی ۔ رفتہ رفتہ مباحث کا دروازہ کھلنے لگا اور بحث و تکرار کی ابتدا ھوئی ۔ پہلے قادیانیوں سے بعض اختلافی امور میں دلائل و براھین کا سلسلہ چلا ، جو بڑا ٹھوس اور مؤثر تھا ۔ پھر اھل طریقت سے مسائل تصوف پر مٹھ بھیڑ ھوئی جو بالآخر ناخوشگوار صورت اختیار کر گئی اور انھیں پنجاب سے نکل کر حیدرآباد میں پناہ لینی پڑی ۔ حیدرآباد میں بھی مصائب نے پیچھا نہ چھوڑا ، تو پھر پنجاب کا رخ کیا ۔ اس پریشان کن صورت حال کی روداد ظفر علی خان کی زبانی سنیے :

''سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی ستم پیشہ ملوکیت نے ''زمیندار'' کو سیندور کھلا رکھا تھا اور مجھے نیم نظر بندی کی حالت میں اپنا ادبی شوق پورا کرنے کے لیے روزنامہ ''ستارۂ صبح'' کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کی اجازت دے رکھی تھی - سیاست ان ایام میں میرے لیے شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی اور ''ستارۂ صبح'' کے اوراق صرف غیر سیاسی مضامین کے لیے وقف ہونے پر مجبور تھے - تاریخ ' فلسفہ ' اقتصاد ' معاشرت ' مذہب اور ادب لطیف وہ موضوع تھے جن سے میں اپنا دل پرچا سکتا تھا - میں نے اس کو بھی غنیمت سمجھا اور ارباب ذوق سلیم کے لیے علم و حکمت کی ایک بستی بسادی جس کے بام و در کتاب اور سنت کی روشنی سے جگمگا اٹھے - نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول ''ستارۂ صبح'' میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے برخود غلط رہنما چیخ آٹھے - چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے ایک وسیع پیمانے پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میں آن کے راستے سے ہٹ جاؤں - پہلے تو لاهور میں ایک دھوم دھامی جلسہ کیا جس میں مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ' جو اب تک واپس نہیں لیا گیا - اس پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا :

کوئی ٹرکی لے گیا اور کوئی ایراں لے گیا
کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا
رہ گیا تھا نام باقی اک فقط اسلام کا
وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا

اس کے بعد ایک میموریل تیار کیا گیا جس پر طول و عرض ہند کے پیروں اور صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے دستخط ثبت تھے ۔ اس میموریل میں حکومت پنجاب سے استدعا کی گئی تھی کہ کسی طرح میرا منہ بند کیا جائے۔ یہ اسی میموریل کا نتیجہ تھا کہ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصہ کے لیے حیدرآباد جا کر حضرت میر عثمان علی خاں کے دامن دولت میں پناہ لینی پڑی ۔ اگرچہ حیدرآباد میں بھی حریفوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور مجھے اس گوشۂ عافیت کو بھی چھوڑ کر پنجاب کا رخ کرنا پڑا ، جہاں نئی بلائیں میرے استقبال کو موجود تھیں۔"[۱]

حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خاں پہلی جنگ عظیم سے قبل شہرت کے جس بام عروج پر پہنچ گئے تھے اور جمہور کے دلوں میں جو جگہ انھوں نے بنالی تھی ، یہ رد عمل اس کا منطقی نتیجہ تھا ۔ سامراجی حکومت کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ وہ اپنے گماشتوں اور کارکنوں کے ذریعے اس

---

(۱) بحوالہ "نگارستان" ۔

قسم کی فضا پیدا کر کے عوام میں بد گمانیاں پھیلاتی ۔ سامراج نے ہندوستان میں اپنے زمانۂ اقتدار میں یہ کھیل تو عام کھیلا ہے ۔ ظفر علی خاں کی یہ پریشانیاں اگر کچھ ان مناقشوں کی وجہ سے تھیں تو بہت حد تک سامراج کے اس گھناؤنے کردار کی وجہ سے بھی تھیں، جس کا ہدف ہندوستان کے اکثر عوامی رہنماؤں کو بننا پڑا ۔ ظفر علی خاں کے لیے پنجاب اور حیدرآباد (دکن) ہر جگہ عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ حیدرآباد میں وہ میر عثمان علی خان کی طلبی پر پہنچے تھے اور پھر حریفوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر دوسری بار حیدرآباد سے نکلنا پڑا ۔ ماہوار پنشن بھی بند کردی گئی ۔ یہ سب باتیں بڑی حوصلہ شکن تھیں لیکن ظفر علی خاں نے بھی ان کے سامنے سپر ہمت نہیں ڈالی اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے ۔ آزمائشوں میں پڑنا اور ان سے سرخرو ہو کر نکلنا ظفر علی خاں کے کردار کی پختگی اور ثابت قدمی کی دلیل ہے ۔ اس دور کی ذہنی کشمکش کو انھوں نے اشعار کا بھی جامہ پہنایا ہے۔ ملاحظہ ہو :

نہیں اپنوں سے امید مدارات　　تو کیا غیروں سے ہو چشم مراعات
محبت کا نتیجہ ہے عداوت　　نرالی ہے عمل کی یہ مکافات
جگر پھٹتا ہے بھرتا ہوں اگر آہ　　زباں کٹتی ہے کرتا ہوں اگر بات
زمانے کا ہے یہ برتاؤ مجھ سے　　کہ اٹھتے جوتیاں ہیں بیٹھتے لات
لکد کوب حوادث ہو رہا ہوں　　ہیں میرے ہی لیے شاید سب آفات
ہوا جس وقت سے خلوت گزیں ہوں　　زمیں ہے سخت اور دور آسماں سات

مرے دل کی ہے بستی جن سے آباد   نہیں ہوتی ہے اُن سے بھی ملاقات
ستاروں سے کیا کرتا ہوں باتیں   گزر جاتی ہے باتوں میں مری رات
کسی کی زلف عنبر بو کی مانند   پریشاں کیوں نہ ہوں میرے خیالات
ہوئے ہیں منکشف مجھ پر یہ اسرار   پڑھی ہیں میں نے جب قراں کی آیات
کہ کرنا ہو کسی پر گر بھروسا   تو ہے وہ اک فقط اللہ کی ذات

پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ملک میں رولٹ ایکٹ کا ہنگامہ برپا ہوا ۔ جلیانوالہ میں قتل عام کے بعد اسی سال (دسمبر ۱۹۱۹ع میں) امرتسر میں ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا ۔ ظفر علی خان بھی اس میں شریک ہوئے ۔ اُن کے خلاف عوام میں بد گمانیاں زوروں پر تھیں لیکن جب انہوں نے اپنے طرز عمل کی مؤثر الفاظ میں وضاحت کی اور اپنا درد دل کھول کر عوام کے سامنے بیان کیا تو یہ سب بدگمانیاں اور حریفوں کی ریشہ دوانیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں ـــــ انہوں نے فرمایا :

''میرا ضمیر صاف ہے اور میرا دامن بے داغ ۔ میرا عمل ، میری سرگرمیاں عوام پر خود بخود یہ ثابت کر دیں گی کہ ان کی طرف سے مجھ پر جو الزام لگایا جارہا ہے ، وہ بے بنیاد ہے ، جھوٹا ہے ، کذب و افترا پر مشتمل ہے ۔ انگریز جس کے نزدیک میں ہمیشہ سے خار کی طرح کھٹکتا رہا ، جس نے ہمیشہ مجھے خرمن استعمار برطانیہ کے لیے برق سمجھا ہے ، اس کا ظلم و تشدد جب مجھے حب وطن کے مقدس راستے سے ہٹانے میں

ناکام رہا ، تو اس نے مجھے عوام کی نظروں سے گرانے کے لیے یہ ذلیل طریقہ اختیار کیا اور عوام میں پوری طاقت سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ میں نے برطانوی استبداد کے سامنے گردن جھکا دی ہے۔ میں نے انگریز کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ میں نے برطانی اقتدار اعلیٰ سے معافی مانگ لی ہے۔ اس الزام کے سلسلے میں میں کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جو گردن خدا کے حضور میں جھکنے کی عادی ہے ، وہ برطانوی اقتدار کی دہلیز پر کبھی سرنگوں نہیں ہوسکتی۔ جس جبین نیاز پر توحید کی مہر ثبت ہو چکی ہے ، وہ جبین انگریز کے آستانۂ جلال پر کبھی جھک نہیں سکتی۔ میری زندگی وطن کی آزادی کے لیے وقف ہے۔ میرا یہ مقصد حیات ہے کہ یہ گوری چمڑی والے مہذب ڈاکو میری زندگی میں سر زمین ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹ کر جس سر زمین سے آئے ہیں ، وہیں چلے جائیں۔"[۱]

مارچ ۱۹۲۰ع میں ظفر علی خاں کو دوبارہ "زمیندار" کے اجرا کی اجازت مل گئی۔ زمیندار کو جاری ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ حکومت نے چارہزار کی ضمانت ضبط کرلی۔ ملک میں تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کا

---

(۱) بحوالہ اشرف عطا ، مولانا ظفر علی خاں ، صفحہ ۷۱ ، ۷۲۔

غلغلہ برپا تھا ۔ ظفر علی خاں اس سلسلے میں جگہ جگہ تقریریں کر رہے تھے ۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں وہ کانگرس کے خاص اجلاس کلکتہ میں شمولیت کے بعد واپس آرہے تھے کہ لاھور میں انھیں گرفتار کرلیا گیا اور حضرو (ضلع کیمبل پور) میں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا ۔ ایک سپیشل میجسٹریٹ نے مقدمے کی رسمی پیروی کے بعد ظفر علی خاں کو زیر دفعہ ۱۲۴۔الف پانچ سال قید بامشقت مع ایک ھزار روپیہ جرمانہ اور زیر دفعہ ۱۵۳۔الف دو سال قید با مشقت کا حکم سنایا ۔ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ھوئیں ۔ ظفر علی خاں نے قید فرنگ کا یہ زمانہ منٹگمری جیل میں بڑے صبر و سکون سے گزارا ' اور علم و ادب کے مشغلے کو زندان کی تنہائیوں میں اپنا رفیق خاص بنایا ۔ ''زمیندار'' کے درجنوں ایڈیٹر گرفتار ھوئے ۔ ضمانتوں کی طلبی اور ضبطی کا سلسلہ دراز رھا لیکن زمیندار ابتلا و آزمائش کے اس دور سے گزر کر بھی زندہ رھا ۔ ظفر علی خاں جیل سے باھر آئے تو ملک کا نقشہ ھی بدلا ھوا تھا ۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے نازک صورت اختیار کرلی تھی ۔ ابھی وہ جیل ھی میں تھے کہ شدھی اور سنگھٹن کی دلآزار تحریکیں شروع ھو چکی تھیں جس کے نتیجے میں کئی شہروں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی ۔ آریہ سماجی فتنہ پردازوں نے بانیٔ اسلام صلعم پر رکیک حملے کرکے مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا ھوا

تھا - کانگرس کے اندر بھی دو گروہ بن چکے تھے، موالاتی اور ترک موالاتی - خلافت کی قبا چاک ہو چکی تھی اور مسلمان رہنما مسئلۂ حجاز پر دو متحارب گروہوں میں بٹ چکے تھے - پنجاب کی خلافت پارٹی ظفر علی خاں کی سرکردگی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی سے علیحدہ ہوگئی اور اس طرح ظفر علی خاں اور علی برادران میں افسوسناک معارضہ شروع ہوا۔ غرض یہ کہ کئی محاذ قائم ہو چکے تھے اور ہندوستان کے مختلف العقیدہ باشندے سامراج کو شکست دینے کی بجائے آپس ھی میں برسر پیکار تھے - ظفر علی خاں کے لیے یہ سخت آزمائش کا موقع تھا - ایک طرف آزادی کی جنگ تھی جو انگریز کے خلاف لڑنی تھی، دوسری طرف آپس کی یہ سر پھٹول تھی جو محکومی کی زنجیروں کو مستحکم کر رہی تھی - برعظیم کے مستقبل کا فیصلہ درحقیقت اسی کشمکش کے دور میں ہو رہا تھا - ظفر علی خاں کی زندگی کا یہ دور اسی فیصلے سے عبارت ہے - استخلاص وطن کے لیے وہ اب تک کانگرس کے ہم خیال تھے اور دل سے ہندو، مسلم اتحاد کے خواہاں تھے - باوجود اس کے کہ آریہ سماجیوں اور مہاسبھائیوں کی دلآزار روش نے اس اتحاد کے خواب کو پریشان کر دیا تھا، اور ظفر علی خاں کا جذبۂ عشق رسولؐ جو باقی سب جذبوں پر غالب تھا، اس معاملے میں کسی رواداری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، انہوں نے آزادیٔ وطن کی ہر تحریک کا ساتھ دیا - سائمن کمیشن کے مقاطعے میں بڑھ

چڑھ کر حصہ لیا ۔ گاندھی کی نمک تحریک (۱۹۳۰ع) میں شامل ہوئے اور باغیانہ تقریروں کے الزام میں پھر تین سال قید بامشقت کی سزا پائی جو گاندھی ارون پیکٹ کے بعد ایک سال رہ گئی ۔ لیکن کانگرس میں ہندو مہاسبھائی ذہن کا غلبہ دیکھ کر رفتہ رفتہ وہ اس سے بدظن ہوتے گئے ۔ حتیٰ کہ کانگرس کے اجلاس کراچی (۱۹۳۶ع) میں نماز عصر کے موقعے پر اجلاس ملتوی نہ کرنے کے سبب وہ کانگرس سے علیحدہ ہوگئے ۔

مسئلۂ حجاز کے سلسلے میں ۱۹۲۶ع میں سلطان ابن سعود نے مؤتمر اسلامیہ بلائی جس میں علی برادران، سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ظفر علی خان شامل ہوئے ۔ ظفر علی خاں سلطان کے حامی تھے، علی برادران مخالف تھے ۔ ظفر علی خاں نے حجاز کی اس موتمر میں عربی زبان میں فصیح وبلیغ تقریر کرکے اپنی عربی خطابت کا لوہا بھی منوایا ۔ پنجاب کی خلافت کمیٹی نے بعد میں مجلس احرار کا روپ دھار لیا اور تحریک آزادیٔ کشمیر میں نمایاں حصہ لیا ۔ ۱۹۳۵ع میں مسئلۂ شہید گنج پر ظفر علی خاں کا مجلس احرار سے سخت اختلاف ہوا ۔ انھوں نے مجلس اتحاد ملت بنا لی ۔ ۱۹۳۷ع میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم میں حیات نو کی روح پھونکی، تو ظفر علی خاں نے اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیا اور اپنے آپ کو مسلمانوں کی بیداری اور تنظیم کے لیے وقف کردیا ۔ ۱۹۳۷ع

کے ایک ضمنی انتخاب میں حلقۂ قسمت لاہور سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں وہ پھر اسی حلقے سے ووٹوں کی بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے۔ جب تک وہ کانگرس میں تھے، مسلم لیگ کو نوابوں، ٹوڈیوں اور کاسہ لیسوں کی جماعت قرار دیتے رہے، اور یہ بات کئی لحاظ سے درست بھی تھی۔ جب مسلم لیگ کو عوام کی جماعت بنانے کا مرحلہ شروع ہوا، تو ظفر علی خاں نے نے اپنے شب و روز کو ہمہ تن اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔ ہر چند کہ وہ اب عمر کی ایسی منزل میں تھے جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور انسان گوشۂ عافیت کی راحت و آسائش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن انھوں نے اس مرحلے پر بھی شورش حیات میں بھرپور حصہ لیا اور ایسے سرگرم عمل ہوئے کہ جوانوں کو رشک آجائے۔[1] اس زمانے کی سیاسی مصروفیات کا حال مردان مسلم لیگ کانفرنس (۲۳ اکتوبر

---

(۱) راقم کا یہ ایک ذاتی مشاہدہ ہے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے سلسلے میں جب انتخابی مہم زوروں پر تھی، میرے چند دوست لاہور سے کسی مسلم لیگی رہنما کو بلانے کے لیے آئے تاکہ بٹالہ شہر اور تحصیل میں تقریریں کرائی جائیں۔ کوئی لیڈر تیار نہ ہوتا تھا۔ پیشہ ور خطیب تیار ہوتے تھے تو ان کے نرخ ان دنوں بہت چڑھے ہوئے تھے۔ میرے دوست مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگے تو کسی نے مشورہ دیا، ذرا ''زمیندار'' میں بھی چل کر دیکھیں۔ وہاں گئے تو مولانا ابھی دہلی سے واپس آئے ہی تھے۔ بستر (باقی اگلے صفحے پر)

۱۹۳۸ء) کے خطبۂ صدارت کے آغاز میں بیان کرتے ہوئے خطبے کو ضبط تحریر میں نہ لا سکنے کا عذر یوں پیش کرتے ہیں:

"مجھ سے توقع کی گئی تھی کہ میں اپنا خطبہ قید کتابت میں لا کر پڑھوں گا۔ مگر میرے مشاغل قومی آپ کے علم میں ہیں۔ پندرہ بیس دن سے میں چیونٹی بھرا کباب ہو رہا ہوں۔ سیماب کی طرح ایک جگہ قرار نہیں۔ ع

ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کبھی ملتان میں ہوتا ہوں، کبھی جھنگ میں، کبھی لائلپور میں ہوں کبھی سندیلہ سے ہردوئی پہنچا۔ وہاں سے شاہ آباد گیا اور شاہ آباد سے شاہجہان پور ہوتا ہوا یہاں حاضر ہوا ہوں۔ ہزاروں مسلمانوں میں شبانہ روز تقریریں کرنا، نیند کا میسر نہ آنا، ان حالات میں صفحۂ قرطاس پر اپنے خیالات کا جمع کرنا

ابھی بند پڑا تھا۔ سفر کی تکان قدرتی بات تھی۔ تاہم دوستوں نے مولانا سے درخواست کی اور اپنی دن بھر کی حوصلہ شکنیوں کو اور اس علاقے میں مسلم لیگ کی پتلی حالت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ مولانا اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور بٹالہ چلے آئے۔ پھر دو روز تک مسلسل سفر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، دوسرے سے تیسرے، اور پھر ہر جگہ تقریر۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مولانا نے صرف صبح کو ناشتے میں دو نیم برشت انڈے، دو توس اور دو پیالیاں چائے کی پی تھیں۔ سارا دن کچھ نہ کھایا۔ حتیٰ کہ رات کو دس گیارہ بجے ایک گاؤں میں چائے، حقہ پیا اور تازہ دم ہو کر اشعار کی فرمائش بھی پوری کرنے لگے— اور پھر اگلے روز علی الصباح پانچ سات میل کی "تیزگام" سیر بھی کی۔

ناممکن العمل ہو رہا ہے۔ اس لیے مجبوراً خطبۂ صدارت کا فرض قلم کی بجائے زبان سے انجام دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ محترمی جناب مولانا عبدالحامد صاحب قادری بدایونی جنھوں نے میری تیز رفتار تقریر کو سپرد قلم کرنے کا چیلنج منظور فرما لیا ہے، میرے الفاظ کو قلم بند فرما لیں گے اور اُن کی اس عنایت سے میرے خیالات اخبارات میں شائع ہو سکیں گے۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو فعّال عوامی جماعت بنانے اور حصول پاکستان کی مہم کو کامیاب بنانے میں ظفر علی خاں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اسی لیے قائداعظم محمد علی جناح نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ع کو شاہی مسجد لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: "مجھے آپ اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں جیسے دو چار بہادر آدمی دے دیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔" ۱۹۴۶ع کے عام انتخابات میں، جو ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے، ظفر علی خاں نے دن رات ایک کرکے اور قریے قریے میں پہنچ کر مسلمانوں کو نازک صورت حال سے آگاہ کیا، جس کا نتیجہ بالآخر تاریخ کی ایک ان مٹ حقیقت بن گیا!

۱۹۴۶ع کے وسط میں اُنھیں تپ محرقہ نے آگھیرا۔ تین

---

(۱) "زمیندار" ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۸ع۔

ماہ تک بستر علالت پر رہے۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو فالج کا حملہ ہوگیا۔ ان حملوں نے ظفر علی خاں کو بالکل صاحب فراش کر دیا۔ تاہم کچھ عرصے تک باغ جناح میں صبح کی سیر اور کبھی کبھی کسی علمی، ادبی مجلس میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا، لیکن زیادہ تر ایک تماشائی کی حیثیت سے۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ع کو رات کے آٹھ بجے پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس کے ایک اجلاس میں انھوں نے اپنا مقالہ ''عہد حاضر اور اردو'' پڑھتے ہوئے بڑے مؤثر انداز اور دلگداز پیرائے میں اپنی ہنگامہ خیز زندگی کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

''ہمارا قافلہ منزل مقصود پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد تمنائے راہ پیمائی تو ہے، لیکن قوت راہ پیمائی نہیں رہی۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ہاتھ جواب دے چکے ہیں۔ دل میں جذبات تو ہیں لیکن اُن کے لیے عمل و حقیقت کا جامہ نہیں ملتا۔ اب راستے میں بیٹھ کر چلنے والوں کی برق رفتاری کا تماشا دیکھنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ تماشا بھی اُن لوگوں کا دیکھتے ہیں جو ہمیں عہد ماضی کی یادگار سمجھ کر تماشا سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو تماشائی۔ اس میں شک نہیں کہ بوڑھے عصر حاضر کے معمار ہیں لیکن جس طرح عمارت مکمل ہو جانے کے بعد معمار کو نکال دیا جاتا ہے اسی طرح اگر عصر حاضر پکارنے لگے کہ اب تمھاری کوئی ضرورت

نہیں، تو ہم کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ دنیا چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کرتی ہے، ڈوبتے ہوئے آفتاب کو کون پوچھتا ہے، اور ہم تو ڈوبتے ہوئے ستارے کی طرح دنیا پر نظر ڈال رہے ہیں۔ پھر سورج کے مقابلے میں ہمیں کب جگہ ملے گی۔ بایں ہمہ کبھی ہم بھی رزم گاہ ہستی میں مصروف پیکار تھے۔ ہم نے بھی اس خاموش دنیا میں ہنگامے کی روح پھونکی تھی۔ عہد حاضر کے نقش و نگار میں کچھ ہمارے قلم کا حصہ بھی ہے۔ اسی گلستان کے چند پھولوں نے ہمارے خون سے بھی سرخی حاصل کی ہوگی۔ اس صحرا کی ہنگامہ آرائی میں ہمارا جنون بھی کارفرما رہا ہے۔ اس لیے اگر ہم کچھ کہیں تو عزیزان ملت! پرانے زمانے کی راگنی نہ سمجھیں۔ ٹوٹے ہوئے ساز کا الجھا ہوا نغمہ خیال نہ کریں، اور پھر یہ کہہ کر کانوں میں انگلیاں نہ ٹھونس لیں کہ:[1]

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں"

(۱) [بحوالہ مسودۂ مضمون "عہد حاضر اور اردو"۔ راقم کے پاس اس مضمون کا اصل مسودہ محفوظ ہے۔ یہ مضمون "زمیندار" کے پیڈ پر لکھا ہوا ہے۔ غالباً ظفرعلی خاں نے یہ مضمون لکھوایا ہے (معلوم ہوا کہ اظہر امرتسری نے اسے قلم بند کیا ہے۔) دو تین جگہ اصلاح بھی کی گئی ہے جو شاید مولانا ظفرعلی خاں کے قلم سے ہے۔]

قیام پاکستان کے بعد دو تین سال تک ظفر علی خاں لاہور میں رہے۔ اردو کانفرنس کے کچھ عرصہ بعد راقم نے ایک موقع پر جامع نیلہ گنبد میں انہیں دیکھا۔ بدن میں رعشہ، زبان میں لکنت، حافظہ تقریباً جواب دے چکا تھا، انتہائی لاغر و نحیف ہو چکے تھے۔ تقریر کی۔ چند فقرے کہے۔ ایک آدھ اپنا شعر بھی پڑھا لیکن پڑھتے ہوئے بھول گئے — چند ایک بار باغ جناح میں منٹگمری کلب کے سامنے والی سڑک پر تیزگام سیر کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کرم آباد چلے گئے اور بستر علالت پر زندگی کی آخری مسافت طے کرتے رہے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ع کو ظفر علی خاں کی ۸۳ ویں سالگرہ کرم آباد میں منائی گئی۔ اختر علی خاں کی دعوت پر لاہور کے چند ادیبوں و شاعروں کے ہمراہ راقم کو بھی کرم آباد جانے کا موقع ملا اور اس بطل حریت کو آخری بار دیکھنے اور ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس موقعے کے تاثرات (جو یاد داشت کی صورت میں محفوظ ہیں) یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

''جلسہ گاہ میں اختر علی خاں ابھی مہمانوں کا استقبال ہی کر رہے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں دو آدمیوں کے سہارے اپنی قیام گاہ سے باہر تشریف لائے۔ عبدالمجید سالک کو دیکھ کر آنکھوں میں کچھ چمک پیدا ہوئی اور چہرہ متبسم ہوا۔ سٹیج پر لا کر انہیں بٹھا دیا گیا۔ عبدالمجید سالک کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔

جس شخص کی ۸۳ ویں سالگرہ پر اس کی زندگی کے ہنگامہ خیز کارناموں پر ولولہ انگیز تقریریں ہو رہی تھیں ـــ وہ خود دنیا و مافیہا سے بے نیاز نجانے کس عالم میں محو تھا - اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور کبھی کبھار ان میں پتلیوں کی گردش یہ بھی پتہ دیتی تھی کہ وہ ماحول کو دیکھ رہا ہے - کیا دیکھ رہا ہے ؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا !

وہ انسان ! جس کی آتش نوائی میں سرمائیکل اوڈوائر کو برطانوی استعمار کا قصر رفیع لرزتا ہوا نظر آیا ـــ آج خود اپنے متعلق بھی کچھ نہیں سوچ سکتا - زیست اور موت کے دوراہے کہاں ملتے ہیں اور کہاں جدا ہو جاتے ہیں، انسانیت موت کے دروازے پر کیا سوچتی ہے ؟ ان سب باتوں سے بے خبر !

چار بجے شام جلسہ و مشاعرہ ختم ہوا - الوداعی سلام کے لیے ہم چند احباب ظفر علی خاں کی قیام گاہ پر گئے - ظفر علی خاں کمبل میں لپٹے کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھے تھے - سارے دن میں میرے کان اُن کے منہ سے صرف ایک لفظ سن سکے اور وہ لفظ بھی لرزتا ہوا جلدی سے ہوا میں تحلیل ہو گیا، مبادا کوئی سن لے، وہ لفظ تھا ـــ ”دعا“ !

الوداعی مصافحہ کرتے وقت مولانا نے حسب

معمول گرم جوشی سے ھاتھ دبایا ۔ میں نے محسوس کیا
کہ ابھی ظفر علی خاں اپنی ایک عادت نہیں بھولے ،
اگرچہ باقی سب کچھ قصۂ پارینہ بن چکا !''

آخر ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ع کو علی الصباح ظفر علی خاں ہنگاموں کی اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔ اناللہ و انا الیہ راجعون !

شخصیت :

ظفر علی خاں کی زندگی کے احوال و کوائف پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اُن کی شخصیت کی جو تصویر ھمارے سامنے اُبھرتی ھے اُس میں کئی رنگوں کی آمیزش ھے ۔ بعض رنگ شوخ اور گہرے ھیں تو بعض ھلکے اور معتدل ۔ جس ماحول میں ظفر علی خاں نے زندگی بسر کی اُس میں ھنگامے بھی تھے اور افسانے بھی تھے ، سیاست و صحافت کے سنگ و خشت بھی تھے اور ادب و شعر کے مرغزار بھی تھے ۔ ظفر علی خاں نے ان سب میں بھرپور حصہ لیا اور ھر میدان میں اپنی ذھانت ، شوخی اور زندہ دلی کا لوھا منوایا ۔ ظفر علی خاں مترجم بھی تھے اور مصنف بھی ، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی ، صحیفہ نگار بھی تھے اور خطیب و سیاست دان بھی —— اور ان سب میدانوں میں وہ صرف رہ رو ھی نہیں تھے بلکہ رہ بر بھی تھے ۔ ایک ایسے رھبر ، جو سوچنے میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتا ،

بلکہ عمل پر یقین رکھتا ہے ' جو مصلحت اندیشی کو اپنا مسلک نہیں بناتا بلکہ حق گوئی و بے باکی کو اپنا شعار بناتا ہے ' خود انھی کا یہ شعر اُن پر صادق آتا ہے :

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

قدرت نے ظفر علی خاں کی ذات میں ہزاروں ہنگامے ' ہزاروں ولولے اور ہزاروں معرکہ آرائیاں مجتمع کر دی تھیں ' جن کی بدولت یہ ہنگامہ خیز شخصیت کم و بیش نصف صدی تک برعظیم پاکستان و بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی پر چھائی رہی ۔ بقول تاجور نجیب آبادی :

''یہ قہرمان میدان ادب و صحافت اپنی ہنگامہ آفرین شخصیت کے اعتبار سے آج اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔ اس کی فلک فرسا ہمت' اولو العزمی اور مصائب آرائی نے اسے تاریخ صحافت کا غیر فانی ہیرو بنا دیا ہے ۔ قانون کی پیچ در پیچ بندشوں سے اس کی فطرت ابا کرتی ہے ' اور خطرات و عواقب پر ہنستا ہوا وہ ان نظر بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ زمانۂ ناسازگار کو بھی اس سے ضد سی آ پڑی ہے کہ اس نے اپنی چیرہ دستیوں کے لیے اسے چن لیا ہے ۔ جیل' جرمانے ' ضمانتیں' خانہ تلاشیاں' قرقیاں ' ضبطیاں ' غرض قانون کی کوئی گرفت ایسی نہیں جو اسے مجبور کرنے کے کام نہ آئی ہو ۔ لیکن

قانون کو بھی اس جیسے دل گردہ رکھنے والے انسان سے بہت کم واسطہ پڑا ہوگا کہ قانون کی پیدا کی ہوئی ہر بربادی کے بعد ظفر علی خاں کی خاک سے ایک چاک چوبند نعرے مارتا ہوا زندہ ظفر علی خاں نمودار ہو جاتا ہے۔"

(ماہنامہ "شاہکار" لاہور، بابت اپریل ۱۹۳۵ء)

آلام و مصائب پر مسکرانے اور حوادث سے ٹکرانے اور ٹکرا کر ان کا منہ پھیر دینے والا ظفر علی خاں ایک عرصے تک جمہور کے دلوں پر حکومت کرتا رہا اور خاص و عام میں اپنی متنوع اور ہمہ رنگ شخصیت کی بدولت مقبول رہا۔ ظفر علی خاں کی زندگی سیاسیات کے اُن ہنگاموں میں گزری، جہاں دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی، بلکہ نظریاتی آویزش کی وجہ سے جہاں کل کے دوست آج کے دشمن اور کل کے حریف آج کے رفیق و ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اکھاڑ پچھاڑ اور مدح و قدح کے سلسلے تو یہاں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ظفر علی خاں تو اپنے قلم کو گرز گراں بنائے اس میدان میں حریفوں کو دعوت مبارزت دیتے رہے:

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بیمثال بن

بایں ہمہ ظفر علی خاں کے خلوص، دیانت اور حب الوطنی کا اعتراف دوست دشمن سبھی نے کیا ہے۔ ظفر علی خاں کی

شخصیت کے بارے میں چند اکابر کی آراء یہاں پیش کی جاتی ہیں جن سے اُن کی شخصی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

"ظفر علی خاں علی گڑھ کے ان ہونہار طلبہ میں سے ہیں جنھیں آئندہ چل کر اپنی قابلیت کے بوتے پر ملک و قوم کی ذمے داریاں سنبھالنی ہیں - میں ان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں -"

(سرسید احمد خاں بنام نواب محسن الملک)

"اس نوجوان میں بلا کی تیزی ہے - اس بدلتے ہوئے دور میں ایسے ذہین نوجوانوں کا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمانوں میں جوہر کی کمی نہیں، تربیت کی کمی ہے - ظفر علی خاں نے علی گڑھ میں رہ کر جو کچھ حاصل کیا ہے، حیدر آباد اس سونے پر سہاگے کا کام دے سکتا ہے -"

(نواب محسن الملک بنام نواب افسر جنگ)

"ظفر علی خاں میرے شاگردوں میں سے ہیں - پنجابی نژاد ہیں اور خوب لکھتے ہیں - انہیں نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے - یہاں نوجوانوں میں تو وہ سب سے آگے ہیں - اپنی نظم و نثر میں کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھاتے - پنجاب نے ظفر علی خاں اور اقبال پیدا کرکے اپنے ماضی کی تلافی کر دی ہے -"

(فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی)

"ظفر علی خاں کا نام اور کام محو ہونے کی چیز نہیں - ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے لیکن ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی باگ ڈور نوجوانوں نے سنبھال رکھی ہے -" (علامہ محمد شبلی نعمانی)

"ظفر علی خاں کے قلم میں مصطفیٰ کمال کی تلوار کا بانکپن ہے - انھوں نے مسلمانان پنجاب کو نیند سے جھنجوڑنے میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں -"

(شاعر مشرق علامہ اقبال)

"ظفر علی خاں کو تحریکوں کی عمارت بنانے میں کمال حاصل ہے - وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ راہ و منزل سے بے نیاز ہو کر چلتے ہیں-"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

"ظفر علی خاں صحافی سے زیادہ ادیب ہیں اور ان کے کلام میں جو تلخی ہے وہ سیاست کی ہے اور جو چاشنی ہے وہ ادب کی ہے -" (مولانا محمد علی جوہر)

"ظفر علی خاں نے جو قومی و ادبی معرکے سر کیے ہیں اس کا اعتراف تو ان کے دشمنوں کو بھی ہے -"

(مولانا شوکت علی)

"مولانا ظفر علی خاں نے اردو ادب کو سینکڑوں الفاظ اور بیسیوں ترکیبیں دی ہیں جو ان کے پیار آفرین قلم کا قابل فخر سرمایہ ہیں- " (شیخ سر عبدالقادر)

''اردو ادب نے تین کامل الفن استاد پیدا کیے ہیں۔
محمد رفیع سودا ، اکبر الہ آبادی ، ظفر علی خاں۔''
(سید سلیمان ندوی)

انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس کراچی (۱۹۳۶ء) میں نماز عصر کے موقعے پر جلسہ ملتوی نہ کرنے کی بنا پر ظفر علی خاں جب کانگرس سے علیحدہ ہو گئے تو گاندھی جی نے کہا:

''میں مولانا ظفر علی خاں کی عزت کرتا ہوں۔ وہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ ہمیں ان سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے دیش کے لیے بڑی بڑی کٹھنائیں سہی ہیں۔''

اسی موقعے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

''یہ صحیح ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی سیاسیات میں مختلف راستہ اختیار کرتے چلے گئے۔ کچھ بھی ہو لیکن اس میں تو شک نہیں کہ مولانا ظفر علی خاں غیر ملکی حکومت کے خلاف بڑی جوانمردی سے لڑتے رہے ہیں۔''

خواجہ حسن نظامی ، جنھیں مختلف امور میں ظفر علی خاں سے مخاصمت رہی ، ان کی شخصیت کی قلمی تصویر بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کرتے ہیں:

''میانہ قد ، گندمی رنگ ، چھریرا بدن ، آنکھیں روشن اور متحرک ، آواز بلند اور با وقار ، بولنے میں روانی

اور بے باکی، نظم و نثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں، قادرالکلام لیکن قادرالمزاج نہیں - بھک سے اڑ جانے والی بارود ہیں - ان کی بول چال میں، لہجے اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا، مگر ان کی اُردو عرب سے بن کر آئی ہے، اور فارس کے راستے یہاں پہنچی ہے - ہجو خوب لکھتے ہیں - ترجمہ کرنے میں اُن کی کوئی برابری نہیں کر سکتا - قادیانی ہوتے تو اپنی بے نظیر اور دل و دماغ پر نقش ہو جانے والی نظموں کو وحی اور الہام کہتے - ہندو ہوتے تو کسی بنیے کو کنجوس نہ رہنے دیتے - انگریز ہوتے تو شاہ خرچی سے برٹش قوم کا دیوالہ نکال دیتے - قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے -"

ظفر علی خاں ایک پُر جوش مسلمان تھے - اسلام اور اس کی درخشاں روایات سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا - وہ ان روایات کو عملی زندگی میں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے:

اتنی ہی آرزو ہے مرے دل میں اے خدا
اسلام کو زمانے میں دیکھوں میں سر بلند

ظفر علی خاں کی ہنگامہ خیز زندگی کی یہ ایک ایسی کلید تھی جس کی وجہ سے انھیں اکثر موافقوں اور مخالفوں دونوں سے واسطہ پڑتا تھا اور بعض اوقات مدۃالعمر کے رفیقوں تک سے

الجھنا پڑتا تھا۔ انسان بشری کمزوریوں سے ماوری نہیں ہوتا۔ ظفر علی خاں بھی بہر کیف ایک انسان تھے۔ بشری کمزوریاں اُن میں بھی تھیں[۱]۔ کچھ مشتعل مزاج بھی تھے۔ فطرت بھی سیمابی پائی تھی۔ اس لیے ان کی بعض باتوں میں زود رنجی اور انتہا پسندی کی کیفیت جھلکتی ھے۔ لیکن ظفر علی خاں کے خلوص، نیک نیتی، اسلام دوستی اور حب الوطنی سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی نے اُن کی بشری خامیوں اور خوبیوں کا ذکر کتنے مختصر لیکن بلیغ انداز میں کیا ھے: ''ظفر علی خاں صاحب سے ملیے تو میرا سلام شوق کہیے۔ وہ پرجوش مسلمان ھیں لیکن موم کی ناک بھی ھیں۔''

(خط بنام عبدالماجد دریا بادی)

ھنگاموں کی دنیا کے علاوہ ظفر علی خاں کی زندگی کا ایک دوسرا رخ بھی ھے جو ان کے جمالیاتی احساس اور خوش مذاق کا آئینہ دار ھے۔ یہ رخ ان کی نجی اور خلوت کی زندگی کا ھے۔ یہاں جو شخصیت اُبھرتی ھے وہ اُس شخصیت سے خاصی مختلف ھے جسے ھم سطح عام پر دیکھتے ھیں۔ یہاں للکار و پیکار والے ظفر علی خاں کی بجائے ایک ایسے ظفر علی خاں کی شبیہ نظر آتی ھے جو باغ و بہار کا مرقع ھے۔ دوستوں کے

---

(۱) مثلاً کہا جاتا ہے کہ اُن کی ایک بڑی کمزوری اُن کے فرزند اختر علی خاں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی بے لوث سیاسی زندگی پر حریفوں کی طرف سے جو وار کیے جاتے رہے بہت حد تک اُس کا باعث اختر علی خاں ہی تھے۔

حلقے میں شکایتیں کم اور حکایتیں زیادہ نظر آئیں گی ۔ ان حکایتوں میں بذلہ سنجی اور خوش مذاقی کے نمونے بھی ملیں گے ۔ زندگی کے شدائد ، اپنوں اور بیگانوں کی دشنام طرازیاں ، حکومت کے ظلم و ستم ، زنداں کے آلام و مصائب ، یہ سب کچھ سہنے کے باوجود جینے کا یہ قرینہ اور زندگی سے مفاہمت کا یہ احساس ایک ایسی شخصیت کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں تحمل اور بردباری بدرجۂ کمال پائی جاتی ہو ۔ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی، ایک ایسا شخص جسے اپنے نظریات سے اتنا جذباتی لگاؤ ہو کہ وہ بات بات پر مشتعل ہو کر دوسروں کے خلاف برسر پیکار ہو جاتا ہو ، وہ اتنا متحمل اور بردبار بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے شدائد بھی سہتا ہے اور احباب کی محفلوں میں ہنستا اور ہنساتا بھی ہے ۔ یہ سدا بہار باتیں ایمان کی دولت اور یقین کی پختگی کے بغیر ممکن نہیں ۔ ظفر علی خاں شدائد زندگی اپنے نصب‌العین کی خاطر سہہ رہے تھے ۔ اس لیے مصائب و آلام کی شدت انہیں پریشان تو کر سکتی تھی ، مغلوب نہیں کر سکتی تھی ، اور پریشانیٔ خاطر کا علاج وہ یقین و ایمان کے تریاق بے بدل سے کر سکتے تھے ۔ ظفر علی خاں جس صبر و سکون اور عزم و استقلال سے زندانی زندگی بسر کرتے تھے ، اس پر ان کے رفیقان زنداں بھی گواہ ہیں اور ان کا وہ شعر و ادب بھی اس کی شہادت دے رہا ہے جو ایام اسیری کی تخلیق ہے ۔ جلال و

جمال کی یہ کیفیتیں نکتۂ ایمان کی تفسیریں ہیں اور ظفر علی خاں کی شخصیت اور کردار اقبال کے اس مثالی انسان کا آئینہ ہے :

هو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل هو تو فولاد ہے مومن

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ظفر علی خاں نے زندگی کا ایک خاصا حصہ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد کے ریاستی ماحول میں گزارا ۔ ریاست کے پرتکلف ماحول میں آرام و آسائش کے جملہ سامان مہیا تھے ۔ شعر و ادب کے چرچے اور محفلوں کی رنگا رنگی جاذب توجہ تھی ۔ لیکن اس پرتکلف ماحول میں رہتے ہوئے بھی اُن کا دل ملی سوز و درد سے خالی نہ تھا ۔ اصلاح معاشرت کے سلسلے میں ان کی نظمیں اور مضامین اس زمانے کے ذہنی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں ۔ پھر جب اُنھوں نے ملازمت چھوڑ کر باقاعدہ قومی زندگی میں ایک عملی رہنما کی حیثیت سے کام شروع کیا تو ریاستی زندگی کے تکلف و تجمل کو چھوڑ کر سادگی اختیار کی ، لیکن اس سادگی میں بھی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کا پہلو ملحوظ رہا ۔ سیر و شکار زندگی کا محبوب مشغلہ تھا ۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں میں شریک ہونے کے بعد شکار کے موقعے تو نہ مل سکتے تھے لیکن سیر کا شوق اُس وقت تک کم نہ ہوا جب تک قویٰ نے بالکل جواب نہ دے دیا ۔ ظفر علی خاں کی سیر کا معمول بھی

اپنی انفرادی شان رکھتا تھا ۔ صبح سویرے کئی کئی میل پیدل چلنا، بلکہ اتنا تیزگام ہونا کہ چلنے اور دوڑنے میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے ۔ اگر کوئی شخص رفیق سیر بننے کی کوشش کرے تو تھوڑی دور چل کر اس کا حوصلہ ہار بیٹھنا لازمی تھا، پھر اُس کے لیے سوائے اس کے کوئی چارا نہ رھتا کہ سر راہ بیٹھ کر ظفر علی خاں کی برق رفتاری کا تماشا کرے ۔ میدان سیاست میں اُن کے ایک زمانے کے رفیق سید عطاءاللہ شاہ بخاری تو کہا کرتے تھے کہ ''ھمارا لیڈر کیا ھے، طوفان میل ھے!''

تیز گام سیر کے ساتھ ورزش کا معمول (جس میں ڈنٹر پیلنا اور مگدر ھلانا شامل تھے) بھی جاری رھا ۔ جب زندگی کے مہ و سال زنداں کی تنہایوں کی نذر ھو جاتے، تو سیر کے اس معمول میں کچھ تبدیلی آجاتی ۔ سیر جیل کے وارڈ تک محدود ھو جاتی ۔ چہل قدمی اور ھلکی ورزش کے ساتھ اپنی جیل کی کوٹھڑی کے سامنے کیاریاں بنتیں ۔ ظفر علی خاں خود کھرپہ لے کر کیاریوں کو بناتے سنوارتے ۔ ان کیاریوں میں قسم قسم کی ترکاریاں اور رنگا رنگ کے پھولوں کے پودے بوئے جاتے ۔ پھر ان کیاریوں میں آرام کرسی بچھا کر مختلف اردو انگریزی کتب، رسائل اور اخبارات کا مطالعہ ھوتا ۔ مطالعے کا یہ سلسلہ بعض اوقات اتنا طویل ھو جاتا کہ کھانے کا وقت بھی گزر جاتا ۔ زندانی زندگی میں کھانے کا اھتمام اکثر اپنی نگرانی میں کرتے ۔ شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ بھی

جاری رھتا ۔ اگر جیل میں دوسرے سیاسی رفقاء بھی ھوتے تو مشاعرے ، مباحثے اور قوالیاں بھی ھوتیں اور اس طرح جیل کی اذیتوں کو راحتوں میں بدل لیا جاتا ۔ ان تفریحی مشاغل کے علاوہ جیل کی تنہایوں میں اللہ کی یاد سے دل معمور رھتا اور عبادت کا ذوق و شوق جیل کے ضابطوں کی پروا کیے بغیر پورا کیا جاتا ۔ جیل کے سنگین قواعد ظفر علی خاں کو اپنے سچے مسلک سے سر مو نہ ھٹا سکتے تھے ۔ جس بات پر وہ اڑ جاتے تھے اُسے منوا کرھی دم لیتے تھے ۔ ایک دفعہ اُنھیں گرفتار کرکے لاھور سنٹرل جیل لایا گیا ۔ جیل کے قواعد کے مطابق مام قیدیوں کو جیل کے صدر دروازے کی کھڑکی کے راستے اندر جانا پڑتا ھے اور اس طرح انھیں جھکنا بھی پڑتا ھے ۔ ظفر علی خاں نے اس کھڑکی کے راستے جھک کر اندر جانے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ سر جو رب کعبہ کے سامنے جھکنے کے لیے بنایا گیا ھے ، برطانوی استبداد اور جیل کے حکام کے سامنے کبھی جھک نہیں سکتا ۔ چنانچہ ان کے مطالبے کے سامنے جیل کے حکام کو جھکنا پڑا ، اور وہ مجبور ھوگئے کہ بڑے دروازے کا ایک کواڑ اُن کے لیے کھول دیں :

مجھ سے بجز خدا کے کسی کے حضور میں
اپنا سر نیاز جھکایا نہ جائے گا

نظر بندی کے ایام میں کرم آباد کی دیہی فضا میں اُن کے مشاغل زندگی مطالعہ و تصنیف کے علاوہ سیر و شکار اور کھیتی

باڑی و باغبانی سے دلچسپی تک محدود ہو جاتے۔ اپنے دیہاتی بھائیوں سے ظفر علی خاں کو بڑا انس تھا۔ شستہ اور با محاورہ اردو بولنے والا ظفر علی خاں یہاں تہمد اور کرتہ پہنتا اور اپنے بھائیوں سے ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کرتا۔ ظفر علی خاں نے دیہاتی زندگی میں معاشرتی اصلاح کا پروگرام بھی مدنظر رکھا۔ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں نے انھیں اس قسم کے کاموں کا زیادہ موقع تو نہ دیا، تاہم کرم آباد کی معاشرتی زندگی میں اپنی مدد آپ کے اصول پر خاصی اصلاح ہوئی۔

لباس اور خوراک کے معاملے میں ظفر علی خاں بڑے نفیس الطبع اور خوش ذوق تھے۔ شروع میں انگریزی وضع کا لباس پہنا، بعد میں قومی تحریکوں کے زیر اثر مشرقی وضع کا لباس (شیروانی) پہنتے رہے۔ خوراک کم کھاتے لیکن کھانا عمدہ اور لذیذ پسند کرتے۔ محاربۂ عمل میں ہوتے تو معمولات زندگی میں خلل سے پریشان نہ ہوتے۔ چائے اور حقہ ان کی زندگی کے دو رفیق خاص تھے۔ سفر میں ہوتے تو ملازم اور حقہ ساتھ رکھتے اور چائے کا خاص اہتمام ہوتا:

زندگانی کے لطف دو ہی تو ہیں
صبح کی چائے شام کا حقہ

کہاں سے لاؤں مضامین غیب کی سرخی
علی الصباح اگر چائے کا غرارہ نہ ہو

اور یہی چائے اور حقہ ان کے احساس جمال کو بیدار کرتے اور تخلیقی عمل میں ممد و معاون ہوتے ۔ بقول چراغ حسن حسرت ''ادھر حقے کی نے منہ میں آئی اُدھر انگوٹھا انگشت شہادت پر پہنچا، پیشانی پر بل پڑے، دھواں ہوا میں منتشر ہوا، اور کھٹ سے شعر سامنے آ گیا اب بندش پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے، ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں ۔''[1]

ظفر علی خاں ایک پُر جوش مسلمان تھے ۔ صوم و صلواۃ کے بڑے پابند، عقیدے کے اعتبار سے حنفی لیکن اتحاد اسلامی کے پر خلوص حامی —— ان کی ایک دلآویز نعت کا مشہور شعر ہے:

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یاران نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

تاریخ بر عظیم پاکستان و بھارت کی ایک نامور شخصیت ظفر علی خاں کی زندگی کے چند نقوش سطور بالا میں پیش کیے گئے ۔ اب ہمیں ان کے شعری و ادبی کمالات کا جائزہ لینا ہے، جو اس مقالے کا خاص موضوع ہیں ۔

---

(۱) حسرت، چراغ حسن، مردم دیدہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ع، صفحہ ۱۴۷ ۔

تیسرا باب

ظفر علی خاں کا ادبی سرمایہ

اب ہم ظفر علی خاں کے ادبی سرمائے کی تفصیل پیش کرتے ہیں تاکہ اُن کے ادب کی قدر و قیمت کی تعیین میں اس سے مدد مل سکے، پہلے نثری تصانیف و تراجم پھر شعری مجموعے۔

نثری تصانیف و تراجم

۱۔ خیابان فارس:

جارج نتھینئیل، لارڈ کرزن (وائسرائے ہند ۱۸۹۹-۱۹۰۵ع) کی مشہور تصنیف Persia and the Persian Question کی پہلی جلد کا ترجمہ ہے، جس کا نصف حصہ زیادہ تر فن سیاست اور ایران کے جغرافیے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب لارڈ کرزن نے تین سال کی لگاتار محنت، ایران اور علاقہ جات ملحقہ میں چھ مہینے کے سفر اور اس سفر کے بعد لائق اور مستند اصحاب مقیم ایران کے ساتھ مسلسل خط و کتابت کرکے لکھی تھی۔ مولوی عزیز مرزا کے ایما پر ظفر علی خاں نے ۱۸۹۸ع میں لارڈ کرزن کی اجازت لے کر اس کا ترجمہ شروع کیا، لیکن صرف ایک ہی جلد کا ترجمہ کر پائے۔ نظام سرکار نے طباعت و اشاعت کے لیے تین ہزار روپے (سکۂ آصفی) مترجم کی منظوم درخواست

پر عنایت فرمائے۔ ۱۹۰۲ع میں مطبع شمسی حیدر آباد (دکن) نے بڑی زیب و زینت سے اسے طبع کیا۔ کتاب کے کل صفحات ۶۱۲ ہیں۔ ۲ نقشے ۱۵ عکسی تصاویر ہیں جو لندن کے مشہور کارخانہ لانگ مین گرین اینڈ کمپنی سے بنوائی گئی ہیں۔ کتاب کا انتساب نظام حیدر آباد ہزھائی نس میر محبوب علی خان بہادر کے نام کیا گیا ہے۔ لارڈ کرزن کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے، جنھوں نے ظفر علی خاں کو اپنی تصنیف کا ترجمہ کرنے کی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی۔ دیباچے میں اس کتاب کے ترجمے کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردوئے معلیٰ میں لارڈ کرزن کی تصنیف جیسی جامع اور فاضلانہ کتاب تو کجا کوئی ایسی معمولی تصنیف بھی موجود نہ تھی جو ایران کے حالات پر آج کل کے زمانے کے مذاق کے موافق روشنی ڈالتی اور اس لیے جب میرے مخدوم محترم جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔اے سابق ہوم سیکرٹری و حال ڈپٹی کمشنر علاقہ سرکار آصفیہ نے مجھ کو ہز اکسلنسی لارڈ کرزن کی کتاب کے ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا تو میں نے بہ شوق تمام اُن کی تجویز پر عمل کیا۔"

پھر لکھتے ہیں:

"اصل کتاب کے بعض ابواب کا آغاز کسی استاد کی نظم سے ہوا ہے، میں نے نظم کا نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

جہاں جہاں ضرورت پیش آئی ہے ، میں نے متن پر اپنی طرف سے حاشیے بھی لکھے ہیں ۔"

"خیابان فارس" کا جستہ جستہ ترجمہ دیکھ کر نواب مرزا داغ دہلوی نے اس پر ایک تقریظ بھی لکھی ، جس میں ظفر علی خاں کی زبان و بیان پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا :

"مولوی ظفر علی خاں کو میں مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ کتاب باعتبار لطف زبان بجائے ترجمے کے اصل کتاب معلوم ہوتی ہے ۔ سلسلۂ بیان اس قدر با ربط اور ایسا سلیس ہے کہ ایک انگریزی خواں نوجوان اور وہ بھی متوطن پنجاب ہو ، اس سے ایسی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسی اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اردو میں اتنی ضخیم اور مبسوط کتاب کا ترجمہ بے تکلف کرنے پر قادر ہوسکے گا۔"

[بحوالہ انشاے داغ ، مرتبہ احسن مارہروی ، دہلی ۱۹۴۱ع]

۲۔ معرکۂ مذہب و سائنس :

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر (۱۸۱۱-۱۸۸۲ع) کی تصنیف 'A History of the Conflict between Religion and Science کا بامحاورہ اُردو ترجمہ ہے ، جو نواب محسن الملک کے ایما پر ظفر علی خاں نے دوران قیام بمبئی ۱۸۹۵ع میں کیا ، اور نظر ثانی کے بعد ۱۹۱۰ع میں پنجاب سے شائع ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کامیاب ترجمے پر ظفر علی خاں کو پانچ سو روپے کا انعام دیا ۔ نواب محسن الملک کے نام انتساب

کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں صاحب مرحوم و مغفور جن کا نام مسلمانان ہند کی علمی تاریخ میں آب زر سے لکھا جا چکا ہے پہلے شخص تھے، جن کی تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا ۔ اس لیے میں اس کتاب کو جو اب نظر ثانی کے بعد شائع کی جا رہی ہے، اُن کے نام معنون کرتا ہوں۔'' [۵ مارچ ۱۹۱۰ع]

مولانا الطاف حسین حالی، ظفر علی خاں کے نام ایک خط (مؤرخہ ۱۵ اگست ۱۹۱۰ع) میں لکھتے ہیں :

''معرکۂ مذہب و سائنس کی نسبت بلحاظ ترجمہ کی خوبی کے جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے اس کو میں مبالغے سے بالکل پاک سمجھتا ہوں، اور ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کو میں آپ کی اعلیٰ درجہ کی قوت ممیزہ کی ایک روشن علامت سمجھتا ہوں ۔ اس باب میں جو خط میں نے پہلے لکھا تھا اُس کا جواب آنے پر جس طرح ہو سکا میں نے جستہ جستہ اس بے مثل کتاب کے اکثر حصے دیکھے اور اگر کچھ روز زندگی نے وفا کی تو جب موقع ملے گا، اس کو بار بار دیکھوں گا۔''

[بحوالہ پنجاب ریویو، جلد ۱ نمبر ۲، بابت ستمبر ۱۹۱۰ع]

اصل کتاب کے ترجمے سے پہلے تین مبسوط دیباچے ہیں۔ پہلا مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب کا ہے، جو ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور جس میں مذہب اور سائنس کے بادی النظر اختلافات کا محاکمہ کرنے کے بعد اسلام کے محاسن و فضائل کا اظہار ایک دلآویز پیرائے میں کیا گیا ہے۔ دوسرا دیباچہ مترجم کا اپنا ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر ولیم ڈریپر کے حالات زندگی بیان کرنے کے علاوہ کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا دیباچہ کتاب کے مصنف کا ہے۔ کتاب کے متن میں مترجم نے مصنف کی بعض آراء سے اختلاف کرتے ہوئے اور بعض مسائل کی اپنے نقطۂ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے حواشی بھی لکھے ہیں۔ خاتمے پر مصطلحات علمیہ کی (جو کتاب میں آئی ہیں) ایک فرہنگ پیش کی گئی ہے۔ کتاب کی ضخامت (دیباچوں کے علاوہ) ۲۸۶ صفحات ہے۔ ایک بار ہی چھپی، اب نایاب ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے الندوہ (جلد ۷ نمبر ۸ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ) میں ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پر ایک طویل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں۔ ان کی کتاب ''خیابان فارس'' متداول ہو چکی ہے ''دکن ریویو'' نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا، اس لیے ترجمے کی صحت اور

غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا ... مترجم صاحب اگرچہ بہت متین لکھنے والے ہیں لیکن کہیں کہیں سخیف محاورے آگئے ہیں، جو ایک علمی کتاب کے شایان نہیں ۔ مثلاً دم دبا کر، اڑنگے پر چڑھا کر وغیرہ وغیرہ ۔ مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے انہوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے، اور اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں ۔"

[بحوالہ مقالات شبلی، جلد چہارم، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ع]

۳۔ جنگل میں منگل :

انگریزی کے صاحب طرز ادیب رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور تصنیف The Jungle Book کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے، جسے ظفر علی خاں نے دوران قیام حیدر آباد (دکن) ۱۹۰۱ع میں ایک مہینے سے کچھ زیادہ عرصے میں اردو کا لباس پہنایا ۔ اس کتاب میں جانوروں کے بارے میں دل چسپ قصے خیالی کہانیوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، اور ہر قصے سے ایسے اخلاقی نتائج ضمنی طور پر مترتب ہوتے ہیں جن پر کاربند ہو کر انسان بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ ظفر علی خاں نے اس کے ترجمے میں کپلنگ کے دلچسپ طرز

کو بڑے دلآویز پیرائے میں اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب ایک عرصے تک خاصی مقبول رہی۔ ۱۹۴ صفحات کی اس کتاب کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۴۔ سیر ظلمات :

رائیڈر ہیگرڈ کے ناول "The People of the Mist" کو ظفر علی خاں نے دوران قیام حیدرآباد مولوی عزیز مرزا کی تحریک پر اردو میں منتقل کیا۔ مولوی عزیز مرزا ''سیر ظلمات'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو علم ادب انگریزی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں، ترجمہ ایسی خوبی سے کیا ہے کہ باوجود مصنف کے زور بیان کے قائم رکھنے کے اردوے معلیٰ کے روز مرہ محاوروں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور یہی اصل تعریف ترجمہ کی ہے۔''

ضخامت ۴۲۴ صفحات، اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوے۔

۵۔ اسرار لندن :

"Mystries of the Court of London" کا ترجمہ جو ظفر علی خاں نے دوران قیام حیدرآباد (دکن) کیا اور اپنے ماہوار رسالہ ''افسانہ'' اور ''دکن ریویو'' میں بالاقساط شائع کیا۔ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اب یہ نایاب ہے۔

۶- جنگ روس و جاپان (ڈراما) :

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں عالمی سیاسیات پر روس پر جاپان کی فتح نے جو عالمگیر اثر ڈالا، اُس سے متأثر ہو کر ظفر علی خاں نے ایک ڈراما لکھا، جس میں ابتدائے جنگ سے قیام امن و صلح تک کے واقعات ڈرامے کی شکل میں ترتیب دیے۔ ڈرامے کے کل چار ایکٹ ہیں اور ۳۹ سین، جن میں ڈرامے کی کسی وحدت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ دراصل یہ محض ایک ادبی ڈراما ہے۔ دکن ریویو کے نمبر۹-۱۰-۱۱-۱۲ جلد سوم میں شائع ہوا۔ ۱۹۰۵ع میں حیدرآباد سے اور دوسری بار ۱۹۱۴ع میں اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ ضخامت ۱۹۱ صفحات، دیباچہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے، سید بادشاہ حسین مؤلف ''اردو میں ڈرامانگاری'' لکھتے ہیں :

''مصنف نے جاپانیوں کی قوم پرستی اور جذبۂ وفا شعاری کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس سے اصل مقصد یہ تھا کہ جاپانیوں کی قوم پرستی کے افسانہ سے ہندوستانی سبق حاصل کریں، اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے کمر کسیں۔ ضعیف بیوہ کا خودکشی کرنا محض اس خیال سے کہ اپنے لڑکے ''اوکیو'' کو ماں سے زیادہ قوم اور ملک کی خدمت کا موقع ملے اور اس نوجوان کا دھیان صرف قوم اور ملک کی طرف رہے اور اس کے

پیش نظر سوائے ملکی خدمت کے اور کوئی کام نہ رہے۔ طفل مکتب کا مدرسہ کے اوقات کے بعد مٹھائی بیچ کر جنگی فنڈ میں روپیہ دینا، غلام ہندوستان اور سست ہندوستانیوں کے لیے محیرالعقول ضرور ہیں، لیکن ان واقعات سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ ڈراما بہت طویل ہے اور اسٹیج کے لیے نہیں لکھا گیا۔ حسن و عشق کا چٹخارا برائے نام ہے۔ نظم و نثر ملے جلے ہیں لیکن پرانی طرز کا بھونڈا پن نمایاں نہیں کیونکہ ظفر علی خاں جس طرح ایک بلند پایہ نثر نویس ہیں اسی طرح بہت اچھے شاعر۔''

[اردو میں ڈراما نگاری، سید بادشاہ حسین، صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷]

۷۔ علامہ جمال‌الدین افغانی:

پروفیسر ای۔جی براؤن کی تصنیف Persian Revolution کے پہلے باب کا ترجمہ، جس میں سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالباً ۱۹۱۱ع کے قریب ترجمہ ہو کر ''زمیندار'' میں شائع ہوا، پھر جارج سٹیم پریس لاہور سے کتابچے کی صورت میں چھپا۔ ضخامت ۳۶ صفحات۔

۸۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر:

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے ایک انگریزی خطبے کا ترجمہ ہے۔ یہ خطبہ علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ع کے آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔ ظفر علی

خاں نے یہ ترجمہ مئی ۱۹۱۱ع میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں پڑھا ۔ علامہ اقبال بھی اس جلسے میں شریک تھے ۔ پہلے ''پنجاب ریویو'' میں چھپا ، بعد میں اسے کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا ۔ ضخامت ۳۲ صفحات ۔

۹۔ سیری عینک :

مشہور امریکی افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے، جو ''ستارۂ صبح'' شمارہ ۲۱،۲۲ میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور بعد میں کتابچے کی صورت میں چھپا ۔

۱۰۔ معاشرت :

پانچ افسانوں و ڈراموں کا مجموعہ ہے ، جو دکن ریویو، زمیندار اور پنجاب ریویو میں شائع ہوئے : ۱۔ ڈاکٹر ہیڈگر کا تجربہ ۲۔ نازلی بیگم کا فیصلہ (ڈراما) ۳۔ پردہ کا جنازہ ۴۔ انگریزی زندگی کی ایک دلربا جھلک ۵۔ تولہ بھر ریڈیم، ان ڈراموں اور افسانوں کو معاشرتی اصلاحی نقطہ نظر سے طنز و ظرافت کے پیرائے میں لکھا گیا ہے ۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ، ضخامت ۸۸ صفحات ۔

۱۱۔ روح معانی :

ظفر علی خاں کی دو تقریروں (پیغام عمل اور خطبۂ صدارت خلافت کانفرنس برہان پور) اور چند متفرق منظومات پر مشتمل ہے ۔ پیغام عمل میں معاشرتی اور معاشی حالات کی روشنی میں ہندوستانیوں اور خصوصاً زمینداروں کو چند

نصیحتیں کی گئی ہیں ۔ خطبۂ صدارت میں خلافت عثمانیہ اور دول یورپ کی بد عہدیوں اور اسلامی ممالک کی سیاست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطبوعہ لاہور، ۱۳۳۹ھ، ضخامت ۹۶ صفحات ۔

۱۲- غلبۂ روم :

قرآن مجید کی سورۂ روم کی ابتدائی آیات کی تفسیر ایران اور روم کی جنگ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ یہ جنگ ابتدائے عہد اسلام میں ہرقل قیصر روم اور خسرو پرویز کسریٰ ایران کے درمیان ہوئی اور اول الذکر کو اس میں غلبہ حاصل ہوا تھا ۔ منٹگمری جیل میں تصنیف ہوئی اور ۱۹۲۶ع میں لاہور سے طبع ہو کر شائع ہوئی ۔

۱۳- لطائف الادب :

تاریخی ، ادبی ، سیاسی اور دینی مسائل پر چند مقالات کا مجموعہ ، جو ظفر علی خاں نے منٹگمری جیل میں سپرد قلم کیے ۔ مضامین یہ ہیں : ۱- بخت نصر کا خواب ۲- تغلق تیمور خاں کا اسلام ۳- تحریک اتحاد تورانی ۴- دوئی کا درخت ۵- العقبہ ۶- صلاح الدین اعظم کا ذکر بزم فرنگ میں ۷- مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار ۸- ایک تاریخی معجزہ ۹- تصریحات مونسرات ۔

یہ مقالات ظفر علی خاں کے مخصوص طرز نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں - ۱۹۲۵ع میں منصورؔ سٹیم پریس لاہور میں

چھپ کر شائع ہوئی، ضخامت ۹۲ صفحات ۔

۱۴۔ حقیقت و افسانہ :

اُن مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو "ستارۂ صبح" کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ اس مجموعے میں ذیل کے مضامین شامل ہیں : (۱) وقائع خلیفہ واثق باللہ عباسی ، داستان بیکفرڈ کا جائزہ (۲) الف لیلہ کا یورپی بچہ (۳) اسماء بنت شہاب (۴) تصریحات مونسرات (۵) سومنات اور محمود (۶) اسلام کے غلامان غلام ، حسین ابن اسامہ یمن کا حبشی حکمران (۷) قوت جاذبۂ مقناطیسیۂ حیوانیہ

علامہ شبلی نعمانی کے نام انتساب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"علامہ شبلی نعمانی (نوراللہ مرقدہ) نے اپنی شمع علم سے تاریخ و تحقیق ، حقائق و معارف اور علم و ادب کی جو عالم افروز روشنی پھیلائی ہے اس کی جھلک سے ہندوستان کا دماغ بصیرت منور ہو رہا ہے ۔ یہ اتنا بڑا احسان ہے، جس کے اعتراف کے طور پر میں "حقیقت و افسانہ" کے چند صفحات علامہ مرحوم کے نام نامی سے منسوب کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں ۔"

(کرم آباد ۱۷ جولائی ۱۹۴۰ع)

عالمگیر برقی پریس لاهور سے منصور پبلیکیشنز نے شائع کی ۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات ۔

۱۵- حقائق و معارف :

"ستارۂ صبح" کے چند مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے -
۱- کفر و ایمان کا جھگڑا (تصوف اور شریعت کے مسائل اور غلط اندیش صوفیوں کے عقائد باطلہ پر تبصرہ ہے) ۲- سلسلۂ ادبیات اسلام (اسلامی ادیبوں کی خدمات اور ان کے فنی محاسن کا جائزہ لیا گیا ہے) ۳- مروج الذہب (تاریخی) ۴- غلامان اسلام، ملک عنبر حبشی وزیر دکن (تاریخی) ۵- الہام کے ذریعے سے مسمریزم (امریکی ادیب "ایڈگرایلن پو" کے ایک مضمون کا ترجمہ) - عالمگیر برقی پریس لاہور سے طبع ہوئی - ضخامت ۲۰۰ صفحات -

۱۶- جواہرالادب :

"ستارۂ صبح" کے چند مضامین و مقالات کا مجموعہ -
[اخباری ادارے اور فکاہات ان نثری مجموعوں کے علاوہ ہیں جو بے شمار ہیں] -

تصانیف و تراجم (انگریزی)

۱۷- پریس ایکٹ :

انگلستان کے زمانۂ قیام (۱۹۱۳ع) میں انڈین پریس ایکٹ کی قباحتوں کو واضح کرنے کے لیے ایک سو صفحے کا کتابچہ لکھ کر شائع کیا جو خاصا مقبول ہوا -

۱۸- فاروق اعظم :

شمس العلما سید علی بلگرامی کے ایما پر ۱۹۰۰ع میں شبلی

نعمانی کی مشہور تصنیف ''الفاروق'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا - اس ترجمے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"I have undertaken the translation of this work with the object of bringing before the English-reading public the life of a man with whose history they are not acquainted to the extent which his greatness entitles him."

['Al-Farooq'. Translator's preface, p. xix]

باهتمام شیخ محمد اشرف (کشمیری بازار) ۱۹۳۹ع میں چھپی - صفحات ۳۰۷ ، مع ایک نقشہ رنگین بلاد اسلامیہ -

۱۹- مقالات ظفر علی خاں :

ان انگریزی مضامین پر مشتمل ھے جو ظفر علی خاں نے مختلف اوقات میں السٹریٹڈ ویکلی اور ٹائمز آف انڈیا (بمبئی) میں لکھے - ان مقالات کو بمبئی کی ایک پبلشنگ کمپنی نے ۱۹۰۹ع میں کتابی صورت میں شائع کیا - اب نایاب ھے -

شعری مجموعے

۲۰- شور محشر :

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں رود موسیٰ کی طغیانی (۱۹۰۵ع) کے موقع پر لکھی گئی اور ھزاروں کی تعداد میں چھپی - اس کی آمدنی سیلاب زدگان کی امداد کے لیے وقف تھی - اب نایاب ھے - مخزن (جنوری ۱۹۰۹ع) میں بھی چھپی ' جہاں سے نقل کرکے اس کتاب کے آخر میں پیش کر دی گئی ھے -

۲۱- حبسیات :

اُن نظموں کا مجموعہ ہے جو ظفر علی خاں نے دوران قید فرنگ منٹگمری جیل میں رقم کیں - ۱۹۲۶ع میں منصور اسٹیم پریس لاہور سے طبع ہوئی، ۹۷ نظمیں، ضخامت ۱۰۸ صفحات -

۲۲- بہارستان :

ظفر علی خاں کی مختلف النوع ۶/۰ منظومات کا ضخیم مجموعہ ''بہارستان'' کے نام سے شائع ہوا - نظموں کو مختلف عنوانات کے تحت اکٹھا کیا گیا ہے - سب سے پہلے صفحہ اول پر مولانا حالی کی نظم ہے جس میں اُنھوں نے ظفر علی خاں کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے - اس کے بعد حمد اور نعت کے مضامین ہیں - پھر اسلامی روایات پر تاریخی نظمیں، اسلامی نغمے، متصوفین، مغربی تہذیب، آویزش ہلال و صلیب، سلاطین اسلام، زمیندار، سیاسیات ہند، اتحاد بین الہنود و المسلمین، شدھی اور سنگھٹن، اختلافات، قادیانی فرقہ، علمی اور اخلاقی نظمیں، فکاہات اور نوحے شامل ہیں - اس مجموعے میں ۱۹۳۵ع تک کی بیشتر نظموں کو جمع کیا گیا ہے - ترتیب ظفر علی خاں کی اپنی ہے - اردو اکیڈمی پنجاب نے ۱۹۳۷ع میں شائع کیا - ضخامت ۸۲۸ صفحات -

۲۳- نگارستان :

اس مجموعے میں وہ نظمیں شامل ہیں جو ''ستارۂ صبح''

کے صفحات کی زینت بنی تھیں۔ علاوہ برین ۱۹۳۶ع تک کی سیاسی منظومات بھی اس میں جمع کر دی گئی ھیں۔ ناشر: پبلشرز یونائیٹڈ، مطبوعہ لاھور۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات، ۱۸۱ نظمیں۔

۲۴۔ چمنستان:

''نگارستان'' کے مجموعے کو مرتب کرتے ھوئے ظفر علی خاں نے یہ شعر کہا تھا:

''بہارستان'' کے بعد آئے ''نگارستان'' کی باری
تو مجموعہ مرے اشعار کا نایاب ھو جائے

لیکن مسلم لیگ میں شامل ھونے کے بعد جو ھنگامی اور سیاسی نظمیں کہیں، انھیں ایک تیسرے مجموعے ''چمنستان'' کی زینت بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۴ع میں پبلشرز یونائیٹڈ لاھور نے طبع کی۔ ۲۳۳ نظمیں، ضخامت ۲۸۴ صفحات۔

۲۵۔ ارسغان قادیان:

آن منظومات اور نثری مقالات کا مجموعہ ھے جو ظفر علی خاں نے ''ستارۂ صبح'' میں قادیانی فرقے کے متعلق لکھے۔

[علاوہ برین بہت سا کلام ایسا بھی ھے جو مختلف مواقع پر فی البدیہہ کہا گیا اور محفوظ نہ رہ سکا]۔

چوتھا باب

ظفر علی خاں کی شاعری

ظفر علی خاں کا شاعرانہ نقطۂ نظر

شاعری کی تعریف مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مذاق سخن اور اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق کی ہے لیکن اس کی جامع و مانع تعریف آج تک کوئی پیش کر نہیں سکا۔ یہ بات اتنی آسان ہے بھی نہیں، اس لیے کہ روحانی واردات و کیفیات کے ناپنے کا کوئی پیمانہ تاحال ایجاد نہیں ہوسکا۔ شاعری بھی جذباتی کیفیات اور روحانی واردات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک وہبی قوت ہے، جسے تخلیق کے مرحلوں سے گزرنے کے لیے اکتساب و ریاض کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان پر عبور اور فنی اسالیب پر قدرت کے لیے جہاں شعری روایت سے باخبر ہونا ضروری ہے، وہاں اردو میں استادی شاگردی کا سلسلہ بھی اکتساب و ریاض کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔ بہر کیف یہ میکانکی عمل شعری تخلیق میں بعد کی چیز ہے، بنیادی حقیقت شاعر کا جذبہ اور تجربہ ہے۔ اگر اس میں خلوص اور صداقت ہے تو اظہار و بیان کا میکانکی عمل سونے پر سہاگے کا کام دے سکتا ہے۔

آتش کے یہ دو شعر اس سلسلۂ عمل کے دونوں پہلوؤں کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں :

کھینچ دیتا ہے شبیہہ شعر کا خاکہ خیال
فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا
بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کی مدح و ذم میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی مدح کرنے والوں نے اسے الہام و القا کی ارفع منزلوں کا رہرو قرار دیا ہے، تو اس کی مذمت کرنے والوں نے اسے کذب و افترا کا دفتر کہتے ہوئے انسانی فکر و عمل کے لیے مضرت رساں قرار دیا ہے۔ تاہم اس جادوے سخن کی تاثیر ہر زمانے کے انسان کو وارفتہ کرتی رہی ہے، اور اکثر موقعوں پر اس سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ نغمہ و آہنگ جو شاعری کے اہم اجزا ہیں، روح انسانی سے کچھ ایسی مطابقت رکھتے ہیں کہ انسان، خوشی میں ہو یا رنج میں، ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دور جدید میں بھی، جبکہ انسان زیادہ سے زیادہ مشین زدہ ہوتا جارہا ہے، شاعری حیات انسانی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے، اور اس نے اپنی ہمہ گیر اثر آفرینی سے ان سب دعوں کو باطل قرار دے دیا ہے کہ جوں جوں سائنس پھیلتی جائے گی، شاعری قعر گمنامی میں غرق ہوتی جائے گی۔ شاعری نقد و جرح کی ان صبر آزما منزلوں اور دلشکن مرحلوں سے گزر

کر اب بھی زندہ و تابندہ ہے، اور اپنی بے پناہ قوت تاثیر کا لوہا دنیا سے منوا رہی ہے۔

شاعری انسان کی روز مرہ زندگی کے مسائل سے لے کر اس کی روحانی و باطنی کشمکش کی ترجمان اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ شاعر، جنھیں قدرت کی طرف سے یہ عطیۂ خداوندی ارزانی ہوا ہے، بدن اور روح کی اس کشمکش میں انسانی فکر و عمل کے نقیب کہے جاسکتے ہیں۔ افلاطون نے انھیں اپنی مثالی ریاست سے نکال باہر کیا تھا۔ لیکن ایسی مثالی ریاست اگر وجود میں آ جاتی، تو شاید اس کی روح شاعر کے بغیر ہمیشہ بھٹکتی رہتی۔ شعر و سخن کی ماہیت کے بارے میں دوسرے نقادوں یا سخنوروں کے خیالات پیش کرنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظفر علی خاں ہی کے نقطۂ نظر کو پیش کردیا جائے:

شعر کیا ہے؟ خیال کی تصویر — بال اور اس کی کھال کی تصویر
نہ فقط نقش عارض زیبا — نہ فقط خط و خال کی تصویر
بلکہ کل کائنات کی رونق — اور اس کے جمال کی تصویر
سوز کی اور ساز کی تمثال — ہجر کی اور وصال کی تصویر
ملتوں کی حیات کا نقشہ — امتوں کے مآل کی تصویر
چند الفاظ دلکش آ جائیں — بن کے سحر حلال کی تصویر

ظفر علی خاں کا یہ نقطۂ نظر شاعری کی فنی اہمیت سے لے کر اس کی سماجی قدر و قیمت تک، سب امور کی نشاندھی کرتا ہے۔

قدیم اردو شاعری کے بارے میں یہ نظریہ تو درست نہیں

کہ یہ محض گل و بلبل کے استعاروں میں حسن و عشق کے افسانوں تک محدود ہے - کیونکہ قدیم زمانے کے شعراء اپنے مخصوص معاشرتی و تہذیبی حالات اور اسالیب فن کے مطابق مسائل حیات سے عہدہ برآ ہوتے رہے - البتہ یہ درست ہے کہ ان کا طریق کار موضوعی (Subjective) زیادہ تھا ، معروضی (Objective) کم تھا - محبوب کی ستم شعاری کا ذکر ہو ، یا اس کے حسن بہار آفریں کا بیان ہو ، شاعروں نے حسن و عشق کی حکایتوں کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی شکایتوں کو بھی اپنے فن میں پیش کیا ہے - بقول میر :

اس ستم گر ہی سے کنایت ہے　　دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ

اور کبھی کبھی تو استعاروں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور خالص معروضی نقطۂ نظر سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا گیا ہے - کیونکہ ایک فن کار کے لیے لذت احساس سے آشنا ہونے اور رموز ہستی سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد بے حسی کی زندگی بسر کرنا یا سطحی تفریحات میں مبتلا رہنا ممکن نہیں - بقول مرزا رفیع سودا :

سودا جو بے خبر ہے کوئی وہ کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے اُن کو جو رکھتے ہیں آگہی

اس لیے شعرا نے اپنے عہد کے سماجی کوائف جہاں غزل کے دروں بیں پیرائے میں بیان کیے ہیں ، وہاں ان کوائف کا جائزہ شہر آشوبوں ، ہجویہ نظموں اور قطعوں وغیرہ میں بھی

لیا ہے ۔ اس دور کی سماجی زندگی میں کسی اجتماعی تحریک کے نہ ہونے کی وجہ سے شاعروں کا یہ طریق کار بھی انفرادی ہی تھا ، جو اس زمانے کے زوال پذیر جاگیر دارانہ نظام کی خرابیوں اور کوتاہیوں کو محسوس کرنے کے باوجود اسی نظام میں فلاح و بہبود کی جستجو کرتا تھا ۔ غالب اور مومن کا دور اس قدیم نظام تمدن کے خاتمے کا دور تھا ۔ غالب غزل کی گلو گرفتگی کا احساس کرکے اپنے بیان کی وسعت کے لیے اور پیمانوں کے آرزو مند نظر آتے ہیں ۔ مومن اپنے شوق جہاد کے لیے مثنوی (ساقی نامے) کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں ، لیکن پھر بھی غزل ہی ان شاعروں کے آتشیں جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے ۔ صدیوں کے بنے بنائے نظام کو توڑنا اور اپنے تہذیبی دوائر سے باہر نکلنا غالب اور مومن جیسے فن کاروں کے لیے بھی ممکن نہ تھا ۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے یہ تہذیبی بساط ہی الٹ دی اور بقول اقبال :

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

کے مصداق اُردو شاعری بھی نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے لگی اور نئے موضوعات کے علاوہ اظہار و بیان کے نئے اسالیب کو قبول کرنے لگی ۔ بقول اکبر الہ آبادی :

چھوڑ دہلی ، لکھنئو سے بھی نہ کچھ اُمید کر
نظم میں بھی وعظ آزادی کی اب تائید کر
صاف ہے ، روشن ہے اور ہے صاحب سوز و گداز
شاعری میں بس زبان شمع کی تقلید کر

شاعری کے قدیم مراکز اجڑنے پر نئے نئے مراکز قائم ہوئے، جن میں لاہور کے علمی، ادبی و شعری مرکز کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔ انجمن پنجاب نے مئی ۱۸۷۴ء میں لاہور میں نئی طرز کے مشاعروں کا آغاز کیا جن کے موضوعات میں عصری تقاضوں کا لحاظ رکھا جاتا تھا ۔ آزاد اور حالی شاعری کی اس تحریک کو پروان چڑھانے میں پیش پیش تھے ۔ مولانا حالی لاہور سے دہلی چلے گئے تو وہاں انھوں نے سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے نقیب خصوصی بن کر ملّی شاعری کا آغاز کیا ۔ مد و جذر اسلام اردو کی ملّی شاعری کا پہلا عظیم الشان کارنامہ تھا جس نے شعری رجحانات کو متأثر کرنے کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے تعلیمی، معاشی و معاشرتی مقاصد کو مسلمان عوام میں خاصا مقبول بنایا ۔ اردو شاعری میں مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کے نقشے کھینچنے کے علاوہ تاریخ ماضی کے عظیم کارناموں کو پیش کیا جانے لگا ۔ اودھ پنچ کے حلقے کے ادیب و شاعر بھی معاشرتی اصلاح کے مختلف مسائل کو موضوع بحث بنا کر تہذیبی و معاشرتی انتشار کو طنز و ظرافت کے پیرائے میں بیان کر رہے تھے ۔ لاہور میں انجمن پنجاب کے مشاعرے کچھ عرصے تک چلے اور پھر ختم ہوگئے، لیکن انجمن نے لاہور اور پنجاب کے بعض دوسرے شہروں اور قصبوں میں جو علمی و ادبی روح پھونکی، اس کے نتیجے میں نئی شاعری کا سلسلہ جاری رہا ۔ لاہور کا چیلسی یعنی بازار

حکیماں بہت سے ادیبوں و شاعروں اور اورینٹل کالج کے استادوں کا مسکن تھا ۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں یہ بازار شعری و ادبی مجلسوں کے لیے خاصا مشہور ہے ۔ اقبال کی شاعری بھی اسی ماحول میں پھلی پھولی ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے علاوہ انجمن حمایت اسلام لاهور کے جلسوں نے بھی قومی و ملّی شاعری کے سلسلے کو بہت تقویت پہنچائی ۔ بیسویں صدی کے ادبی رسائل مخزن، زمانه، دکن ریویو ، پنجاب ریویو ، ادیب اور معارف وغیرہ بھی جدید شعری رجحانات کو فروغ دینے میں بڑی اہمیت رکھتے هیں ۔

نئی صدی کے آغاز میں جہاں اردو شاعری میں قومی ، ملّی اور سیاسی موضوعات کو بڑی اهمیت دی جا رهی تھی اور سیاسی محکومی کے تلخ احساس اور مختلف معاشرتی و تہذیبی مسائل پر شعرا طبع آزمائی کر رہے تھے ، وهاں نئی نسل کے بعض ادیب و شاعر زندگی کے حقیقی مسائل سے گریز اختیار کرکے حسن و عشق کی رومانی فضاؤں میں گم هو رہے تھے ۔ ادبیات اردو میں رومانی تحریک کے فروغ کا زمانہ بھی وهی هے جس میں قومی شعرا اپنے رزمیہ نغموں سے جمہور کے دلوں میں ولولۂ انقلاب کی تازہ روح پھونک رہے تھے ۔ در حقیقت اس رومانی ادبی تحریک هی کے یہ دو نمایاں رخ تھے ۔ رومانی ادبی تحریک کا ایک رخ وہ تھا جو عقل سے زیادہ جذبے کو

اھمیت دے رھا تھا اور عقل اور جذبے کے امتزاج سے زندگی میں ھنگامۂ عمل کی صورت پیدا کررھا تھا۔ شاعری میں اقبال، چکبست، سرور اور ظفر علی خاں اسی رجحان کے نمائندے تھے۔ دوسرا رخ جذبے اور تخیل کی اُن خواب آلود فضاؤں کو پیش کر رھا تھا جو زندگی اور مسائل حیات سے گریز و فرار کا گہوارہ تھیں۔ اس رومانی سلسلے کو ۱۹۳۵ع میں ترقی پسند تحریک نے حقیقت و انقلاب کی طرف موڑا، اور رومانی شعرا و ادباء اپنی بنائی ھوئی خواب آلود فضاؤں سے دفعتاً نکل کر انقلاب، انقلاب کے بلند آھنگ نعرے لگانے لگے۔ ادبیات اردو کی رومانی تحریک اور ترقی پسند تحریک کے درمیان اقبال اور ظفر علی خاں کے شعری دبستان کی یہ خاص اھمیت ھے کہ ان شاعروں نے اپنی شاعری میں سیاسی اور سماجی مسائل کو موضوع شعر بنانے کے ساتھ ساتھ غیر معتدل رومانی ادبی رجحانات پر تنقید کرکے ادب اور زندگی کے رشتوں کو جوڑنے کی بھی از بس کوشش کی۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جابجا شعر و سخن کی عمرانی حیثیت کو واضح کیا ھے۔ ان کے یہ اشعار براہ راست رومانی رجحان کے ادیبوں و شاعروں کے مسلک پر بھرپور طنز ھیں:

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ظفرعلی خاں نے بھی اپنی شاعری میں جابجا اسی نقطۂ نظر

سے اپنے ہم عصر شاعروں و ادیبوں کو ان کے فنی اور معاشرتی فرائض سے آگاہ کیا ہے۔ ذیل کے قطعے "سخنوران عہد سے خطاب" میں جن امور کو پیش کیا گیا ہے، کوئی بڑی سے بڑی ترقی پسند تحریک بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ قطعہ ۱۹۲۹ع کا ہے:

اے نکتہ وران سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گران چمنستان معانی
مانا کہ دل افروز ہے افسانۂ عذرا
مانا کہ دل آویز ہے سلمیٰ کی کہانی
مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلہ میں عہد جوانی
گرمائے گا یہ ہمہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی
مانا کہ ہیں آپ اپنے زمانہ کے نظیری
مانا کہ ہر ایک آپ میں ہے عرفی ثانی
مانا کہ حدیث خط و رخسار کے آگے
بیکار ہے مشائیوں کی فلسفہ دانی
مانا کہ یہی زلف و خط و خال کی روداد
ہے مایۂ گلکاریٔ ایوان معانی
لیکن کبھی اس بات کو بھی آپ نے سوچا
یہ آپ کی تقویم ہے صدیوں کی پرانی
معشوق نئے بزم نئی رنگ نیا ہے
پیدا نئے خامے ہوئے ہیں اور نئے مانی
مژگاں کی سناں کے عوض اب سنتی ہے محفل
کانٹوں کی کتھا برہنہ پائی کی زبانی
لذت وہ کہاں لعل لب یار میں ہے آج
جو دے رہی ہے پیٹ کے بھوکوں کی کہانی

گلشن میں نوا سنج ہو گیا مرغ خوش الحاں
صیاد کا جب مشغلہ ہے ریشہ دوانی
بدلا ہے زمانہ تو بدلیے روش اپنی
جو قوم ہے بیدار یہ ہے اس کی نشانی
گر شعر ہی کہنا ہے تو اس گرز گراں سے
بنیاد ہمیں چاہیے دنیا کی ہلانی
اے ہم نفسو یاد رہے خوب یہ تم کو
بستی نئی مشرق میں ہمیں کو ہے بسانی

ظفر علی خاں کی شاعری کا آغاز و ارتقا

ظفر علی خاں کے طائر شعر نے پرواز کا انداز علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی ہی میں سیکھ لیا تھا۔ علی گڑھ کی فضا حالی کی پرسوز نواؤں اور شبلی کی پر امید صداؤں سے معمور تھی۔ حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کے پر تاثیر مرقعے جس سوز و درد سے پیش کیے تھے اس نے شعری دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ شعرا اس کی پیروی میں قومی و ملی احساسات کو موضوع شعر بنانے لگے۔ اسی فضا میں ظفر علی خاں کی شاعری کا آغاز ہوا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں داد سخن دینے لگے۔ یہ نظمیں زیادہ تر کالج کی ادبی مجالس میں پڑھی جاتیں۔ آن کے اپنے قول کے مطابق شروع شروع میں انھوں نے غزلوں کی طرف توجہ کی، لیکن ایک مقتدر رہنما کے مفید مشورے پر عمل کرتے ہوئے، غزل سے رخ پھیر کر قومی نظموں کی طرف توجہ کر لی، اور پھر

وہ ہمیشہ اسی روش پر گامزن رہے ۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی دھاک کالج میں بیٹھ گئی ۔ خصوصاً اُن کے ایک قصیدہ پر ' جو انھوں نے سرسید کی مدح میں لکھا اور جس میں سرسید کی قومی خدمات کو سراہا تھا ' اُن کی شہرت عام ہوگئی ۔ ایک قصیدہ ' شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے کی تقریب پر اخوان الصفا اور لجنۃ الادب کے ایک مشترکہ جلسے میں پڑھا ۔ اس جلسے میں بھی کالج کے تمام اکابر موجود تھے ۔

کالج کے بعد ظفر علی خاں کی شاعری کا دوسرا دور ' زمانۂ قیام حیدرآباد ہے ۔ ظفر علی خاں کے شعر و ادب کا یہ دور خالصتاً ادبی دور کہلائے جانے کا مستحق ہے ۔ یہ دور اُن کی پنجاب میں آمد اور روزنامہ "زمیندار" کی ادارت کے سنبھالنے تک محیط ہے ۔ اس دور کی نظمیں "دکن ریویو" اور "مخزن" کے صفحات کی زینت بنتی رہیں ۔ یہ ظفر علی خاں کے شباب کا زمانہ تھا ۔ سیاست کے خار زار میں ابھی انھوں نے قدم نہیں رکھے تھے ' البتہ قومی احساس اور جذبۂ اسلام سے دل سرشار تھا ۔ حیدرآباد میں شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں ۔ داغ دہلوی حیدرآباد میں ملک الشعرا اور شبلی نعمانی ادارۂ معارف کے ناظم تھے ۔ اس ادبی ماحول میں ظفر علی خاں کی تخلیقی صلاحیتیں بڑی تیزی سے بروئے کار آئیں ۔ اس دور میں نثری تراجم کے علاوہ اُن کے بعض شعری تراجم

کو خاص اهمیت حاصل ہے۔ ان تراجم میں ٹینی سن کی نظم ''دی بروک'' اور بائرن کے ''خطاب بہ بحر'' کا ترجمہ ایک کیفیت رکھتا ہے، اور رڈ یارڈ کپلنگ کی بعض نظموں نے تو اردو میں آ کر ایک نئی زندگی پائی ہے۔ ترجمے کے یہ شاهکار ''جنگل میں منگل'' کی زینت هیں۔ ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوگیا تھا۔ ''رود موسیٰ'' کی طغیانی پر انھوں نے جو نظم ''شور محشر'' کے نام سے لکھی اُسے پڑھ کر مولانا حالی اپنے ایک خط مؤرخہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ع میں لکھتے هیں:

''جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا .... سرے هی پر آپ کی نظم جو ''رود موسیٰ'' پر لکھی گئی تھی، نظر پڑی۔ اوّل سے آخر تک بہت غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ پرانی طرز کی نظمیں تو (الا ماشاء اللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاهتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے نئے هوتے هیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاهیے اور جس کو ''جادو'' کے سوا اور کسی لفظ کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا هی تحیر ہوا تھا۔ لیکن اس وقت آپ

کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہوتا ہے، خواہی نخواہی مؤثر اور دلکش ہوتا ہے۔ لیکن رود موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ محض زور طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کبھی کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسماعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا بہ رکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ بشرطیکہ آپ کو فکر معاش دم لینے دے اور یہ چیٹک بھی دل کو لگی رہے۔"[1]

۱۹۰۹ع کے بعد ظفر علی خاں کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جب انہوں نے پنجاب میں آ کر ہفتہ وار "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور ساتھ ہی ماہوار "پنجاب ریویو" جاری کیا۔ لاہور میں علامہ اقبال اور دیگر اکابر کی صحبتوں میں مسلمانوں کے قومی مسائل زیر بحث آتے اور ان ہی مباحث کو شاعری کا جامہ پہنایا جاتا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بیش سے بیش تر ہونے لگیں اور ادبی سرگرمیاں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے جذبات میں اشتعال

۱۔ مکاتیب حالی، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۶۱-۶۲

پیدا کر دیا تو ہنگامی واقعات پر جذبات انگیز نظمیں لکھی جانے لگیں، جو روزنامہ ''زمیندار'' کی زینت بنتی تھیں۔ اخبار بینوں کے لیے یہ نظمیں دلچسپی کا باعث تھیں۔ ان پر جوش نظموں کی بدولت اخبار کی اشاعت بھی بڑھنے لگی۔ ان ہنگامی نظموں میں کبھی کبھی کوئی ایسی نظم بھی تخلیق ہو جاتی تھی جسے موضوع اور طرز ادا کے لحاظ سے کسی مستقل قدر کی حامل کہا جا سکے۔ اس دور کی دو طویل نظمیں ''سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی'' اور ''لندن'' سفر انگلستان کی یادگار ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند تھے اور اُن کی سیاسی اور صحافتی سرگرمیاں ختم کر دی گئی تھیں، تو ۱۹۱۶ع کے اواخر میں انھیں ایک ہفتہ وار علمی جریدہ ''ستارۂ صبح'' نکالنے کی اجازت ملی۔ سیاست اور صحافت کی عدم موجودگی میں یہ ادبی چاٹ بھی انھیں غنیمت نظر آئی۔

''ستارۂ صبح'' کی بیشتر نظموں میں اسلامی تاریخ کے درخشاں واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے اور ظفر علی خاں کی تخلیقی صلاحیتوں نے ان نظموں کے شعری محاسن کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے:

اسلام کی شوکت کا افسانہ سناتا ہوں
کیا اصل حقیقت ہے دارا و سکندر کی

پیغام سحر لایا پھر صبح کا سیارہ
خورشید کے چہرے سے پھر چادر شب سر کی

اس دور کی اکثر نظمیں " بہارستان " اور " نگارستان " کی زینت بنی ہیں ۔ کچھ عرصہ بعد "ستارۂ صبح " لاہور سے نکلنے لگا اور ہفتہ وار کی بجائے روزانہ ہو گیا ۔ شعری موضوعات بھی بدلنے لگے ۔ اہل طریقت سے جنگ چھڑی تو سارے شاعرانہ حربے اسی کی نذر ہونے لگے ۔ قادیانیوں سے معرکہ آرائی شروع ہوئی تو یہ شعری گولہ بارود یہاں کام آنے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ملک میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں تو اس زمانے میں ظفر علی خان کی قومی و سیاسی شاعری اپنے عروج پر پہنچی۔ اس دور کے ہنگامی حالات نے ہندوستانیوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا ۔ ظفر علی خان کے رزمیے اسی ہیجانی کیفیت کی ترجمانی کرنے لگے ۔ اس دور کی بعض قومی و سیاسی نظمیں بڑی اعلیٰ پائے کی ہیں ۔ شاعری اگر اپنے دور کا آئینہ ہوتی ہے ، تو ظفر علی خاں کی اس دور کی شاعری میں ہمیں ہندوستانیوں کے اُبلتے ہوئے جذبات کی بھرپور عکاسی ملے گی۔ اسی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں ظفر علی خاں کو پانچ سال کے لیے منٹگمری جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ زنداں کی تنہائیوں میں شعر و سخن کی ایک اور ہی فضا تخیل میں سما جاتی ہے :

بسکہ تنہائی میں تھا شوق غزل خوانی مجھے
کر دیا قسمت نے انگریزوں کا زندانی مجھے
جو مضامیں آج تک تھے برتر از فکر بلند
بیٹھے بیٹھے سوجھ جاتے ہیں بآسانی مجھے

عرصۂ زنداں کا کلام ''حبسیات'' (طبع ۱۹۲۶ع) کے مجموعے میں پیش کیا گیا ہے - اس میں نعتیں بھی ھیں اور قومی و سیاسی نظمیں اور مختلف موقعوں کی واردات و کیفیات بھی شامل ھیں -

جیل سے باھر آ کر ملکی سیاست اور ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ھوتا ھے جو زیادہ تر ھنگامی و جذباتی ھے - شدھی و سنگھٹن ، تبلیغ و تنظیم ، مسئلہ حجاز پر ھندوستانی مسلمان اکابر کی آپس میں سر پھٹول ، سائمن کمیشن ، تحریک نمک ، تحریک کشمیر ، احرار اور مسجد شہید گنج ، کانگرس اور مسلم لیگ مناقشات ، الیکشن پروپیگنڈہ اور اس قسم کے صدھا فتنے سر اٹھاتے ھیں اور ظفر علی خاں کی شاعری بھی انہی واقعات کی ''منظوم ڈائری'' بن جاتی ھے - یہ ھنگامی نظمیں ''بہارستان'' ، ''نگارستان'' اور ''چمنستان'' کے صفحات پر پھیلی ھوئی ھیں اور حصول پاکستان کی جد و جہد تک کی روداد پر مشتمل ھیں - بعض ھنگامی نظمیں ، جو وقتاً فوقتاً عام جلسوں اور خاص محفلوں میں فی البدیہہ کہی گئیں ، کسی شعری مجموعے میں محفوظ نہ ھو سکیں -

اس دور کی معاصرانہ چشمکیں اور معرکہ آرائیاں بھی

شعری تخلیق کا اہم موضوع بنی ہیں ۔ خصوصاً روزنامہ ''انقلاب'' کے اجراً کے بعد (۱۹۲۸ع میں) جب زمیندار اور انقلاب کا معارضہ شروع ہوا تو دونوں طرف سے شعری گولہ بارود خوب خوب استعمال کیا گیا ۔ ایک طرف انقلاب میں سالک، حفیظ، تاثیر، ہری چند اختر اور بہت سے دوسرے نوجوان شعرا کا گروہ تھا اور دوسری طرف زمیندار میں اکیلے ظفر علی خاں ان سب سے نبرد آزما تھے :

''زمیندار'' ایک، آپ اتنے، مگر اوج سیاست پر
یہ اک تکل لڑے گا آپ کے سارے پتنگوں سے

یہ اشعار اسی زمانے کی تخلیق ہیں :

انقلاب زمانہ دیکھیے گا — کل جو تھے دوست آج ہیں دشمن

مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ — انقلابات ہیں زمانے کے

اس معرکے کا ایک چشم دید واقعہ ہمارے دوست پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی (جو اس زمانے میں زمیندار سے منسلک تھے) کی زبانی سنیے : حرب و ضرب کا میدان گرم تھا کہ ظفر علی خاں کو ایک ہفتہ کے لیے کسی ضروری کام کے سلسلے میں مدراس جانا پڑ گیا ۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (مدیر) گھبرائے ہوئے مولانا کے کمرے میں گئے اور کہا کہ آپ کی غیر حاضری میں کیا ہوگا؟ مولانا نے قدرے توقف کیا اور پھر ملازم کو حقہ لانے کے لیے کہا ۔ تازہ حقہ بھر کر لایا گیا تو مولانا نے فرمایا کہ دو گھنٹے تک میرے کمرے

میں کوئی نہ آئے ۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد مولانا نے میکش صاحب کو بلایا اور سات نظمیں اُن کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ میں آٹھویں روز لاہور پہنچ جاؤں گا !

اس طرح کے بے شمار واقعات اور بھی ہیں جو ظفر علی خاں کی قادرالکلامی اور بدیہہ گوئی کے شاھد ہیں۔ غرض یہ کہ ظفر علی خاں کی شاعری کے ارتقاء کا سلسلہ بر عظیم پاکستان و بھارت کی جد و جہد آزادی کے ساتھ ساتھ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اس تاریخی روداد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ۔

ظفر علی خاں کی شاعری کے موضوعات

ظفر علی خاں کی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے بڑا تنوع ہے ۔ شاعری اور مسائل حیات کے جس ربط پر انھوں نے بڑا زور دیا ہے، وہ اُن کے کلام میں ہر جگہ منعکس ہے ۔ اس سے اُن کی شاعری میں زندگی کی بوقلمونی اور رنگا رنگی ہر جگہ نمایاں ہے ۔ اس تنوع میں ظفر علی خاں کے حالات زندگی، مختلف ادوار کے مشاغل اور ذھنی کیفیات نے بھی اھم حصہ لیا ہے ۔ جب انھیں نسبتاً پرسکون ماحول میسر آتا ہے اور اُن کا ذھن فرصت و فراغت میں داخلی کیفیات اور خارجی مظاھر کا جائزہ لیتا ہے تو اُن کی شاعری میں ان واردات و کیفیات کی جھلک بڑے لطیف اور خوشگوار انداز میں نظر آنے لگتی ہے ۔ اُن کی شاعری میں مناظر قدرت کی عکاسی بھی

ملتی ہے اور ان قدرتی مناظر سے ہم آہنگی کا احساس بھی ۔ قید و بند کی حالت میں فکر و احساس کی کیفیتوں کا اور ہی رنگ ہوتا ہے اور عالم تخییل میں پرواز کلام میں رفعت پیدا کر دیتی ہے ۔ زندگی میں اعزہ و احباب کا داغ مفارقت دے جانا طبع انسانی کے لیے ایک بڑا دلگداز سانحہ ہوتا ہے جس سے انسان جذباتی طور پر بھی بڑا متاثر ہوتا ہے اور فکری لحاظ سے بھی موت و حیات کے تلخ ترین مسئلے پر نظر ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ ظفر علی خاں کی شاعری میں اظہار غم کا یہ موضوع مرثیوں یا نوحوں کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔ مناظر قدرت، حبسیات اور نوحے و مرثیے، یہ وہ موضوعات ہیں جو ظفر علی خاں کی شاعری میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ وقتی کیفیات کے زیر اثر صورت پذیر ہوتے ہیں ۔ اب ہم ظفر علی خاں کے بعض بنیادی موضوعات کا ذکر کرتے ہیں ۔

(۱) حمد و نعت اور تاریخ اسلام کے روشن ماضی کے واقعات کا بیان ظفر علی خاں کا مرکزی موضوع ہے جہاں ان کا خامۂ بہار آفریں عقیدت و محبت کی پہنائیوں میں ڈوب کر گوہر آبدار تلاش کرتا اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے :

خدا کی حمد، پیغمبرؐ کی مدح، اسلام کے قصے
مرے مضموں ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا

جذبۂ محبت شاعری کی تخلیق کا ایک بڑا محرک جذبہ ہے ۔ ظفر علی خاں کی شاعری میں جذبۂ محبت کا روائتی انداز

اپنی جگہ نہ بنا سکا ۔ شروع میں انھوں نے غزل کہنے کی کوشش کی لیکن جذبے کا خلوص مفقود تھا اس لیے حسن و عشق کے معروضی بیان میں وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے ۔ تنگنائے غزل سے انھوں نے کنارا کشی کرلی ۔ مادی جذبۂ محبت کی کمی کو محبت کے ایک دوسرے جذبے نے پورا کیا ، اور یہ جذبہ تھا عشق رسولؐ کا ، جس سے زیادہ بے لوث اور بلند تر جذبہ کوئی اور ہو نہیں سکتا ۔ یہ جذبۂ صادق فن کی لطافتوں کے ساتھ شیروشکر ہو کر جس طرح ظفر علی خاں کی شاعری میں جلوہ‌گر ہوا ، اس کی مثال اردو شاعری تو کیا ، فارسی شاعری میں بھی کم ہی ملتی ہے ۔

(۲) جذبۂ عشق رسولؐ کے ساتھ اسلام اور اسلامی روایات سے والہانہ عقیدت نے ظفر علی خاں کی شاعری میں دینی ، اخلاقی اور تاریخی موضوعات کو بڑی اہمیت دی ہے ۔ شوکت ماضی کے تاریخی افسانوں کے ساتھ ساتھ اتحاد عالم اسلامی کے عصری رجحان نے ان کی شاعری کے ملی پہلو کو قوی‌تر کیا ۔

اس کے بعد ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک بڑا (اور شاید اہم ترین) موضوع (۳) سیاسیات ملکی ہے ۔ خار زار سیاست میں تیزگام ہونے کے بعد ظفر علی خاں کی جوشیلی طبیعت اور مشتعل احساس ہنگامی تحریکات و واقعات سے بہت اثر پذیر ہوتا رہا ، اور اس کا جذباتی ردعمل فوری طور پر شعری جامہ پہن کر سامنے آتا رہا ۔ سیاست اور صحافت کے سلسلوں نے مل

کر ظفر علی خاں کے شعری کینوس کو خاصا وسیع کر دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ آزادی کی جد و جہد کا ہنگامہ خیز دور تھا جس میں آئے دن نت نیا مسئلہ سامنے آ رہا تھا اور ظفر علی خاں اور اُن کی شاعری بھی ان ہنگامی مسائل کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں جن کے سلسلے میں ستیہ گرہ، ہڑتالیں، قید و بند، مارشل لا، حادثہ جلیانوالہ، موپلوں کی شورش، ھجرت، فساد، غرض ہزاروں ہنگامے ظہور میں آئے۔ ظفر علی خاں اس تاریخی جدوجہد میں رہرو ہی نہیں تھے بلکہ ایک رہبر بھی تھے۔ وہ لارڈ بائرن کی طرح اپنے اشعار سے دوسروں کا حوصلہ بھی بڑھاتے جاتے تھے، اور لڑنے والوں کے دوش بدوش سرگرم ستیز بھی تھے۔ فصاحت و بلاغت اور موزونیت طبع کے سہارے وہ اس سارے ہنگامی دور پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد سائمن کمیشن کے مقاطعہ، نمک تحریک، شہید گنج اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں بھی وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں نے ظفر علی خاں سے بہت سی ہنگامی نظمیں لکھوائیں جو وقتی طور پر تو خوب چمکیں لیکن جن کی دیرپائی مشکوک تھی۔ ظفر علی خاں کی شاعری کا بہت سا سرمایہ ایسا ھے جو وقتی اور ہنگامی ہونے کی وجہ سے کسی مستقل قدر کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ظفر علی خاں کا یہ

شعری سرمایہ تاریخ آزادی کی ایک اہم دستاویز ہے جو منظوم یاد داشت کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو ہنگامی حالات کی پیداوار ہونے کے باوجود نقش دوام کی حامل کہی جا سکتی ہیں۔ بساط سیاست اور اس سے وابستہ مختلف شخصیتیں مع اپنے احوال و کوائف کے ظفر علی خاں کی شاعرانہ نقد و نظر کا موضوع بنی ہیں۔ کہیں حکایتیں ہیں تو کہیں شکایتیں، کہیں مدح ہے تو کہیں قدح، کہیں ایک ہی شخص ایک وقت میں مدح کے پھولوں سے لادا جا رہا ہے تو دوسرے وقت میں ہجو کے کانٹوں کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ سب باتیں شاعرانہ شوخیوں اور نکتہ آفرینیوں کے ساتھ ظفر علی خاں کی شاعری میں کچھ اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ اردو ادب کا کوئی طالب علم انہیں نظر انداز کر کے آگے نہیں گزر سکتا۔

اب ہم ظفر علی خاں کی شاعری کا جائزہ مختلف موضوعات کے اعتبار سے لیں گے۔ یہ موضوعات کم و بیش یہ ہیں (۱) حمد و نعت (۲) تاریخی منظومات (۳) مناظر قدرت (۴) نوحے اور مرثیے (۵) حبسیات (٦) سیاسیات اور (۷) طنزیات (۸) ہجویات وغیرہ۔

حمد و نعت :

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت عربی، فارسی اور اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جسے مشرقی ادبیات میں ایک عام رسمی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اس صنف سخن کو قصیدہ گوئی کے زمرے میں بھی شمار کیا جاتا ہے لیکن عام قصائد اور حمد و نعت میں یہ فرق ہے کہ جہاں قصائد کی بنیاد صلۂ دنیوی پر ہوتی ہے، وہاں حمد و نعت میں مذہبی عقیدت کا بے لوث جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ عربی قصائد میں تو عرب شاعروں نے اپنی روایتی حق گوئی کے مسلک کے تحت حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن ایرانی شاعروں نے اپنے مذاق طبیعت کے مطابق قصائد میں مبالغہ آرائی کو حد سے سوا کر دیا۔ حمد و نعت کی بنیاد سراسر خلوص و محبت اور عقیدت و احترام پر ہے۔ اس میں دنیوی منفعت یا غرض پوشیدہ نہیں ہوتی۔ عقیدت بعض اوقات اندھی بھی ہوتی ہے اور ایسی باتوں سے تسکین حاصل کرنا چاہتی ہے جو عقل سے بعید ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض شاعر نعت میں انتہائی غلو سے کام لیتے ہیں لیکن یہ اپنے موضوع سے سراسر ناانصافی ہے۔ 'نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو خدا کے نبیؐ کے لیے شایان ہے اور جس کے پڑھنے اور سنانے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ کمال بشریت اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ تمام نعتیہ قصائد سننے کے بعد دل پر یہ اثر ہو کہ کسی شاہد رعنا، خوش رو، خوش اندام، نازک بدن کی تعریف ہے'۔[1] اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حمد و نعت کا موضوع بڑا نازک

---

(۱) عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی، چند ہم عصر، صفحہ ۳۔

موضوع ہے۔ اس کے لیے محبت و عقیدت کے علاوہ دینی امور و مسائل سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس واقفیت کے بغیر شاعر کا صراط مستقیم سے بھٹک جانا ممکن ہے بقول عرفی:

عرفی مشتاب این رہ نعت است نہ صحرا ست
ہشیار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

اُردو، فارسی شعرا نے اپنے دواوین کا آغاز عام طور پر حمد و نعت و منقبت سے کیا ہے اور یہ ایک ایسی رسم بن گئی تھی کہ جس کو مسلمانوں کے علاوہ ہندو شعرا بھی پورا کرتے تھے۔ اُردو شاعری میں اس صنف سخن کو باقاعدہ فنی حیثیت دینے والے محسن کاکوروی تھے۔ محسن کے بعد امیر مینائی اور حالی نے اس صنف میں خاص دلچسپی لی۔ حالی کی نعتوں میں سادگی اور خلوص کے ساتھ حقائق کے رنگ میں پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں کو پیش کیا گیا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بھر لانے والا

حالی نے نعت میں عصری مسائل کو سمو کر بڑے سوز و درد کے ساتھ پیش کیا:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

ظفر علی خاں نے حمد اور نعت میں خلوص و محبت اور حقیقت و واقعیت کو اس دلآویز پیرائے میں پیش کیا کہ اُن کی شاعری کا یہ حصہ مشرقی ادبیات میں قابل قدر مقام حاصل کر گیا۔ جذبے کا خلوص، عقیدت کا رنگ اور حقیقت کا پاس،

ان سب باتوں کے امتزاج کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں کا پرشکوہ لہجہ اُن کے اس شعری سرمائے کو مؤثر اور پر کیف بنا دیتا ہے۔ ''خمستان ازل کا ساقی'' حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پہنچتا ہے ہر اک میکش کے آگے دور جام اُس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اس کا
گواہی دے رہی ہے اُس کی یکتائی پہ ذات اُس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے، ہے سچا ایک نام اُس کا
ہر اک ذرہ فضا کا داستاں اُس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ھوا کا آ کے دیتا ہے پیام اُس کا
میں اس کو کعبہ و بت خانہ میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اُس کا
سراپا معصیت میں ہوں سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری خطا پوشی ہے کام اُس کا
نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

ظفر علی خاں کے نعتیہ کلام میں اُن کی مشہور نعت ''صلو علیہ و آلہ''[۱] بڑی دلآویز ہے۔ اس نعت کے پانچ اشعار اگست ۱۹۱۰ع کے پنجاب ریویو میں چھپے اور تین شعروں کا اضافہ منٹگمری جیل کے زمانۂ اسیری میں ھوا۔ اس نعت کی تخلیق نے ظفر علی خاں کو شاعری کا بلند ترین مقام عطا کیا۔ اس

---

(۱) اس نعت کا دوسرا عنوان ''شمع حرا'' ہے۔ پہلا عنوان (پنجاب ریویو) سعدی کے اس مشہور نعتیہ قطعے کا چوتھا مصرع ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہ — کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ — صلو علیہ و آلہ

کے اشعار اس وقت بھی مسحور کن تھے جب یہ شائع ہوئی اور بقول مولانا صلاح الدین احمد "آج بھی اس کے رقص آور مصرعے برگہائے گل تر کی مانند معنبر و معطر ہیں"[۱] اور جب تک مسلمان صفحۂ ہستی پر موجود ہیں اور اُن کے دل جذبۂ عشق رسول ؐ سے معمور ہیں، اس نعت کی اثر آفرینی اور دلآویزی میں کمی نہیں آسکتی :

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر*
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینا زاروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یاران نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں
جس میکدے کی اک بوند سے بھی لب کجکلوں کے تر نہ ہوئے*
ہیں آج بھی ہم بے مایہ گدا اُس میکدے کے سرشاروں میں
ہم حق کے علم برداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی*
بادل کی گرج تکبیروں میں بجلی کی تڑپ تلواروں میں

ظفر علی خاں جذبۂ عشق رسول ؐ سے سرشار تھے ۔ یہ

---

(۱) مولانا ظفر علی خاں کی شاعری، ادبی دنیا (اکتوبر ۱۹۵۳ء) ص ۶۷
*** یہ اشعار منٹگمری جیل کا اضافہ ہیں ۔

جذبہ اُن کے باقی سب جذبوں پر حاوی اور ابتلا و آزمائش کے موقعوں پر اُن کے لیے تسکین دل کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ محبت کی یہ وہ لطیف اور پاکیزہ فضا ہے جو ہر دنیوی آلائش سے پاک اور منزہ ہے۔ ظفر علی خاں اس فضا کی واردات و کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے حقیقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ انتہائی عقیدت اور سرشاری کے باوجود وہ حضرت خیر البشرؐ کی ذات و صفات سے متعلق ایسی باتیں منسوب نہیں کرتے جو خلاف عقل یا دینی عقائد کے منافی ہوں۔ نعت پیغمبرؐ میں انہوں نے عصری مسائل کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور اُن کی نعتوں میں گریز کا موضوع علی العموم وہ امور و مسائل ہوتے ہیں جو امت خیرالوریٰؐ کو عصر حاضر میں درپیش ہیں۔ عقیدت مندی اور حقیقت پسندی کی اس آمیزش نے ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری کو مؤثر بھی بنایا ہے اور پرسوز بھی۔

ظفر علی خاں کی تخلیقی صلاحیتیں اُن کی نعتیہ شاعری میں اپنی ساری جمالی اور جلالی خصوصیات کے ساتھ بروئے کار آئی ہیں۔ اُن کی شاعری کا یہ حصہ ہنگاموں اور اجتماعوں سے الگ اُن کے خلوت خانۂ دل کا ترجمان ہے۔ یہاں جذبے اور اور تخیل کے سہارے وہ اچھوتی اور لطیف فضاؤں میں سرگرم سیر ہوتے ہیں۔ اظہار و بیان میں اردو، فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں، جذبے اور احساس کے مطابق سبک، شیریں اور

پرشکوہ الفاظ اپنے اپنے موقعوں پر آتے ہیں۔ اُن کی نعتیہ شاعری معنیٔ بلند اور الفاظ خوش کے امتزاج سے صورت پذیر ہوتی ہے :

جب نبیؐ کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
کیسے کیسے خوش نما موتی پروتا ہے قلم

ذیل کی چند نعتوں میں ان کیفیات کی ایک جھلک دیکھیے، پہلی نعت "زمیندار" ۱٦ مارچ ۱۹۱۱ع میں چھپی :

محمد مصطفیٰ گنج سعادت کے امیں تم ہو
شفیع المذنبیں ہو رحمۃللعالمیں تم ہو
ہوئی تکمیل دیں تم سے کہ ختم المرسلیں تم ہو
رسالت ہے اگر انگشتری اُس کے نگیں تم ہو
نہ ہوتے تم تو عرش و فرش کا نقشہ نہ جم سکتا
یہ دنیا اعتباری تھی حقیقت آفریں تم ہو
مبّرا کردیا تم نے خدا کو ذمے داری سے
کہ ختم حجت حق کی نشانی بالیقیں تم ہو
نمکداں خوان ہستی کا تمہارا حسن دلکش ہے
خدا جس پرہوا سو جاں سے شیدا وہ حسیں تم ہو
تمہاری یاد ہو جس دل میں ایسے دل کا کیا کہنا
مکاں ہوگا عجب ہی شان کا جس کے مکیں تم ہو
ہوئی کافور ظلمت کفر کی جس کی شعاعوں سے
زمانہ پر یہ روشن ہے کہ وہ مہر مبیں تم ہو
ہوا اسلام کا شرمندۂ احساں جہاں سارا
ہر اک اقلیم پر برسا گئے دُر ثمیں تم ہو
لقب خیرالامم جس کو دیا تاریخ عالم نے
اُس اُمت کے نگہباں اس زمانہ میں تمہیں تم ہو
مسلمانو! خدا کا فضل اس سے بڑھ کے کیا ہوگا
رسول اللہ کا خرمن ہے جس کے خوشہ چیں تم ہو

تمہارا عروۃ الوثقیٰ ہے واعتصمو بحبل‌اللہ
پھر اس رسی کو یارو تھام لیتے کیوں نہیں تم ہو
اخوت کا سبق تم کو پڑھایا ہے پیمبر نے
مگر دل میں لیے پھرتے نفاق و بغض و کیں تم ہو

ایک دوسری نعت ''صاحب قاب قوسین او ادنیٰ'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شب تار الست سے
اس نور اوّلیں کا اُجالا تمہی تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایت اولیٰ تمہی تو ہو
جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نورد جادۂ اسرےٰ تمہی تو ہو
پیتے ہی جس کے زندگیٔ جاوداں ملی
اس جانفزا زلال کے مینا تمہی تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدار یثرب و بطحا تمہی تو ہو
بپتا سنائیں جاکے تمہارے سوا کسے
ہم بے کسان ہند کے ملجا تمہی تو ہو

''اُمت کے حق میں پیغمبرؐ کی دعا''میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات حسنہ کے بیان کے بعدگریز اور پھر دعا میں کس سوز و درد کے ساتھ اجتماعی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے:

مسلّم ہے خدا کے بعد جس کی شان یکتائی
ہے نام اس کا محمدؐ ابن عبداللہ بطحائی

وہ جب آیا تو ساتھ اس کے اک ایسا انقلاب آیا
کہ ہیں اس وقت تک مہر و مہ و انجم تماشائی
وہ ساقی جس کی محفل کے لیے دوش ملائک پر
خمستان ازل سے سے سبو میں سر بمہر آئی
وہ اُمی کر دیے حل جس کی ابجد ناشناسی نے
وہ نکتے جن کو سمجھے تھے نہ اشراقی نہ مشائی
وہ آقا جس کی رحمت کی فراوانی کے دامن میں
جہان اسود و احمر نے یکساں پرورش پائی
وہ مولا جس کے لطف بے نہایت کا یہ عالم تھا
کہ تنگ اس کے لیے تھی مشرق و مغرب کی پہنائی
بٹھایا انتم الاعلون کی مسند پر امت کو
مسلمانوں کے سر پر اُس نے رکھا تاج دارائی
ہم اب تک بھی اُسی کے ہیں مگر یہ کیا قیامت ہے
کہ خود منظور ہم کو ہند میں ہے اپنی رسوائی
علاج اس ساری نکبت کا ہے ایک اور وہ دعا اُس کی
اجابت کے لیے لازم ہوئی جس کی پذیرائی
یہاں تک لکھ چکا تھا میں کہ یثرب سے ندا آئی
یہ نابینا ہیں یا رب مرحمت کر ان کو بینائی
عطا کر اگلے وقتوں کی بلندی ان کی ہمت کو
اور ان کے بازوؤں کو بخش پہلی سی توانائی
پرایوں کی غلامی سے انہیں آزاد کر یا رب
بجے ان کی حویلی میں پھر آزادی کی شہنائی
برے ہیں یا بھلے ہیں پھر بھی یہ تیرے ہی بندے ہیں
مری اُمت ترے ہی کعبہ کی یا رب ہے شیدائی

تاریخی منظومات :

اُردو شاعری میں تاریخی منظومات کا سلسلہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے - حالی کی مسدس ”مد و جزر اسلام“

اس سلسلے کی پہلی اہم کڑی اور دور اصلاح کی عہد آفرین نظم ہے جس میں شاعر نے اسلامی تاریخ کے روشن ماضی کے پر تاثیر مرقعے پیش کرکے اپنے زمانے کے درماندہ حال مسلمانوں کو اپنی حالت پر غور کرنے پر آمادہ کیا۔ مسدس حالی سے متأثر ہو کر بعض دوسرے شاعروں نے بھی تاریخی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ شوق قدوائی کی مسدس قومی (۱۸۸۹ع) نظم طباطبائی کا ساقی نامہ (خطاب بہ اہل اسلام)، صفی لکھنوی کی قومی نظمیں اور اسماعیل میرٹھی کی چند نظمیں خصوصاً "آثار سلف" (۱۸۸۹ع) اس سلسلے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ شبلی نعمانی کے تاریخی شعور اور شاعرانہ مزاج نے اس سلسلے کو بڑی تقویت پہنچائی۔ شبلی کو اسلامی تاریخ سے والہانہ شغف تھا اور وہ مسلمانوں کے روشن عہد کی عظیم الشان روایات اور پرفخر کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرکے اُن الزامات کا جواب دینا چاہتے تھے جو یورپ کے بے درد مؤرخین اور مستشرقین آئے دن تراشتے رہتے تھے۔ یہ کام انہوں نے زیادہ تر نثر میں کیا لیکن کبھی کبھی بعض تاریخی واقعات کو نظم کا جامہ بھی پہنایا۔ مساوات اسلام، خلافت فاروقی کا ایک واقعہ، عدل فاروقی کا ایک نمونہ، عدل جہانگیری وغیرہ یہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ اس کے بعد اقبال اور ظفر علی خاں تک تاریخی نظموں کا یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔ خصوصاً ظفر علی خاں نے شبلی کے تاریخی سلسلہ ہائے

منظومات میں خاصا اضافہ کیا ہے - جب نظر بندی اور اسیری کی پابندیاں انھیں سیاسی ہنگاموں سے دور لے جاتیں ، تو نسبتاً پرسکون علمی فضا میں اُن کے تخیل کی پرواز اسلام کے درخشاں ماضی کا احاطہ کر لیتی اور اس حالت میں وہ شوکت اسلامی کی داستانیں نثر اور نظم میں قلم بند کرنے لگتے - خصوصاً ''ستارۂ صبح'' کے دور میں انھوں نے جو تاریخی نظمیں لکھی ھیں وہ اس تاریخی سلسلۂ منظومات کی اہم تخلیقی کاوشیں ھیں - منٹگمری کے زندانی دور میں بھی چند تاریخی نظمیں تخلیق ہوئیں - ظفر علی خاں کی تاریخی نظموں میں ہرمزان ، اخلاق مرتضوی رض ، انسان کی آزادی کا اسلامی تصور ، فسطاط وغیرہ قابل ذکر ھیں - ''رامائن کا ایک بین'' بھی اسی سلسلے میں شمار کی جا سکتی ہے اگرچہ اس کا موضوع ہندوؤں کی نیم تاریخی نیم مذہبی روایات سے مأخوذ ہے -

ظفر علی خاں کی تاریخی نظموں کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے بعض تاریخی واقعات کو مختصر طور پر اور دل نشین پیرائے میں بیان کر کے اسلام کی سادگی ، سچائی اور مجلسی انصاف کے ایسے مرقعے پیش کیے ھیں جو دور حاضر میں تہذیب انسانی کے خود ساختہ علم برداروں کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوسکتے ھیں - خود مسلمانوں کے سامنے بھی اُن کے عظیم اسلاف کا اخلاق و کردار رہنما بن کر اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ ان بلند مرتبت ہستیوں نے کس طرح اپنی حکومت کو درویشی کا رنگ

دے کر قیصر و کسریٰ کی بنیادیں ہلا دیں اور نوع انسانی کو آزادی، مساوات اور انصاف کا حق دے کر عظمت انسانی کا مثالی نمونہ پیش کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عدل کا ایک واقعہ ''انسان کی آزادی کا اسلامی تصور'' میں ملاحظہ فرمائیے:

عمرو بن العاص کے بیٹے نے مارا بے خطا
مصر کے بازار میں اک قبطیٔ ناشاد کو
اپنے گھر کی سلطنت تھی مدعی تھا غیر نسل
ضعف جس کا دے رہا تھا دعوت استبداد کو
کوئی طاقت دستگیری اس کی کرسکتی نہ تھی
قیصر و پاپا بھی آسکتے نہ تھے امداد کو
ہاں مگر وہ عدل کا پیکر کہ اس کے عہد میں
سر چھپانے کی جگہ ملتی نہ تھی بیداد کو
جس کی نظروں میں مسیحی اور مسلم ایک تھے
جس نے قرباں کردیا ایمان پر اولاد کو
جلوہ گر تھا تمکنت سے مسند اسلام پر
سن رہا تھا قبطیٔ مظلوم کی فریاد کو
مدعی سے آپ نے ملزم کو پٹوا کر وہیں
کر دیا پھر استوار انصاف کی بنیاد کو
جو نصیحت کی مسلمانوں کو اس وقت آپ نے
درس عبرت ہے وہ اس دور ستم ایجاد کو
لوح دل پر نقش ہے فاروق اعظمؓ کا یہ قول
ہم نہ بھولیں گے کبھی اس آپ کے ارشاد کو
آدمی پیدا ہوا آزاد ماں کے پیٹ سے
کب سے تم لوگوں نے سمجھا ہے غلام آزاد کو
کاش یورپ جائے کوئی نکتہ ور اور یہ سبق
آٹھ کے دے تہذیب انسانی کے اس استاد کو

حضرت عمر فاروق رض کے پاس عہد کا ایک اور زریں واقعہ "ہرمزان" کے اسلام قبول کرنے کا ہے ۔ ہرمزان ایران کا ایک نامور جرنیل تھا ۔ اُس نے افواج اسلام کو کافی پریشان کیا تھا اور اُس کے ہاتھوں کئی مقتدر مسلمان شہید ہوئے تھے ۔ بالآخر یہ نامور جرنیل اسلامی افواج کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مدینہ منورہ پہنچا ۔ حضرت عمر رض اس کے قتل کا مصمم ارادہ کر چکے تھے لیکن اتمام حجت کے طور پر اُسے صفائی کا موقع دینا ، بہ تقاضائے انصاف ضروری تھا ۔ چنانچہ اُس کو اجازت دی گئی کہ اپنی روش کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہنا ہے سو کہہ لے ۔

ہرمزان نے کہا ، کہ اے عمر رض ! جب تک خدا ہمارے ساتھ تھا تم لوگ ہمارے غلام تھے ، اب خدا تمہارے ساتھ ہے ، اس لیے ہم تمہارے غلام ہیں ۔ پھر کہا ، یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے ، لیکن میں سخت پیاسا ہوں ۔ شدت تشنگی سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہیں ۔ لب تر کرنے کو پانی کا ایک گھونٹ مل جائے تو جان ذرا اطمینان سے نکلے ۔ اُس کی یہ خواہش پوری کی گئی اور پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ اُسے لا کر دیا گیا ۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر اُس نے تھوڑا سا تأمل کیا اور کہا کہ جب تک میں پانی پی نہ لوں مجھے قتل نہ کیا جائے ۔ حضرت فاروق اعظم رض نے اُس کی یہ التجا قبول کر لی ، اور اُسے اطمینان دلایا کہ جب

تک وہ اپنی پیاس پانی کے اس پیالے سے بجھا نہ لے گا، اُس کی گردن نہ ماری جائے گی۔ ہرمزان نے پانی کا آبخورہ زمین پر پٹک دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا اور پیالے میں وہ پانی ھی نہیں رہا جسے پیوں۔ اب آپ مجھے اپنے قول کے مطابق قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ کے اصول ایفائے عہد کے پاس اس منطق کی بے پناھی کا کوئی جواب نہ تھا۔

ظفر علی خاں اس تاریخی واقعے کو بڑے دلنشین پیرائے میں رقم کرتے ھیں۔ اس موقعے کے چند اشعار ملاحظہ ھوں، جب ہرمزان کی سزائے موت کا فیصلہ ھو جاتا ھے:

ہوا جلال عمر کا یہ فیصلہ اس پر
سزائے موت ہے اس دشمن اماں کے لیے
یہ ہرمزاں پکارا "میں تشنہ ہوں، پہلے
بجھاؤ پیاس مری رب مہرباں کے لیے"
دیا گیا جب اُسے آب خورہ پانی کا
تأمل اُس نے کیا شاید امتحاں کے لیے
تسلی اُس کو خلیفہ نے دی یہ فرما کر
زباں ہے قول کو اور قول ہے زباں کے لیے
نہ تیرے حلق سے جب تک اتر لے یہ پانی
حرام خوں ہے ترا خنجر رواں کے لیے
جو میہماں ہو عدو بھی تو احترام اُس کا
ہمارے کیش میں لازم ہے میزباں کے لیے
پٹک کر اُس نے پیالہ کہا کہ خوف سے اب
ملی نجات مجھے عمر جاوداں کے لیے
اماں مل گئی مجھ کو ہے فرض عہد کا پاس
حریم احمد مرسلؐ کے پاسباں کے لیے

اس کے بعد ھرمزان نے بطیّب خاطر کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ھوا ۔ ساتھ ھی اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اسلام کے فضائل کا ایک عرصے سے معترف تھا اور دل سے اس کی حقانیت پر ایمان لا چکا تھا ۔ پانی سے پیاس بجھانے کا حیلہ میں نے صرف اس لیے اختیار کیا کہ لوگ کہیں مجھے یہ طعنہ نہ دیں کہ موت کے ڈر سے میں نے اسلام قبول کر لیا ھے !

اسلام میں جہاد بالسیف مصلحانہ اور مدافعانہ مقاصد کے لیے جائز ھے ۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر جنگ کرتے تھے اور جہاں اُن کی ذاتی اغراض آ جاتی تھیں، کشت و خون سے گریز کرتے تھے ۔ اس کی واضح مثال حضرت علی مرتضیٰ رض کا یہ زندۂ جاوید واقعہ ھے، ایک جنگ کے موقع پر آپ نے ایک یہودی حریف کو پچھاڑا اور قریب تھا کہ اُس کے سینے پر چڑھ کر خنجر سے اُس کا کام تمام کر دیں اتنے میں اُس شریر یہودی نے آپ کے منہ پر تھوک دیا ۔ آپ نے اپنا ھاتھ وھیں روک لیا، اور یہودی کی جان لینے سے درگذر کیا ۔ یہودی حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ھوا ۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے تیرے اس فعل ناروا سے غصہ تو بہت آیا تھا، لیکن اس حالت میں اگر تجھے قتل کر دیتا، تو یہ قتل رضائے الٰہی کے لیے نہ ھوتا، محض نفس کی خاطر ھوتا !

یہ تاریخی واقعہ اسلام کی بلندی و برتری کا جیتا جاگتا مظہر ھے، جسے ظفر علی خاں نے بڑے دلنشین انداز میں منظوم

کیا ہے - ملاحظہ فرمائیے :

روایت ہے کہ اک سر کش یہودی
ہوا جنگ آزما شیر خدا سے
نہ تھا اس رمز سے شاید وہ آگاہ
کہ یہ کشتی وہ لڑتا ہے قضا سے
جو اپنی جان کا ہو آپ دشمن
وہی اُلجھے علی مرتضیٰ رضؓ سے
ہوا واقف وہ پہلی ہی پکڑ میں
علی رضؓ کے زور مرحب آزما سے
زمیں پر آ رہا گرتا ہے جس طرح
خزاں کا آخری پتّا ہوا سے
کھڑی تھی موت اُس کے سر پہ اُس وقت
نہ تھا خس کو مفر سیل فنا سے
برنگ ذوالفقار اس کے لہو کے
نظر آتے تھے عرش و فرش پیاسے
یہودی نے یہ جب دیکھا کہ ہرگز
نہیں ممکن ہے بچنا اس بلا سے
مقابل چاند تھا تھوکا* اُسی پر
طبیعت کے پرانے اقتضا سے
کہ نکلے آخری نفرت کی حسرت
اسی حیلے دل کفر آشنا سے
یہ گستاخانہ یہ بیہودہ حرکت
جونہی سرزد ہوئی اس ناسزا سے
معاً روکا علی رضؓ نے ہاتھ اپنا
وہ جو دو ہاتھ آگے تھا قضا سے

* یعنی جناب علی مرتضیٰ رضؓ کے رخ انور پر (خاکم بدہن) تھوک دیا - شاعر نے پاس ادب سے اس بات کو کتنے لطیف اور اچھوتے انداز میں کہا ہے -

کیا خوں بھی معاف اور یہ خطا بھی
مئے احساں سے تھے لبریز کاسے
جرائم سے نوازش کچھ سوا تھی
عطائیں بڑھتی جاتی تھیں خطا سے
یہودی بن گیا تصویر حیرت
امیرالمومنیں کی اس ادا سے
لگا کہنے کہ اے سردار ذی جاہ
یہ سب کچھ کیوں ہے اور کس مدعا سے؟
مجھے کیوں آپ نے محروم رکھا
مرے مغلوب ہونے کی سزا سے ؟
کیا کیوں میری اس حرکت سے اغماض؟
جو ہے مذموم بڑھ کر انتہا سے
مکافات عمل کا یہ تصور
ہے بالاتر مری فکر رسا سے
جواب اس نکتۂ باریک کا یوں
ملا اُس کو لب مشکلکشا سے
جو سچ پوچھے تو غصہ آ گیا تھا
مجھے اس تیرے فعل نارِوا سے
مگر یہ غصہ رکھتا تھا تعلق
فقط میرے ہی نفس فتنہ زا سے
میں اس حالت میں تجھ کو قتل کرتا
تو ہوتا سرخرو کیونکر خدا سے
کہ میں جو کام بھی کرتا ہوں اس میں
غرض ہوتی ہے مولا کی رضا سے
یہودی سن چکا اچھی طرح جب
یہ ارشاد انتہا تک ابتدا سے
پکار اُٹھا کہ ہے اسلام سچا
ہے دنیا قائم اسی دین ھدیٰ سے

تہی داماں رہا ہوں آج تک میں
چنوں گا پھول اب اس بستاں سرا سے
مرا گھر شعلہ زار طور ہوگا
اب اس شمع فروزاں کی ضیا سے
نہ سرتابی کروں گا آج کے بعد
خدا سے اور محمد مصطفیٰ ؐ سے

اسلامی عدل و انصاف اور لطف و مروت کا فیض صرف انسانوں کے لیے ھی نہ تھا، بلکہ جانور اور پرندے تک بھی اس سرچشمۂ مہر و محبت سے سیراب ہوتے تھے۔ مصر میں شہر فسطاط کی بنیاد کا واقعہ تاریخ میں بڑا مشہور ھے۔ فتح مصر کے موقعے پر جناب عمرو رضؓ ابن العاص کا لشکر دریائے نیل پر ایک جگہ خیمہ زن تھا۔ جب کوچ کی تیاری ہوئی تو عمرو رضؓ کے خادم نے آ کر کہا کہ ایک خیمے میں ایک کبوتر نے آشیانہ بنا رکھا ھے، حکم ہو تو اسے بھی اکھاڑ لیا جائے۔ جناب عمرو رضؓ نے اپنے بے زبان مہمان کو تکلیف دینا گوارا نہ کی اور خیمہ اسی جگہ رہنے دیا، اور فتح مصر کی تکمیل پر وہاں ایک پُر رونق شہر بسایا جس کا نام خیمہ (عربی میں فسطاط خیمے کو کہتے ھیں) کے نام پر فسطاط رکھا گیا۔

ظفر علی خاں نے اس واقعے کو بھی نظم کا جامہ پہنایا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

معرکہ جب یہ ہوا سر تو دیا عمرو رضؓ نے حکم
کہ اب آگے بڑھیں رایات سعادت فرجام

عمرو سے آ کے یہ خادم نے کہا، خیمہ میں
آشیاں بند کئی روز سے ہے ایک حمام
انڈے بچے بھی کبوتر کے ہیں اس گھونسلے میں
لا کے چوگا وہ کھلاتا ہے انہیں صبح و شام
حکم اگر ہو تو لیا جائے یہ خیمہ بھی اکھاڑ
لد چکے دیر کے اونٹوں پہ ہیں لشکر کے خیام
عمرو نے سن کے یہ بات اپنے ملازم سے کہا
کردیا خیمہ ہبہ میں نے کبوتر ہی کے نام
میرے مہماں کو تکلیف نہ ہونے پائے
میرے آرام پہ ہے اس کا مقدم آرام
شہر اک اسلام نے آباد کیا پر رونق
تھا کبوتر کا جہاں عمرو کے خیمہ میں قیام
خیمہ کے واسطے نام عربی ہے فسطاط
پڑگیا اس لیے فسطاط ہی اس شہر کا نام
جاں فدا اس چمن آرائے حجازی پہ مری
جس کے اخلاق کی نکہت سے معطر ہے مشام
ہو کبوتر سے جب اسلام کا ایسا برتاؤ
کیوں نہ یہ دین ہو دنیا کے لیے رحمت عام

مناظر قدرت کی عکاسی :

قدیم اُردو شاعری میں مناظر قدرت کی تصویر کشی کے نمونے مل تو جاتے ھیں لیکن تلاش بسیار کے بعد ملتے ھیں۔ قدیم دور کا شاعر اپنے دل کی دنیا میں زیادہ ڈوبا رہتا تھا۔ خارجی ماحول پر یا تو نظر ڈالتا ھی نہ تھا اور اگر ڈالتا تھا تو اس کے داخلی جذبات تنے غالب ھوتے تھے کہ خارجی ماحول پس منظر میں غائب ھو جاتا تھا۔ میر و سودا اور

غالب و مومن تک سب شاعروں کے ہاں نیرنگیٔ عناصر کی یہی جلوہ گری ملتی ہے۔ کہیں کہیں مثنویوں اور شکارناموں میں ذرا کشادہ فضائیں بھی مل جاتی ہیں۔ میر حسن، میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کے ہاں قدرتی مرغزاروں کے وسیع نمونے مل جاتے ہیں۔

جدید دور میں نیچرل شاعری کا آغاز (۱۸۷۴ء میں) ہوا، تو مناظر قدرت کے بیان کو ایک تحریک کی صورت دی گئی اور شعرا زیادہ سے زیادہ اپنے ماحول کے مناظر کی تصویر کشی کرنے لگے۔ آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، نظم طبا طبائی سے ہوتی ہوئی یہ روایت اقبال اور ظفر علی خاں تک پہنچی۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور شاعری میں اس رجحان میں خاص دلچسپی لی اور بعد میں مناظر قدرت اُن کے شعری افکار میں پس منظر کا کام دینے لگے۔ ظفر علی خاں بھی جب تک سیاست اور صحافت کے میدانوں میں تیز گام نہیں ہوئے، اس رجحان کے تتبع میں مناظر قدرت سے دلچسپی لیتے رہے اور اپنی شاعری میں منظر کشی کے عمدہ نمونے پیش کرتے رہے، جن میں سے بعض طبع زاد تھے اور بعض انگریزی نظموں کے ترجمے۔ یہ سلسلہ بعد میں کم ہو گیا اور پھر جب کبھی سیاسی ہنگاموں سے جبری فرصت ملتی اور ذہنی سکون کے عالم میں وہ خارجی کائنات پر نظر ڈالتے تو مناظر قدرت کی طرف توجہ کرتے، لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔

دکنی دور میں ظفر علی خاں نے رڈیارڈ کپلنگ کی تصنیف The Jungle Book کا ترجمہ کیا، نثر کا نثر میں اور شعر کا شعر میں۔ بعض جگہ تصرفات کر کے کپلنگ کی بجائے ٹینی سن، لانگ فیلو اور بائرن کی نظموں کا پیوند لگا دیا ھے، جو ان کے نزدیک ناظرین کی لطف اندوزی کے لیے ھے[1]۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں - پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک ندی جوش و خروش کے ساتھ بہہ رہی ھے، اور یہ ترانہ گا رہی ھے :

بگلوں اور چہوں کے نشیمن سے میں نکل کر ناگہاں
چشم زدن میں سیل بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں
سبزہ کے فرش استبرق پر مثل دراری غلطاں
کروٹیں لیتی ہوئی وادی میں پہنچ کر شور مچاتی ہوں
کتنی گھاٹیوں کے دامن کو راہ میں آئی جھٹک کر میں
کتنے ٹیکروں اور ٹیلوں کے تلوے میں سہلاتی ہوں
بیسیوں گاؤں کے اور قصبوں کے پہلو سے نکلی مٹک کر میں
سینکڑوں پل ہیں مٹھی میں دل جن کا چرا کر لاتی ہوں
زید کے کھیت کے نیچے بہہ کر تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں

عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے، گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں بے خود ہو کر
ریزۂ سنگ پہ تار آب پہ دلکش زخمہ لگاتی ہوں
پاؤں میں جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے لطافت کی چادر
چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں
بن کر میں مشاطہ کبھی الجھاتی ہوں گیسوئے ساحل کو
کھیتوں کا دھلواتی ہوں منہ میدانوں کو نہلاتی ہوں

---

(۱) جنگل میں منگل ص ۱۲ -

اور کبھی ساقی بن کے مرتب کرتی ہوں سبزہ کی محفل دو
ساغر نامیہ بھر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں
گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے، گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

ذرا سنیے! دریائی گائے کس پر سوز نغمگی کے ساتھ اپنے ننھے منے بچے کو لوری دے کر سلا رہی ہے:

میرے بچے شور مت کر کہ ہے رات اندھیری سر پر
پڑا مارتا ہے موجیں بڑے ٹھاٹھ سے سمندر
وہ کھلی افق کی کھڑکی وہ چمک کے چاند نکلا
لیا ہم کو دیکھ سوتے لب ساحل آس نے آ کر
بنیں نیلی نیلی لہریں ترا نرم نرم تکیہ
بنا اجلا اجلا پانی ترا گرم گرم بستر
میرے پیارے ننھے بچے تو مزے سے پڑ کے سو رہ
نہ تجھے بھنور کا خطرہ نہ تجھے نہنگ کا ڈر

"شور محشر" جسے ظفر علی خاں نے موسیٰ ندی کی طغیانی کے موقع پر تخلیق کیا، نیچرل شاعری کے سلسلے کی ایک ناقابل فراموش کڑی ہے۔ ظفر علی خاں نے جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ مناظر قدرت کی جس انداز سے تصویر کشی کی ہے، وہ بڑی مؤثر ہے۔ نظم کا ڈرامائی انداز قاری کے ذہن کو ایسی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں وہ دم بخود مختلف مناظر کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھتا ہے۔ کبھی پر بہار فضاؤں میں بہتی ہوئی سبک سیر ندی کا دلکش منظر اور کبھی سیلاب کی صورت میں اس کی تندی و تیزی کا

قیامت خیز منظر، بپھری ہوئی لہروں کی صورت میں نظر آتا ہے ـــ اور پھر ان دونوں مناظر کا اثر جذبات انسانی پر !
ظفر علی خاں کی یہ نظم جو سیلاب زدگان کی امداد کے لیے لکھی گئی، اب نایاب ہے اور اُن کے کسی مجموعۂ کلام میں بھی شامل نہیں ۔ ہمیں مخزن (جنوری ۱۹۰۹ع) سے یہ نظم دستیاب ہوئی جسے اس تألیف کے آخر میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے:

کس شان و تمکنت سے بہتی ہے نہر موسیٰ
لہرا رہی ہے ناگن یا جلوہ گر پری ہے
یا موج کہکشاں نے افلاک سے اُتر کر
کی ساحت دکن پر انوار گستری ہے
اے نہر تیرا پانی شیریں ہے اور گوارا
مصری کی اک ڈلی ہے جو تیری کنکری ہے
جاں بخش تیری لہریں دلکش تری روانی
قدرت نے تجھ کو بخشی کیا شان دلبری ہے
رامشگری میں یکتا ساقی گری میں پر فن
گوہر سے خوشنما تر فیروزہ سے کھری ہے
موتی لڑھک رہے ہیں ہیرے چمک رہے ہیں
کیا کیا جواہروں سے جھولی تری بھری ہے

'سمندر کی روانی'، ایک دلآویز نظم جنوری ۱۹۱۳ع میں لکھی گئی جب ظفر علی خاں کو پہلی بار سیاحت یورپ کا اتفاق ہوا ۔ سمندر کی رنگا رنگ موجوں نے اُن کے قلب پر جو اثر ڈالا اور درمیانی مناظر نے دل و دماغ میں جو گوناگوں کیفیات پیدا کیں، ان سب نے مل کر ایک نظم کی

شکل اختیار کر لی، جسے انھوں نے پیرس کے دو روزہ قیام میں سپرد قلم کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے محیط بیکراں اے بحر ناپیدا کنار
تیری یکتائی ہے نقش وحدت پروردگار
تیرے عارض پر جمال اُس کا فروغ افشاں کبھی
اور جلال اُس کا کبھی تیری جبیں پر جلوہ بار
ہیں تری پہنائیاں سنجاب دامان خیال
اور تری جولانیاں آغوش فطرت کا فشار
تو کہیں ابیض کہیں اسود کہیں احمر ہوا
جلوۂ نیرنگ قدرت ہے ترا نقش و نگار
حسن تیرا لا زوال اور عمر تیری جاوداں
ہو نہیں سکتی خزاں سے منفعل تیری بہار
نیلی نیلی تیری موجیں ہیں پرا باندھے ہوئے
یا مگر قدرت کی فوجیں ہیں قطار اندر قطار
جب بہار آتی ہے کرتا تو بھی ہے میری طرح
جامہ اپنا چاک چاک اور دامن اپنا تار تار
ہیں عنادل سے بھی شیریں تر ترے نالے کبھی
اور گرجتا ہے کبھی تو بے محابا رعد وار
پھیل جاتا ہے کبھی تو اور سمٹ جاتا بھی ہے
ہے بلندی میں ابھی کوہ اور ابھی پستی میں غار

ظفر علی خاں کی ایک دلآویز نظم "رامائن کا ایک سین" ہے جس کی ابتدا میں برکھا رت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ منظر کشی محاکات شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے:

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری باتات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادر ابر سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ

بادل اتنے میں در ناسفتہ برسانے لگا
داستان قلزم و عماں کو دہرانے لگا
جھوم کر آٹھی گھٹا، برسی، برس کر چھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نور خورشید اس طرف چھننے لگا
سائباں قوس قزح کا اس طرف تننے لگا
سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا مہابن کا ہر اک کونہ ختن اندر ختن
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا افق کی آستاں تک آفتاب
تھا شفق کا اس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب

اور پھر سیاسی تقاضوں سے دب کر کبھی کبھی وہ اس قسم کی نظمیں کہتے ہیں جن میں آورد کی کیفیت نمایاں ہے۔ 'سیر کہسار' ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی فرمائش پر ۱۹۲۷ء میں کہی گئی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

گزاری میں نے تابستاں کی فرصت کوہساروں میں
دل افروز آبشاروں میں دل آرا مرغزاروں میں
ہم آغوش صبا تھی نکہت گل کی سیہ مستی
جنوں پرور تھے نغمے طائروں کے شاخساروں میں
کھنچی تھی سامنے زنجیر سرجیون پہاڑوں کی
فلک تھا بوسہ افشاں جن کی برفیلی قطاروں میں
نسیم آئی فضائے خلد سے اور بے حجاب آئی
کرن سورج کی ناچی ہو کے عریاں جوئباروں میں
منازل ارتقا کی کر رہے ہیں ہنیوں پر طے
جناب ڈارون کے جد امجد دیوداروں میں

الہ العالمیں معبود ہے ہم بے نواؤں کا
جناب مالوی[1] ہیں آپ کے پروردگاروں میں

غرض، ظفر علی خاں کی شاعری میں مناظر فطرت کی عکاسی کے چند دلکش نمونے تو مل جاتے ھیں، جو یہ پتہ دیتے ھیں کہ اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو حسن فطرت کے یہ مظاھر بھی اُن کا ایک موضوع خاص بن جاتے۔

شخصی نوحے و مرثیے:

اُردو شاعری میں مرثیے کی صنف زیادہ تر سانحۂ کربلا کے بیان تک محدود رھی، تاھم بعض شاعروں نے اعزہ و احباب کے مرنے پر تاریخی قطعوں کے علاوہ شخصی مرثیے بھی کہے ھیں۔ مثلاً غالب کے دو مرثیے (ایک زین العابدین عارف کے مرنے پر اور دوسرا کسی محبوبہ کی وفات پر)، مولانا حالی اور میر مہدی مجروح کا مرثیۂ غالب وغیرہ۔ ظفر علی خاں نے بھی بعض اعزہ و احباب کی وفات پر مرثیے کہے ھیں، جو بڑے مؤثر اور دلگداز ھیں۔ موت، زندگی کی ایک المناک حقیقت ھے۔ ھر انسان نے اس کا مزہ چکھنا ھے، کسی نے پہلے کسی نے بعد میں، پھر بھی طبع انسانی ھر حادثے پر شدت غم سے دوچار ھوتی ھے اور ھر حادثہ زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا گہرا نقش پیش کرکے احساس میں چبھن پیدا کرتا رھتا ھے۔ واردات غم کا یہ موضوع شاعر کے لیے اظہار غم کے علاوہ تخلیق فن کا بھی ایک

---

(۱) پنڈت مدن موہن مالوی۔

مؤثر ذریعہ ہے - ظفر علی خاں نے اپنے والد، بھائی (محمد اکبر خاں)، نواب مرزا داغ، سید محمود، مولانا گرامی، سر فضل حسین، لاجپت رائے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ اقبال کے مرنے پر مرثیے لکھے ہیں - محمد اکبر خاں کی وفات پر جو مرثیہ لکھا گیا (۱۳۲۳ھ) اس کے چند اشعار دیکھیے، کتنے پر تاثیر ہیں:

میں آج سنانے کو ہوں مژگاں کی زبانی
پہلو میں گداز جگر و دل کی کہانی
کرنا ہے مجھے آج جواں بھائی کا ماتم
بنیاد فلک ہے مجھے منظور ہلانی
وہ شمع کہ تھا اس سے مرے گھر میں اجالا
صرصر کو نہ لازم تھی سر شام بجھانی
کچھ شک نہیں اس میں کہ یہ دنیا ہے دو روزہ
یہ امر مسلم ہے کہ انسان ہے فانی
لیکن جگر خستہ کے اڑ جاتے ہیں پرزے
یاد آتی ہے اکبر مجھے جب تیری جوانی
ہم جلتے ہیں یاں آتش سوزندۂ غم سیں
لازم نہیں جنت میں خوشی تم کو منانی
دیکھو تو ذرا اٹھ کے قیامت کا نمونہ
بالیں پہ تمہارے ہے بپا محشر ثانی
اکبر ترے مرنے کا مٹے گا نہ کبھی داغ
اس پھول کو سینچے گا مرے اشک کا پانی

داغ دھلوی کی وفات پر ظفر علی خاں اور اقبال دونوں نے مرثیے لکھے - اقبال کا مرثیہ ترکیب بند ہے، ظفر علی خاں کا قطعہ بند جس کے تسلسل اور روانی میں غم کی دبی دبی لہر

دلوں کو بڑا متاثر کرتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

نقش سراب ہستی نا پائدار ہے | شکل حباب زندگی مستعار ہے
گر عمر نوح بھی ہو میسر تو کیا ہمیں | آخر کو ہم ہیں اور وہی کنج مزار ہے
بلبل عبث ہے باغ میں ہنگامہ گرم کن | عہد خزاں ودیعت فصل بہار ہے
منزل پہ آ کے راہ رو جادۂ فنا | دامن فشاں ہو قاعدۂ روزگار ہے
باتیں یہ سب درست بجا یہ تسلیاں | لیکن دل حزیں پہ کسے اختیار ہے
بچھڑا ہے ہم سے داغ ہمیشہ کے واسطے | دل داغ دار ہے مژہ خونابہ بار ہے
ہوتی ہے اس کی مرثیہ خواں آج شاعری | ماتم میں اس کے آج غزل سوگوار ہے

حبسیات :

قدیم اردو شاعری میں زنجیر و زنداں کے مضامین تو کثرت سے مل جاتے ہیں لیکن یہ محض استعارے ہیں، جن سے شعرا اپنے جنون عشق کی کیفیات دکھاتے ہیں ۔ میر کا شعر ہے :

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

شعرا کو حقیقت میں کبھی زنداں سے سابقہ نہ پڑتا تھا، غالب کو ایک بار جیل جانا پڑا، کسی قومی جد و جہد کے سلسلے میں نہیں بلکہ قماربازی کے سلسلے میں ۔ جدید دور میں سیاسی تحریکوں کے سلسلے میں قومی شعرا کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں ۔ ظفر علی خاں اور حسرت موہانی دونوں شاعر بھی تھے اور زندانیٔ استبداد بھی ۔ حسرت موہانی کا تو یہ ایک شعر ہی حبسیاتی شاعری کے کئی دیوانوں پر بھاری ہے :

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ظفر علی خاں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ زنداں میں گزارا۔ تحریک خلافت و ترک موالات کے سلسلے میں انھوں نے پانچ سال منٹگمری جیل میں گزارے۔ اس زندانی دور کی شاعری حبسیات کے عنوان سے ایک علیحدہ مجموعے میں شائع ہوئی جس میں زندانی زندگی کے تأثرات بھی ھیں اور مختلف داخلی کیفیات اور خارجی واقعات کا رد عمل بھی؛ حمد و نعت کے موضوعات بھی ھیں اور سیاسی مسائل پر تبصرہ بھی۔ زنداں کی تنہائیوں میں شاعر کا طائر فکر کس کس عالم میں پرواز کرتا ھے اور کیا کیا کیفیت اس کے دل پر گزرتی ھے، اس کی جھلک ذیل کے قطعے میں ملاحظہ فرمائیے:

بس کہ تنہائی میں تھا شوق غزل خوانی مجھے
کر دیا قسمت نے انگریزوں کا زندانی مجھے
جو مضامیں آج تک تھے برتر از فکر بلند
بیٹھے بیٹھے سوجھ جاتے ہیں بآسانی مجھے

زنداں کی تنہائیوں میں عالم خیالستان کی پرواز کرتے ہوئے شاعر کا طائر فکر جن مناظر سے گزرتا ھے، اُن کی کتنی دلکش تصویریں کھینچتا ھے۔ ملاحظہ فرمائیے:

اک جہان رنگ و بو خود مرا خیال تھا
گوشۂ قفس مجھے عالم مثال تھا
رات شاہباز فکر لے گیا کہاں کہاں
خود تو میں شکستہ پر گسستہ بال تھا

چھپ چکا تھا آفتاب، ضو فشاں تھا ماہتاب
کائنات کا مزاج رو بہ اعتدال تھا
کوہ و دشت و بام و در غرق موج نور تھے
بس کہ ماہ نیم ماہ بن چکا ہلال تھا
چاک تھی قبائے گل بے نقاب تھے نجوم
بے حجاب ہر طرف حسن لا یزال تھا
دیکھتا تھا میں جدھر سر بسجدہ تھے شجر
ڈال ڈال پات پات ذکر ذوالجلال تھا
عرش و فرش مست تھے اپنے اپنے رنگ میں
کیا کہوں مگر کہ کیا میرے دل کا حال تھا
وہ زمانہ پھر گیا یک بیک نگاہ میں
جب ہر ایک حق پرست بوذر رض و بلال رض تھا
جب نبی ص کے نام پر جسم و روح تھے نثار
جب خدا کی راہ میں وقف جان و مال تھا
جام جم سے بے نیاز تھی شراب خانہ ساز
مے کشوں کا چارہ ساز ساغر سفال تھا
باغ میں وہی بہار پھر بھی آئے گی کبھی ؟
حاملان عرش سے یہ مرا سوال تھا
ہم زباں نہ تھے مگر میں سمجھ گیا مراد
میری بات کا جواب مصطفیٰ کمال[۱] تھا

قومی اور سیاسی شاعری :

اردو شاعری میں قومی شعور و احساس کی ترجمانی کا باقاعدہ سلسلہ دور جدید میں (۱۸۵۷ء کے بعد) شروع ہوتا ہے۔ حب الوطنی کا ایک واضح تصور انجمن پنجاب کے مشاعروں (۱۸۷۴ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ وطنیت اور قومیت کے ان

---

(۱) اسی زمانہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو شکست فاش دے کر ایشیائے کوچک کو ان کے وجود سے پاک کرا لیا تھا۔

سرباہی بہادر گل

تصورات کو انیسویں صدی کی اصلاحی ، معاشرتی اور سیاسی تحریکوں نے تقویت پہنچائی ۔ مولانا حالی نے ان تصورات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی الگ قومی حیثیت کو بھی ملحوظ رکھا ، جو ۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد ایک دور آزمائش سے دوچار تھی ۔ مدو جزر اسلام (مسدس حالی) اور شکوۂ ہند میں حالی کا یہی ملّی شعور کار فرما ہے ۔ مسلم قومیت یا ملت کے جس تصور نے حالی ، شبلی اور اکبر کے ہاں ابتدائی نقش و نگار ابھارے ، اُسے اتحاد اسلام دور کے پرخروش جذبات نے بہت اجاگر کر دیا ۔ ظفر علی خاں اور اقبال کی شاعری اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے ۔ اس سلسلے میں یہ امر غور طلب ہے کہ مسلمان شعرا جہاں برعظیم میں اپنے دوسرے هم وطنوں کے ساتھ مشترکہ جد و جہد (آزادی) میں شریک تھے ، وہاں اُن کے جذبات عالم اسلام کی دھڑکنوں سے بھی ہم آہنگ تھے ، اور وہ یہ احساس رکھتے تھے کہ اُن کے کچھ اپنے ملی خصائص ہیں جو انہیں برعظیم میں صدیوں تک رہنے اور اس سرزمین کو اپنی مادر وطنی سمجھنے کے باوجود ایک عالمگیر سلسلے سے بھی منسلک کیے ہوئے ہیں ۔ یہی احساس مولانا حالی کے ہاں مرثیے کے انداز میں ، اور ظفر علی خاں اور اقبال کے ہاں رجز اور فکر کے رنگ میں ظاہر ہوا ۔

ظفر علی خاں کی نظم ”مسلم کی شان“ (۱۹۱۷ع) میں

مسلم قومیت کی اسی مقامی اور آفاقی حیثیت کو واضح کیا گیا ھے۔ چند اشعار ملاحظہ ھوں:

تو نے اے مسلم کچھ اپنی قدر پہچانی بھی ہے
تو ہے انساں تجھ میں لیکن شان یزدانی بھی ہے
فرش پر ہیں پاؤں تیرے عرش پر ہے سر ترا
نصف تو خاکی ہے لیکن نصف نورانی بھی ہے
جس تمدن سے ہوئی ہے خیرہ چشم روزگار
سرمہ اس کا تیرے نقش پا کی حیرانی بھی ہے
نیل کی موجیں اگر کرتی ہیں تیری جستجو
ڈھونڈتی پھرتی تجھے گنگا کی جولانی بھی ہے

ذیل کے ولولہ انگیز اشعار میں ظفر علی خاں نے رزم و بزم میں اسلام کی درخشاں روایات کا نقشہ کھینچتے ہوئے عصری حالات کو کس بلیغ انداز میں پیش کیا ھے:

سیل کی طرح جو نکلے تھے بیابانوں سے
آب جو بن گئے گزرے جو خیابانوں سے
تھا جو اپنوں سے وہی لطف تھا بیگانوں سے
گردنیں دب گئیں اسلام کے احسانوں سے
وہ خود امی تھے مگر کون و مکاں کے اسرار
حکما سیکھ گئے اُن کے دبستانوں سے
اب جو آئی ہوئی ہے گلشن گیتی میں بہار
رنگ اڑا لائی ہے ان کے ہی گلستانوں سے
اس کے پینے کے لیے چاہیے ظرف عالی
یہ شراب آئی ہے توحید کے خمخانوں سے
ہم رہ سست عناں منزل سلمیٰ کی خبر
پوچھتا کیوں نہیں یثرب کے حدی خوانوں سے
پھر وہی غلغلہ آفاق میں ہوتا ہے بلند
شیر کی گونج پھر اٹھی ہے نیستانوں سے

ہم نے دیکھا ہے ان آنکھوں سے ادھر طارق کو
نعرہ خالدرض کا سنا ہے ادھر ان کانوں سے
بوئے تیغ آتی ہے پہلوئے فلسطیں سے ہنوز
جوئے خوں بہنے کو ہے قدس کے میدانوں سے
سونپ دیں پرچم تثلیث کو بغداد و دمشق
نہیں امید یہ کعبہ کے نگہبانوں سے
کور دبتی ہوئی آتی ہے حریفوں کی نظر
اک طرف ترکوں سے اور اک طرف افغانوں سے
مصر بیتاب ہو یا ہند ہو آتش بجگر
ہے یہ سب گرمیٔ ہنگامہ مسلمانوں سے

اسلامی اقدار و روایات اتنی ہمہ‌گیر اور آفاقی ہیں کہ ان کو کسی ایک زمانے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان جس زمانے میں بھی حق و صداقت کے لیے میدان عمل میں نکلیں گے، فتح و نصرت اُن کے قدم چومے گی۔ عقیدے کی رو سے ایک مسلمان کا جینا اور مرنا رضائے الٰہی کی خاطر ہے، اور دنیا کی سرافرازی اسی کا انعام ہے۔ جب تک مسلمان اس بنیادی حقیقت کے مطابق زندگی بسر کریں گے، اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش اُن پر ہوتی رہے گی، اور جب وہ اس حقیقت سے منہ موڑ لیں گے، دنیا میں ذلیل و خوار ہوں گے۔ ملت اسلامی کی قوت کا سب سے بڑا راز اسی مقصد عظیم یا عقیدے میں پنہاں ہے۔ جس دور میں بھی مسلمان اس مقصد عظیم کی خاطر سربکف ہوئے، تائید الٰہی سے مظفر و منصور رہے۔ اتحاد اسلام دور میں مصطفیٰ کمال پاشا اور امیر امان اللہ خاں کے جہاد آزادی میں یہ جذبۂ سرفروشی کارفرما تھا جس کی

بدولت ترکوں اور افغانوں کو پنجۂ اغیار سے نجات ملی۔ ظفر علی خاں ان واقعات سے متأثر ہو کر ذیل کے پر تاثیر اشعار لکھتے ہیں۔ پس منظر ہنگامی واقعات کا ہے، لیکن فکر و احساس میں آفاقی رنگ جھلک رہا ہے۔ قطع نظر موضوع کی وسعت و ہمہ گیری کے، ان اشعار میں تغزل کا انداز جو لطف و کیف پیدا کر رہا ہے، وہ اُردو کے شعری سرمائے میں بیش قیمت اضافہ ہے:

غم امت میں ہے چشم پیمبرؐ اشکبار اب بھی
گہر بیزی میں ہے مصروف ابر نو بہار اب بھی
ہوا ہے دامن گل چیں ہی کوتہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ و گل اور وہی ان کی بہار اب بھی
دل وحشی سے اس پھندے میں اُلجھا ہی نہیں جاتا
ہے برہم ورنہ پہلے کی طرح زلف نگار اب بھی
اگر پہلو میں دل ہو اور تڑپ اسلام کی دل میں
برس سکتا ہے ابر رحمت پروردگار اب بھی
سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں
نگاہ لطف ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی
گر اپنے خوں سے کرسکتا ہو تو اس کی حنا بندی
عروس ملک ہوسکتی ہے تجھ سے ہم کنار اب بھی
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
اچھالی جس نے ہر طوفاں میں کشتی اہل ایماں کی
مسلمانوں کا بیڑا کر وہی سکتا ہے پار اب بھی
وہی ہے رشتہ جس نے ترک کا افغان سے جوڑا
وہی ہے اُن کے اعدا کو جو کرسکتا ہے خوار اب بھی

وہی ہے جس کے لطف خاص کے دیرینہ صدقے میں
اخوت ہے مسلمانان عالم کا شعار اب بھی
مسلمانوں کی پھر منظور تھی اس کو سر افرازی
خدا نے کر دیا پیدا امان اللہ خاں غازی

انہی ھنگامی حالات میں ذیل کے رجزیہ اشعار (لمعات) تخلیق ہوتے ھیں - ان اشعار میں بھی تغزل کا رنگ موجود ھے لیکن لہجے میں دبدبہ اور شکوہ ھے جو اسلام کی حریت پرور روایات کا حاصل اور ظفر علی خاں کے مزاج کا خاصہ ھے:

میانوں سے نکل آئیں تڑپ کر پھر وہ شمشیریں
پلٹ دی ہیں جنہوں نے مشرق ومغرب کی تقدیریں
وہ شمع مہر سیما پھر نگار آرائے محفل ہے
ہیں پروانے کی خاکستر میں رقصاں جس کی تنویریں
پڑا ہے زلزلہ دنیا میں پھر لزبن سے پیکن تک
بلند اک ساتھ ہوتی ہیں مسلمانوں کی تکبیریں
جکڑ سکتیں نہیں زندانیان حق کو ہتھکڑیاں
عبث ہیں سب یہ ترکیبیں غلط ہیں سب یہ تدبیریں
جنوں جب کار فرما ہو تو کام آتی نہیں اصلا
یہ تادیبیں یہ تہدیدیں یہ تنبیہیں یہ تعزیریں
دھواں اٹھے تو سمجھو شعلہ بھی ہوگا بلند اس سے
نمایاں خود بخود آہوں سے ہو جاتی ہیں تاثیریں
ادھر انگورہ و کابل ادھر بغداد اور دہلی
وہ سب رحمت پیمبرؐ کی یہ سب امت کی تقصیریں
امان اللہ خاں اور مصطفیٰ کو دیکھ لو جا کر
نہ دیکھی ہوں اگر اسلام کی غیرت کی تصویریں

ظفر علی خاں کو برعظیم پاکستان و بھارت کی سیاسی زندگی میں ایک اھم مقام حاصل رھا - ایک سیاسی رھنما کی

حیثیت سے جماعتوں کی قیادت اور جلسوں کی خطابت کے علاوہ ایک شاعر، ادیب اور صحیفہ نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے عملی سیاست میں بھرپور حصہ لیا ۔ ایک بدیہہ گو شاعر جب زندگی کی شورش و پیکار میں بھی بنفس نفیس شریک ہوتا ہے تو اس کے فن کا اس شورش حیات سے الگ رہنا غیر ممکن ہے ۔ چنانچہ ظفر علی خاں نے زبان و قلم کے دوسرے حربوں کے علاوہ فن شعر سے بھی گرز گراں کا کام لیا ۔ اُن کی شاعری کا بیشتر سرمایہ ہنگامہ و پیکار کی پیداوار ہے ۔ ان میں سے بعض ہنگامے معمولی تھے بعض غیر معمولی ۔ جب ہر ہنگامے اور ہر واقعے کو منظوم کرنے اور کرانے کا سلسلہ شروع ہو جائے (کیونکہ بہت سی نظمیں جلسوں اور مجلسوں میں بطور فرمائش تخلیق ہوئی ہیں)، تو ظاہر ہے کہ اس شعری سرمائے میں ایسی صحافتی چیزیں بھی شامل ہو جائیں گی جن کی اہمیت صرف وقتی ہوتی ہے ۔ لیکن جو ہنگامے برعظیم کی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے، ان کی منظوم روداد اتنی قیمتی ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری میں ہر طرح کی نظمیں ہیں ۔ اگر اُن کے اس شعری سرمائے کو تاریخ کے ایک اہم ترین دور کی منظوم یاد داشت کے طور پر بھی دیکھا جائے تو اس کی بڑی اہمیت ہے لیکن محض یاد داشت کے علاوہ اس میں ایسا سرمایہ بھی موجود ہے جو فن کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس میں جذبات و

احساسات بھی ھیں اور تاثرات و تخیلات بھی، جنھیں شعریت اور تغزل کے اندر سمو کر اس بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ھے کہ ھنگامی حالات کی پیداوار ھونے کے باوجود انھیں دوامی قدر و قیمت کا حامل کہا جا سکتا ھے۔ اس شعری سرمائے کی مقدار اچھی خاصی ھے۔ اگر اس کا کوئی معقول انتخاب (مع ضروری حواشی) ھو جائے تو جد و جہد آزادی کی پر کیف منظوم روداد کے علاوہ اعلیٰ شاعری کے بیش قیمت نمونے بھی یکجا ھو کر سامنے آسکتے ھیں۔ ھم اس شعری سرمائے سے صرف چند نظمیں بطور نمونہ یہاں پیش کرتے ھیں جن میں جہاد آزادی کے چند نازک مرحلوں کی نشان دھی کی گئی ھے۔ دیکھیے ان نظموں میں مسلسل سیاسی نشیب و فراز کی بدولت کتنا گہرا ربط پیدا ھو گیا ھے۔

ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ھے کہ ھوم رول تحریک (۱۹۱۶ع) کے لبرل رجحان[1] کے بعد وہ اُن انقلابی رجحانات کے نمائندے تھے جو تحریک خلافت اور ترک موالات میں پیدا ھوئے۔ اس ھنگامہ خیز دور میں ظفر علی خاں تنہا ایک ایسے فن کار تھے جو اپنے قول اور عمل سے اجتماعی شورش و پیکار میں بھرپور حصہ لے رھے تھے۔ اس

---

(۱) اس رجحان کے بڑے نمائندے چکبست تھے جن کی شاعری لبرل سیاست کے اس مرحلے پر آ کر رک جاتی ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

لیے اُن کے فن میں جذبے کا خلوص اور مقصد کی صداقت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

برعظیم کی سیاسی محکومی، معاشی استحصال اور اخلاقی و معاشرتی زوال میں سامراج کے ہتھکنڈوں کے علاوہ خود ہندوستانیوں کی ناعاقبت اندیشی کو بھی خاصا دخل تھا۔ انھوں نے اپنے خون سے استعمار کے پودے کو سینچا۔ اپنی ملکی بادشاہت کے مقابلے میں اسے کامیاب و کامران بنایا۔ خود برباد ہوئے، اسے آباد کیا۔ جنگ عظیم چھڑی تو اسی دیرینہ روایت کے مطابق دس لاکھ فرزندانِ ہند کو انگریزی شہنشاہیت کے بچانے کے لیے حرب و پیکار کی بھٹی میں جھونک دیا، لیکن ان سب وفاداریوں کا صلہ کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ، طوق و سلاسل، جلیانوالہ، مارشل لا! یہ تھا محکوم ہندوستانیوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا ماحصل! اس سارے پس منظر کو ظفر علی خاں کی ایک مختصر سی نظم "ڈیڑھ سو سال کی وفاداری کا صلہ" میں ملاحظہ فرمائیے:

ہو کسی طرح مجھ سے خوش انگریز — میری کوشش یہ انتہائی تھی
میں نے اپنے غرور کی گردن — اس کی دہلیز پر جھکائی تھی
میں جو حاکم تھا خود بنا محکوم — یہ بھی اک شان کبریائی تھی
اس کے قدموں میں ڈال دی لا کر — باپ دادا کی جو کمائی تھی
تاکہ بڑھ جائے آبرو اس کی — اپنی توقیر خود گھٹائی تھی
اس کی خاطر نہ کی جو اپنوں سے — کون سی ایسی وہ برائی تھی
آج میں ہوں اور اس کی ٹھوکر ہے — کہ اسی تک مری رسائی تھی
آج روتا ہوں میں کہ کیوں میں نے — اپنی بنیاد آپ ڈھائی تھی

میں نے اپنے کیے کا پھل پایا اس سے کی میں نے کیوں بھلائی تھی
کہہ گئے خوب میرزا غالب "کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا"

پہلی جنگ عظیم کے بعد ظلم و استبداد کا جو نیا دور آیا، اس نے سارے ملک میں بیداری کی تیز رو دوڑا دی۔ جلیانوالہ کے خونین سانحے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاسی انقلاب کا ولولہ پیدا کر دیا۔ شہیدان وطن کے لہو کا قطرہ قطرہ قصر آزادی کی آرائش کا سامان بننے لگا۔ "فانوس ہند کا شعلہ" انہی جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغ منقل جاں ہو گئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشر ستاں ہو گئیں
جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
مرحبا اے نو گرفتاران بیداد فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدان وطن کے خوں کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

اندرون ملک کے ہیجان و اضطراب کے ساتھ ساتھ بیرون ملک کے سانحات و حادثات علی الخصوص ترکوں کی شکست، مقامات مقدسہ اور دارالخلافت (استنبول) پر اتحادیوں کا اور سمرنا

پر یونانیوں کا قبضہ اور ترک آبادی کا قتل عام، ان دلخراش واقعات نے ہندوستانی مسلمانوں کو آتش بداماں کر دیا تھا۔ خلافت عثمانی کے دم واپسیں پر اسلامیان ہند کے غم و غصے اور جوش و خروش کی جو حالت تھی، اس کی جھلک "خروش مسلم" کے چند اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:

زمیں تھرّا گئی آوازۂ اللہ اکبر سے
خروش مسلم شوریدہ شرماتا ہے تندر کو
جلایا اس نے مردوں کو باذن اللہ قم کہہ کر
جگایا اُس نے ایک آواز میں ہندوستاں بھر کو
لگا دی سب کے دل میں ایک ساتھ اس نے لگن اپنی
ملایا اس نے مالا بار کی سرحد سے خیبر کو
مسیحیت مسلمانی سے ٹکرائی تو ہے لیکن
کسی نے آج تک شیشے سے توڑا بھی ہے پتھر کو
ڈراوا دے رہے ہیں کیا وہ ہم کو طوق و جولاں کا
پہنتا ہے خوشی سے مومن اس ایماں کے زیور کو

ان داخلی و خارجی حالات کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کے مختلف عناصر باہم متحد و متفق ہو کر مغربی استعمار کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ چنانچہ ظفر علی خاں ہندوستان کی سب قوموں کو وطن کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اور دم توڑتے ہوئے سامراج کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہیں "دعوت عمل" دیتے ہیں:

اگر تم کو حق سے ہے کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ
حکومت کو تم نے لیا آزما
اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ

ہو تم جس کے ذرے وہ ہے خاک ہند
چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ
فلک پہ مہ و مہر پڑ جائیں ماند
زمیں پر اس انداز سے جگمگاؤ
ہمالہ بھی آ جائے گر راہ میں
تو ٹھکرا کے آگے سے اس کو ہٹاؤ
کرے تم سے گنگا بھی گر بے رخی
پلٹ کر اُلٹ دو تم اس کا بہاؤ
زمانے میں روشن کرو نام ہند
ہر اقلیم میں اس کا سکہ چلاؤ
ہر اک ملک کا ہاتھ میں لے کے دل
ہر اک قوم سے اپنی عزت کراؤ
پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں
وہاں تم مسلمان کا خوں بہاؤ
زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار
تو اس پر بساط اخوت بچھاؤ
بھریں گے یہ برسوں میں جا کر کہیں
مسلماں کے پہلو کے گہرے ہیں گھاؤ
پرانا ہوا دفتری اقتدار
سمجھ لو اب اس کا بھی ہے چل چلاؤ
کسی روز خود غرق ہو جائے گی
بہت بہہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ!

۱۸۵۷ع کے بعد ۱۹۱۹ع میں برعظیم کے باشندوں کو جس نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، اس سے عہدہ برآ ہونے کے سامان بھی قدرت نے فراہم کر دیے۔ سب سے بڑا مسئلہ ہندوستان کے مختلف عناصر علی الخصوص ہندو مسلمانوں کی مفاہمت کا تھا۔ کیونکہ آزادیٔ ہند کی کوئی تحریک بھی

ان دونوں کے اتحاد کے بغیر پنپ نہیں سکتی تھی - کانگرس اور مسلم لیگ ایک دوسری کے قریب آ گئی تھیں ، لیکن عوام کے درمیان کدورت کی خلیج ابھی تک حائل تھی - جبر و استبداد کی آندھی نے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہمسایوں کو دوبارہ گلے ملنے پر مجبور کر دیا ، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح باہم شیر و شکر ہوئے کہ جیسے کبھی جدا ہی نہیں ہوئے تھے - بقول ظفر علی خاں :

آئی ہیں آسماں سے چل کر وہ قوتیں
جو مسلم اور ہنود کو شیر و شکر کریں

دسمبر ۱۹۱۹ع میں امرتسر میں (جس سرزمین کو چند ماہ پیشتر ہندو ، مسلمانوں، سکھوں کے مشترکہ خون نے لالہ زار کیا تھا) ہندوستان کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کے جلسے ایک ساتھ منعقد ہوئے - اس میں انہوں نے متحدہ جد و جہد پر اتفاق کیا اور گاندھی جی کو پروگرام بنانے کا اختیار دے دیا - ۱۹۲۰ع میں کلکتہ کے اجلاس خصوصی میں ہندوستان کے تمام نمائندوں نے متفقہ طور پر گاندھی جی کی زیر سر کردگی ، تحفظ خلافت اور سواراج کے حصول کے لیے ترک موالات اور عدم تشدد کا پروگرام منظور کرکے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے خلاف پر امن بغاوت کا اعلان کر دیا ! ظفر علی خاں اس تاریخی واقعے کو کس دلکش اور پرجوش پیرائے میں بیان کرتے ہیں :

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریباں کر دیا

سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز
کتنا بڑا یہ ملک پر احسان کر دیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد
گویا انہیں دو قالب و یک جان کر دیا
اوراق جبر و جور و جفا کو بکھیر کر
شیرازہ سلطنت کا پریشان کر دیا
ظلم و ستم کی ناؤ ڈبونے کے واسطے
قطرے کو آنکھوں آنکھوں میں طوفان کر دیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر
سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا
پروردگار نے کہ ہے وہ منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

جہد و عمل کا بازار گرم ہوتا ہے۔ حکومت کے عطا کردہ خطابات و اعزازات واپس کر دیے جاتے ہیں۔ عدالتوں اور سرکاری اداروں کے مقاطعے کی مہم تیز ہوجاتی ہے۔ ہزاروں مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہزاروں پابند سلاسل ہو جاتے ہیں۔ فروری ۱۹۲۲ع تک سب رہنما گرفتار ہو چکے تھے، صرف گاندھی جی زندان سے باہر تھے۔[۱]

(۱) یہی موقع تھا جب لسان العصر اکبر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہنے سے چند روز قبل (۱۹۲۱ع میں) یہ شعر کہے تھے: (بقیہ ص ۲۰۵ پر)

آخر کار وہ وقت بھی آ جاتا ہے ۔ استعمار کے خفیہ حربے حرکت میں آتے ہیں ۔ ''پالسی'' اور تشدد کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ حکومت کے تشدد سے عوام مشتعل ہونے لگے ۔ ان کے جوش کو قابو میں رکھنے والا کوئی رہنما باہر نہیں تھا ۔ مالا بار کے موپلوں نے سر اٹھایا تو حکومت نے وحشیانہ تشدد سے انہیں کچل دیا ۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں چوراچوری کے حادثے سے متأثر ہو کر گاندھی جی نے سول نافرمانی کا پروگرام معطل کر دیا ۔ عوام کے آتشیں جذبات سرد پڑ گئے ۔ حکومت نے موقع کو غنیمت جان کر گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا ۔ ''پالسی'' کے لیے اب میدان صاف تھا ۔ ہندو مسلم اتحاد کے تانے بانے کو منتشر کرنے کے لیے فرقہ پرست رہنماؤں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ شروع ہوا ۔ ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی فتنہ انگیز تحریکوں کو ہوا دی گئی اور اس کے نتیجے میں جابجا فرقہ وارانہ فسادات کا بازار گرم ہونے لگا ۔ ظفر علی خاں تاریخ کے اس المیے کو چند اشعار میں قلم بند کر دیتے ہیں ۔ حسرت و درد کی کیفیت نے ان اشعار میں کتنا سوز و گداز بھر دیا ہے ۔ پیمانۂ سخن مذکورہ بالا نظم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴)

پوچھتا ہوں ''آپ گاندھی کو پکڑتے کیوں نہیں ؟''
کہتے ہیں ''آپس ہی میں تم لوگ لڑتے کیوں نہیں؟
پیچ قسمت کے تمہارے جب دکھائیں گے کجی
عادلانہ رنگ میں اٹھ کر کریں گے ہم ججی!''

ہی کا چل رہا ہے، لیکن اس موقع پر شاعر منٹگمری کے زندان میں محبوس ہے :

گاندھی کے اس بسائے ہوئے گھر کو آہ !
دست فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
خود اس فدائے قوم کو چھ سال کے لیے
سرکار ذی وقار کا مہمان کر دیا
قسمت نے ڈال کر اسے قید فرنگ میں
ہندوستاں کے جسم کو بے جان کر دیا
جاتے ہی اس کے ملک کی صورت بدل گئی
انساں نے اپنے آپ کو حیوان کر دیا
فتنہ کہیں کیا جو ملیبار کا بپا
پیدا کہیں پہ قضیۂ ملتان کر دیا
جاں سنگھٹن سے ہو گئی خطرہ میں مبتلا
شدھی نے بڑھ کے رخنہ در ایمان کر دیا

اور پھر اسی عالم میں سمرنا میں ترکان احرار کی فتح و کامرانی کا مژدۂ جاں فزا بھی سننے میں آتا ہے، لیکن اس مسرت و خوشی کے ساتھ حسرت و غم کے جذبات بھی ملے ہوئے ہیں :

ایماں نے آ کے شعلۂ غیرت کو دی ہوا
روشن چراغ دودۂ عثماں کر دیا
عثمانیوں کے خنجر خارا شگاف نے
یورپ کے کافروں کو مسلماں کر دیا
دین مبیں کے مجد و شرف کے لزوم کو
تمہید عہد نامۂ لوزان(۱) کر دیا

---

(۱) سوئٹزر لینڈ کا ایک شہر ۔ یونانیوں کی شکست کے بعد یہاں ترکان احرار اور اتحادیوں کے درمیان صلح کانفرس منعقد ہوئی تھی ۔

''مشرق کو زندہ کر نہیں سکتا خدا بھی آج''
مغرب کے اس عقیدہ کا بطلان کر دیا
اس فتح نے زمانہ میں جس کی نہیں نظیر
سارے جہاں کی عقل کو حیران کر دیا
پھر ماجرا یہ کیا ہے کہ اپنی ہی فتح نے
اہل وطن کو سر بگریبان کر دیا
کس سمت سے ہوا یہ چلی جس نے یک بیک
دانشوران ہند کو نادان کر دیا
کیا سوچ کر انھوں نے جو تھے مصلحت پسند
ہر مصلحت کو گائے پہ قربان کر دیا
اپنے کیے پر آپ پشیمان ہو گئے
اپنے چمن کو آپ بیابان کر دیا
وا حسرتا کہ ہند کی آپس کی پھوٹ نے
خالی حریف کے لیے میدان کر دیا

اس کے بعد برعظیم کی سیاسیات میں جو نشیب و فراز آتے ھیں، آپس کی پھوٹ جو رنگ لاتی ھے، اور اسے دیکھ کر ایک وطن دوست انسان کو جو دکھ اور افسوس ھوتا ھے، شاعر اس کا اظہار ''فریاد جرس'' میں کرتا ھے:

کل کہہ رہے تھے ایک محب وطن بزرگ
ہندوستان رہنے کے قابل نہیں رہا
انساں سے چھین لی گئی آزادیٔ ضمیر
لیلیٰ کے ناقہ کے لیے محمل نہیں رہا
تھا دشنہ حق کا تیز بھی خونریز بھی مگر
کچھ دن سے در خور رگ باطل نہیں رہا
لندن کی عافیت کبھی جس سے ہوئی تھی تنگ
زنداں میں اب وہ شور سلاسل نہیں رہا

سچ اور جھوٹ میں نہیں باقی رہی تمیز
اور امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا
ہم آپ اپنی راہ کے سنگ گراں بنے
رہ رو کو فکر دوریٔ منزل نہیں رہا
آزادیٔ حیات کی جس دل میں تھی تڑپ
اب پہلوئے وطن میں وہی دل نہیں رہا
جو کوشش آشتی کی ہوئی رائیگاں گئی
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا
پھر کس لیے یہ شکوہ کہ لطف خدائے پاک
ہندوستاں کے حال کو شامل نہیں رہا
ہندو کی آنکھ کاش زمانہ ہی کھول دے
مسلم تو اپنے فرض سے غافل نہیں رہا

ظفر علی خاں کی مذکورہ بالا چند نظموں کے مطالعے سے اس دور کی سیاسی صورت حال کے نقوش بہت حد تک واضح ہو جاتے ھیں۔ ان نظموں میں فکر کی زیادہ گہرائی نہیں۔ مشاھدات کا تجزیہ بھی کم ھے۔ علت و معلول سے شاعر کو زیادہ سروکار نہیں۔ وہ جوش جذبات میں گرد و پیش کی پر خطر گھاٹیوں سے بے نیاز محاربۂ عمل میں تیزگام ھے۔ وہ اپنے اشعار کی رجز خوانی سے دوسروں کو بھی للکارتا پکارتا ھوا چلتا ھے، اور اپنے حوصلے میں بھی جولانی پیدا کر لیتا ھے۔ ان نظموں میں ایک ایسے دور کی ترجمانی ھوئی ھے، جو بڑا ھنگامہ خیز تھا، لیکن اس کے ساتھ ھی تاریخی اعتبار سے بھی بڑا اھم تھا۔ ھر چند کہ ظفر علی خاں کی ان نظموں میں مفکرانہ گہرائی نہیں پائی جاتی۔ ان میں ھنگامی جوش و خروش کا

لاوا ابلتا ھوا نظر آتا ھے ۔ ان میں وقت کی رفتار کو الٹ پلٹ دینے کا جارحانہ انداز پایا جاتا ھے ۔ بااین ھمه ان نظموں میں خلوص ، صداقت ، وطن دوستی اور حریت پسندی کے جذبات موجزن ھیں ۔ یه نظمیں جد و جہد آزادی کی آئینه دار ھیں ۔ ان میں درس عمل بھی ھے اور دعوت فکر بھی ، اور پھر یه تاریخ کے ایک ایسے دور کی ترجمان ھیں جس میں برعظیم کی قسمت کا فیصله ھو رھا تھا ۔

اب ذرا ھنگامی سیاست کی وقتی پیداوار کے دو نمونے ملاحظه فرمائیے ۔ شاعر کی قادر الکلامی میں شبہه نہیں ۔ زبان و بیان پر قدرت نے اسے ان زٹلیات میں بھی ید طولیٰ بخشا ھے ۔ اس سے اس امر کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ھے کہ شاعر جب عملی سیاست میں ھنگامی پروپیگنڈے کی خاطر شعری حربے کو استعمال کرتا ھے تو شاعری جذبے و احساس کے بلند مقام سے نیچے اتر کر کتنی پست سطح پر آ جاتی ھے ۔ بہر کیف ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری کے اس پہلو کے ذکر کے بغیر یه جائزہ نامکمل رھے گا ۔ لہٰذا اس قسم کی دو نظمیں درج ذیل ھیں ۔ پہلی نظم ھے ''سیاسیات کا دنگل'' :

دفتر پنجاب ہے جنگل سیاسیات کا
بن گیا میرا قلم منگل سیاسیات کا
پہلوان اور ان کے پٹھے آ گئے خم ٹھونک کر
دیدنی ہے آج کل دنگل سیاسیات کا
گالیاں دے ، جھوٹ بول ، احرار کی ٹولی میں مل
نکته یوں ھی ھو سکے گا حل سیاسیات کا

پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم
مانگتے پھرتے ہیں کیوں کاجل سیاسیات کا
خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہیے اس کو "بابا ٹل" سیاسیات کا
کیا تماشا ہے کہ زلف شرع کی مشاطگی
کر رہا ہے آج دست شل سیاسیات کا
ہے بہت آسان کھانا سینے پر گینتی کی ضرب
ہے بہت مشکل چلانا ہل سیاسیات کا
دیکھ لے مظہرعلی اظہر کو افضل حق کے ساتھ
ایک پدی دوسرا جھانپل سیاسیات کا
مجلس احرار کے نیفے کی رونق بن گیا
ایک پسو دوسرا کھٹمل سیاسیات کا
ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدین ہیں زیر
یہ دمن اس عہد کی وہ نل سیاسیات کا

امرتسر کی ایک انتخابی جنگ میں پنجاب مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے مسلم لیگ کا ٹکٹ کسی دوسرے صاحب کو دے دیا، جو ظفر علی خاں کے نزدیک غیر مستحق تھا، انہوں نے مستحق نمائندے کو انتخاب کے لیے کھڑا کیا اور بقول خود "مقاصد انتخاب کے لیے پروپیگنڈا کے طور پر اسے اسلام کا ٹکٹ دے دیا، جس نے اسے کامیاب کرا کر چھوڑا۔" (چمنستان، صفحہ ۱۷۹) اب ذرا پروپیگنڈا شاعری کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

ہے لیگ کا اُدھر، ادھر اسلام کا ٹکٹ
وہ نام کا ٹکٹ ہے یہ ہے کام کا ٹکٹ
احرار ہوں کہ کانگرسی ہوں سب ایک ہیں
دونوں کے دونوں لے کے چلے رام کا ٹکٹ

احرار کٹ کے نور سے ظلمت میں جا ملے
وہ صبح کا ٹکٹ تھا یہ ہے شام کا ٹکٹ
الہام کا ٹکٹ ہمیں کعبہ سے مل گیا!
وہ لائے سومنات سے اوہام کا ٹکٹ
میرا ٹکٹ مجھے مرے اللہ نے دیا
اُن کو اگر ملا بھی تو اصنام کا ٹکٹ
آزادیٔ وطن انھیں ہوگی کہاں نصیب
جن کو ملا ہو گردش ایام کا ٹکٹ
اسلام کے ٹکٹ کا اڑائیں گے جو مذاق
دوزخ کو لے کے جائیں گے بے دام کا ٹکٹ

طنزیات و ھجویات :

ادب میں طنز و ھجو سے مراد کسی بے ھنگم حالت یا مضحک کیفیت کو ایسے فن کارانہ پیرائے میں پیش کرنا ھے جس سے پڑھنے سننے والوں کے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ھو۔ طنز نگار زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالتے ھوئے اس کے بے ڈھنگے پہلوؤں کے مرقعے کچھ اس دلچسپ انداز میں پیش کرتا ھے کہ ھمارا احساس اس کے خوب و زشت کے بارے میں متحرک ھونے لگتا ھے۔ طنز میں ایک شدت اور تلخی ھوتی ھے۔ طنز نگار اپنی بات منوانے کے لیے ھر حربہ استعمال کرتا ھے۔ اس کے برعکس ظرافت خوش مذاقی یا مزاح کی ایک ایسی صورت ھے جس میں مزاح نگار زندگی کی بے ڈھنگی حالتوں کو ھمدردانہ شعور اور دوستانہ رنگ میں دیکھتا اور دلکش پیرائے میں بیان کرتا ھے۔ طنز اور ظرافت کے ملاپ سے وہ اعلیٰ

درجے کا ادب پیدا ہوتا ہے جو زندگی میں اصلاح کا نقیب ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی مسرتوں میں اضافہ بھی کرتا ہے ۔

طنز کے تختۂ مشق بالعموم چار قسم کے موضوعات ہوتے ہیں ۔ (۱) افراد ۔ (۲) جماعتیں ۔ (۳) ادارے ۔ (۴) تحریکیں ۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر چیز ان موضوعات میں سما جاتی ہے ۔ شخصی مناقشے اور ذاتی مخاصمتیں افراد کی ذیل میں آجاتی ہیں ۔ جماعتوں میں کسی ملک و قوم کی سیاسی ، معاشرتی ، مذہبی ، علمی ، ادبی مجلسیں آجاتی ہیں ۔ اداروں میں حکومت کا نظام ، معاشرے کا ڈھانچہ ، تہذیبی ، تمدنی ، تعلیمی وغیرہ ہر طرح کے ادارے آجاتے ہیں ۔ اسی طرح تحریکوں میں دنیا بھر کی تحریکیں ، رجحانات اور نظریات آجاتے ہیں ۔ یہ بات طنز نگار کے اپنے زاویۂ نظر پر منحصر ہے کہ اس میں کس قدر محدودیت یا وسعت پذیری ہے ، اسی کے مطابق اس کے موضوع میں بھی پھیلاؤ ہوتا جائے گا ۔

طنز و مزاح کی بلند سطح کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو اردو شاعری اس سلسلے میں تین کامل الفن استاد پیش کر سکتی ہے ۔ پہلے بڑے فن کار مرزا محمد رفیع سودا ہیں جنھیں هجو کہنے کا یہ ملکہ تھا کہ بقول آزاد ذرا کسی پر تاؤ آیا "غنچہ" کو قلمدان لانے کے لیے کہا اور هجو تیار ہو گئی ۔ سودا کی هجویات کا موضوع افراد بھی ہیں ، معاشرے کے مختلف گروہ بھی ہیں اور حکومت کے ادارے بھی ۔ جہاں تک

سودا کی معاشرتی اور سیاسی ھجویات کا تعلق ھے یہ اُردو شاعری کی تاریخ میں طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ کہی جا سکتی ھیں ، اور اسی بنا پر سودا کو اس فن کا امام قرار دیا جاتا ھے۔ دوسرے بڑے فن کار اکبر الہ آبادی ھیں جنھوں نے اپنی معاشرتی و اخلاقی روایات کی حفاظت اور مغربی تہذیب و معاشرت کے طوفان بے تمیزی کی یلغار کو روکنے کے لیے اس حربے کا استعمال اس چابکدستی سے کیا کہ اپنے بیگانے سبھی داد دینے پر مجبور ھو گئے۔ اُن کے ھاں طنز کی شدت اور تلخی پر ظرافت کی شکر کچھ اس طرح چڑھی ھوتی ھے کہ پڑھنے سننے والے کے لیے یہ نیش بھی نوش بن جاتا ھے۔

اُردو شاعری میں طنز و مزاح کے تیسرے بڑے نمائندے ظفر علی خاں ھیں جن کی طنزیات کی حدود اتنی ھی وسیع ھیں جتنی کہ بیسویں صدی کے ھندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی وسیع ھے اور اُن کا اسلوب بھی منفرد خصوصیات کا حامل اور اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ھے۔ افراد ، جماعتیں ، ادارے اور تحریکیں سبھی ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری کی لپیٹ میں آ جاتے ھیں۔ بر عظیم پاکستان و بھارت کی سیاسیات کا کوئی پہلو اور اس سے وابستہ کوئی قابل ذکر فرد اُن کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا ھو گا۔ سیاسی جماعتوں و تحریکوں میں کانگرس ، مسلم لیگ ، خلافت کمیٹی ، مجلس احرار ، نیشنلسٹ ، لبرل ، سواراجی ، موالاتی ، ترک موالاتی وغیرہ مختلف اوقات میں

ظفر علی خاں کی مدح و قدح کی محور بنی ھیں - سیاسی اداروں میں انگریزی حکومت اور اس کے کاسہ لیس ھمیشہ اُن کے نشانۂ طنز بنے رھے - سماجی اداروں و جماعتوں میں انگریزی تہذیب و معاشرت، آریہ سماجی اور اُن کی فتنہ انگیز شدھی و سنگھٹن کی تحریکیں، اھل طریقت اور قادیانی فرقہ ظفر علی خاں کے ھدف طنز رھے - افراد کی مدح و ذم بھی اُن کا موضوع خاص رھا لیکن اس کا معیار چونکہ ذاتی نہیں بلکہ سیاسی عقائد و تصورات تھا، اس لیے ایک ھی شخص اگر ایک وقت مدح کے ھار پہن رھا ھے تو دوسرے وقت ھجو کے نوکیلے کانٹے اس کی تواضع کر رھے ھیں - جب تک کوئی شخص ظفر علی خاں کے خیال میں صحیح راہ پر گامزن رھا، وہ اُس کی تعریف و توصیف کر کے دل بڑھاتے رھے، جہاں اُس سے کوئی لغزش ھوئی یا ظفر علی خاں کے نقطۂ نظر سے وہ صحیح راہ سے بھٹکا، انھوں نے اپنے قلم کی توپ کا رخ اُس بد بخت کی طرف پھیر دیا - اب دنیا کی کوئی طاقت اسے طنز و ھجو کی اس شدید گولہ باری سے نہیں بچا سکتی - اُس کی سابقہ خدمات کو بھی سفارش کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا - اس لپیٹ میں معمولی افراد ھی نہیں بلکہ بڑی بڑی شخصیتیں آئی ھیں - گاندھی جی، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، پنڈت جواھر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر علی امام، قائد اعظم محمد علی جناح، سر محمد شفیع، ڈاکٹر سر محمد اقبال،

سر عمر حیات ٹوانہ، پنڈت مدن موہن مالوی، لالہ لاجپت رائے، سوامی شردھانند، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا حبیب الرحمان، مولانا داؤد غزنوی، چودھری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور بہت سے دوسرے صف اول و صف دوم کے اکابر اس فہرست میں آسکتے ھیں۔ ان میں شاید ھی کوئی ایسا فرد ھوگا جو کسی نہ کسی وقت اُن کا نشانۂ طنز نہ بنا ھو۔ ایسے خوش قسمت افراد کی تعداد بہت کم ھے جو ھمیشہ ظفر علی خاں کی مدح و ستائش کے مستحق رھے ھیں۔ ان خوش قسمتوں میں غازی امان اللہ خاں[1] کا نام سر فہرست ھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا بھی اسی طرح خوش قسمت ھوتے لیکن خلافت کی قبا چاک کر کے ترکی میں لادینی حکومت قائم کرنے کی وجہ سے وہ یہ مرتبہ حاصل نہ کر سکے۔ ان افراد کی ھجو کا یہ خوشگوار پہلو ھے کہ ظفر علی خاں کسی شخص کو ذاتی وجوہ کی بنا پر نشانۂ طنز نہیں بناتے بلکہ قومی اور ملی وجوہ کی بنا پر یہ رنگ اختیار کرتے ھیں۔ یہی صورت اُن کی مدح کی بھی ھے۔ اُن کو امان اللہ خاں سے محض اس لیے اُنس تھا کہ انھوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کیے تھے اور افغانوں کو پہلی بار آزادی کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ وہ لائڈ جارج اور ونسٹن چرچل سے ھمیشہ اس لیے متنفر رھے کہ اُن کی اسلام دشمنی کسی

---

(۱) شاہ افغانستان، جن کی حکومت کا تختہ ۱۹۲۹ع میں بچہ سقہ نے الٹ دیا تھا۔ بقیہ عمر یورپ میں گزاری۔ ۲۶۔ اپریل ۱۹۶۰ع کو زیورچ (سوئٹزر لینڈ) کے ایک ہسپتال میں وفات پائی۔

ثبوت کی محتاج نہیں تھی - گویا ظفر علی خاں کا افراد کی مدح کرنا یا ان کی ھجو کہنا بھی جماعتوں اور تحریکوں کی ذیل میں آجاتا ھے - جب تک وہ کانگرس کو حق پر سمجھتے رھے اس کی تعریف کرتے رھے، جب کانگرس اُن کے نزدیک راہ راست سے ھٹ گئی اور ایک ھندو نواز جماعت بن گئی تو وہ نہ صرف اس سے الگ ھو گئے بلکہ گاندھی، نہرو، آزاد وغیرہ جو پہلے مدح کے مستحق تھے، اب مورد عتاب ھو گئے - علی برادران سے خلافت اور مسئلۂ حجاز پر اختلاف ھوا، تو ھجویات کی گولہ باری اُن پر ھونے لگی - احراری رفیقوں سے جب مسئلۂ شہید گنج پر اختلاف ھوا، تو طنز و استہزا کے سارے حربے اُن پر استعمال ھونے لگے - غرض یہ کہ باردولی رزولیوشن سے لے کر قرارداد لاھور تک کوئی سیاسی نشیب و فراز اور اس سے متعلق کوئی شخصیت ایسی نہیں جو ظفر علی خاں کی مدح اور قدح کا موضوع نہیں بنی - اخباری معاصروں (خصوصاً ھندو اخبار نویسوں) سے الگ چشمکیں جاری رھیں -

صنعت کے اعتبار سے ظفر علی خاں کی طنزیات زیادہ تر بلا واسطہ یا بالتصریح کے زمرے میں شمار ھوتی ھیں - دوسری صنائع (بالواسطہ، بالکنایہ وغیرہ) بہت کم ھیں - ظرافت اور مزاح کی لطافت و شیرینی بھی ان کے ھاں کم ھے - یہ رنگ زیادہ تر وھاں ملے گا جہاں وہ نسبتاً خوشگوار فضا میں دادسخن دے رھے ھوں - مزاج کے اعتبار سے وہ شعلۂ جوّالا اور سیاسی مسلک

کی رو سے راست اقدام کے قائل تھے۔ ''فقیہ مصلحت بیں'' بن کر حق بات کے اظہار سے پہلوتہی کرنے کی بجائے انہیں ایسا رند بادہ خوار بننا گوارا تھا جو سچی بات بہرطور کہہ گزرے:

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

ظفر علی خاں کی شاعری کے اس پہلو کی وضاحت کے سلسلے میں چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ پہلے طنزیات لطیف کی چند مثالیں دیکھیے۔ ۱۹۱۹ء کی جنگ افغانستان کے بعد جب انگریزوں اور افغانوں میں صلح ہوئی تو کابل سے سید محمود طرزی ایک وفد لے کر معاہدۂ صلح کے سلسلے میں ہندوستان آتے ہیں:

عقدۂ دشوار مشرق کی کشائش کے لیے
وفد لے کر حضرت محمود طرزی آ گئے
ایشیا کا پیرہن یورپ کے ہاتھوں پھٹ گیا
بخیہ کرنے کے لیے کابل سے درزی آ گئے

حکومت نے ارکان وفد کو سیوائے ہوٹل مسوری [ایک پرفضا کوہسار] میں ٹھہرایا اور افغان مہمانوں کی خوب خاطر و مدارات کی گئی، تاکہ وہ اچھے تأثرات لے کر واپس جائیں۔ ہر طرح کا سامان عیش و راحت مہیا کیا گیا۔ رقص و سرود کی محفلیں بھی برپا ہوئیں۔ اتفاق سے انہی دنوں جواہر لال نہرو بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ حکومت کو خدشہ تھا کہ کہیں نہرو طرزی سے مل کر بنا بنایا کھیل بگاڑ نہ دیں، اس لیے

ان کو وہاں سے نکلوانے کی کوشش کی گئی۔ ظفر علی خاں کو ایک پرلطف مضمون ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے ایک نظم "سیوائے ہوٹل مسوری میں طبلے پر تھاپ" لکھ کر اس واقعے کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

حکومت کو نہرو سے خدشہ محسوس ہوتا ہے، سی۔ آئی۔ ڈی کی پہلی روح کہتی ہے:

جواہر لال نہرو لکھنئو سے چل کے آیا ہے
امان اللہ خاں کے نام کچھ پیغام لایا ہے
پٹھانوں اور انگریزوں میں ڈلوانے کو کھنڈت ہے
دبوچا چاہیے اس کو بڑا بے ڈھب یہ پنڈت ہے
کسی ڈھب سے اسے سیوائے ہوٹل سے سے نکلوا دو
نہ نکلے گر تو ٹوپی اس کی بٹلر سے اچھلوا دو

دوسری روح اس تجویز کے تاریک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے:

مگر یہ بھی سمجھ لو اس پہ سب افغان بگڑیں گے
ہمارے ویسرائے کے کابلی مہمان بگڑیں گے
کہیں گے حضرت طرزی یہ اچھی میزبانی ہے
کہ چمچہ بد تمیزی ہے تو کانٹا بد گمانی ہے

تیسری روح کہتی ہے:

سنو! دہلی سے ٹیلیفون کی آواز آتی ہے
ہمارے ساتھ یہ بھی شاید اپنا سُر ملاتی ہے

چوتھی روح آواز کو پہچان کر کہتی ہے:

نہیں یہ تو صدا ہے حضرت خواجہ نظامی کی
جنھوں نے ہجو لکھی ہے نصاریٰ کی غلامی کی

خواجہ حسن نظامی اپنے حجرہ رین بسیرا سے ٹیلیفون پر:

اے ہم نفسو! تم کو مبارک ہو مسوری
گر رزم سے اکتائے ہو، دل بزم سے بہلاؤ
رقاصیٔ بسمل کا تماشہ جو نہ خوش آئے
محفل میں کسی شوخ پری زاد کو نچواؤ
ملتی نہیں گر کوئی طرح دار پہاڑن
رنڈی کوئی اچھی سی بنارس ہی سے بلواؤ

پہلی روح کو ایک بات ہاتھ آ جاتی ہے :

نہ تھا معلوم خواجہ کو ہم اُن کی بات سن لیں گے
چمن میں چوری چوری جائیں گے اور پھول چن لیں گے
اسی حکمت سے ہم عہدہ برآ ہوں گے پٹھانوں سے
لبھانا چاہیے ان کو بنارس کے ترانوں سے
اِدھر ہوٹل کے کمروں سے نکالو جا کے نہرو کو
اُدھر لے آؤ پچھواڑے سے اک نوخیز مہرو کو

اس کے بعد محفل رقص و سرود منعقد ہوتی ہے اور بنارس کی نوخیز مہرو نغمۂ مبارکباد گاتی ہے :

مسوری میں طرزی کا آنا مبارک — حضوری میں بندی کا گانا مبارک
ترازو ہوا تیر امان اللھی کا — دل ہند کو یہ نشانہ مبارک
مسلمان ہندو گلے مل رہے ہیں — وطن یہ اچھا زمانہ مبارک
پٹاری اناروں کی کابل سے آئی — جو بیمار ہیں اُن کو کھانا مبارک
جو ہنستا ہے مغرب تو روتا ہے مشرق — ہنسانے سے بڑھ کر رلانا مبارک
سلامت رہے جارج پنجم کی دولت — اور اس کا دل آرا فسانہ مبارک
دعا ہے کہ ہوں ایک دہلی و کابل — محبت کی پینگیں بڑھانا مبارک

یہ خلاف توقع نغمہ سن کر سی - آئی - ڈی کی سب روحیں مل کر منہ بسورتی ہیں :

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

واقعہ معمولی سا ہے کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے محفل رقص و سرود بھی منعقد کی گئی - ظفر علی خاں چاہتے تو صاف الفاظ میں اس پر طنز کر سکتے تھے - لیکن انھوں نے اس واقعے کو زندہ رکھنے کے لیے اسے ادبی رنگ میں پیش کیا اور ایک دل چسپ منظوم ڈراما بنا دیا - اصل میں واضح تو یہ کرنا تھا کہ تم یہ تو برداشت کر سکتے ہو کہ رنڈیوں کو ہوٹلوں میں لاؤ لیکن یہ کیوں برداشت نہیں ہو سکتا کہ نہرو یا کوئی اور شریف ہندوستانی بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تمھاری حرکتوں سے آشنا ہو - اس میں کنایتہً خواجہ حسن نظامی پر بھی طنز ہے اور یہ مشورہ انہی کی طرف سے پیش ہوتا ہے - رقص و سرود نظامی صاحب کے صوفیانہ مسلک کا ایک ضروری جزو ہے اور اس قسم کی مشکلوں کے موقع پر آ کر خواجہ کی عقدہ کشائی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ہر وقت تیار ہیں - چونکہ اس زمانے میں شریعت اور طریقت کی آویزش کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ان بن تھی اس لیے وہ بھی رگیدے گئے[1] - ایک نظم (۱۹۳۴ع) میں خواجہ حسن نظامی کا دلچسپ حلیہ رقم کیا ہے :

صوفی بھی ہیں، رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

---

(۱) ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری، تابش صدیقی، کریسنٹ (۱۹۳۹ع) صفحہ ۱۵۸ -

سرگرمیاں سب اُن کی ہیں مذہب کے نام پر
جن میں کہیں کہیں ہے سیاست کا رنگ بھی
وہ کامیاب اگر ہیں تو اس کا یہ بھید ہے
دنیا کے ساتھ اُڑاتے ہیں دیں کا پتنگ بھی
دل بستگی ہے گر اُنھیں ساز حجاز سے
بجتا ہے اُن کے گھر میں طریقت کا چنگ بھی
ہوتے اُدھر ہیں رین بسیرا میں چلّہ کش
رکھتے اِدہر ہیں رن میں غزا کی اُمنگ بھی
کرتے ہیں میٹھی باتوں سے پتھر دلوں کو موم
کافر کے گھر لگاتے ہیں جا کر سرنگ بھی
حلیہ رقم کیا تو پکاری سلوچنا [۱]
ترکش میں خواجہ کے ہیں ادب کے خدنگ بھی
ہندوستان مان لے اپنا امام اُنھیں
گر چند روز کاٹ لیں قید فرنگ بھی

طنز لطیف کی ایک اور مثال دیکھیے - برطانوی وزیراعظم ایسکوِتھ ، جو اپنی اسلام دشمنی کے سبب خاصے بدنام تھے ، کا چالان ہوتا ہے ، عالم بیداری میں نہیں بلکہ خواب میں !

اس جرم میں کہ دشمن دین رسولؐ ہے
رات ''ایسکوِتھ'' کا خواب میں چالان ہو گیا
کہنے لگا کہ میری ضمانت تو دیجیے
لیکن میں جان بوجھ کر انجان ہو گیا
سید علی امام بھی تھے پاس ہی کھڑے
لیکن یکایک اُن کو بھی نسیان ہو گیا
اِتنے میں غل ''خذوہ فغلوہ'' کا ہوا
اور ''ایسکوِتھ'' حوالۂ شیطان ہو گیا

---

(۱) ایک فلم سٹار ، جس کا اس زمانے میں خاصا شہرہ تھا -

سر علی امام ان دنوں ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم تھے اور اپنی انگریز دوستی کی وجہ سے قوم پرستوں کے حلقے میں بڑے بدنام تھے ۔ تحریک خلافت کے زمانے میں سرکار آصفیہ نے غالباً حکومت ھند کے ایما پر ظفر علی خاں کا وظیفہ (پنشن) بند کر دیا ۔ ظفر علی خاں کے نزدیک یہ کارستانی سر علی امام کی تھی ۔ بعد ازاں سر علی امام نے جب قومی سیاست میں حصہ لے کر اپنی پچھلی فروگزاشت کی تلافی کر دی تو ان کی شان میں یہ مدحیہ اشعار کہے گئے :

سروں کے ذکر پر اک دوست نے سوال کیا
کہ اس گروہ میں کچھ لوگ نیک نام بھی ہیں
مری نظر میں تو سب سر ہیں نفس کے محکوم
اور اس کے ساتھ ہی سرکار کے غلام بھی ہیں
دیا جواب یہ میں نے کہ ان کو کچھ نہ کہو!
اسی گروہ میں سید علی امام بھی ہیں
مئے حجاز نہ پینے کا عہد باندھ کے اب
شکست توبہ میں سرگرم اہتمام بھی ہیں

آخری شعر میں سرعلی امام کی سابقہ غلطیوں کی طرف اشارہ بھی موجود ھے ۔

ظرافت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے ۔ اس میں اکبری رنگ جھلک رہا ھے ۔ فرشتے انگریزوں کو غم کھانے کا الٹی میٹم دیتے ھیں :

کچھ تو انگریزوں کو بھی یا رب دیا ہوتا کبھی
تو نے کیوں سارے زمانے کا ھمیں غم دے دیا

یہ گلہ سن کر فرشتوں نے کہا بد دل نہ ہو
ہم نے آج اُن کو بھی اپنا الٹی میٹم دے دیا

مارشل لاء کی لاقانونیت کے سلسلے میں راست اقدام ھجو کا ایک نمونہ دیکھیے:

حق کا نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہے
فرماتی ہے سرکار کہ قانون یہی ہے
خود محتسب وقت ہے اک رند بلا نوش
مے سے نہ کر انکار کہ قانون یہی ہے
ہے جرم یہ جس کا کہ خدا ایک ہے اُس کا
ہوگا وہ گرفتار کہ قانون یہی ہے
پھٹ جائے جو تلی تو نہ ٹھوکر سے گلہ کر
مر کر بھی نہ دم مار کہ قانون یہی ہے
کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگ کر اُن کو
شکریہ کے دے تار کہ قانون یہی ہے

اس قطعے کے تیسرے شعر کو اکبر کی زبان میں یوں پڑھیے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مشرقی اور مغربی تہذیب کی آویزش کے سلسلے میں ظفر علی خان کا رویہ عام طور پر جارحانہ اور براہ راست طنز کا ہوتا ھے۔ نئی تہذیب کے بارے میں ان کا یہ مشہور شعر، جسے وہ اکثر بڑے پر زور انداز میں [''حرامزادی'' پر خاص زور دے کر] تقریر کے دوران سنایا کرتے تھے، اسی رویے کا حامل ھے:

تہذیب نو کے منہ پر وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے

لیکن کبھی کبھی وہ نسبتاً اعتدال پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے دلچسپ طنزیہ انداز میں مغربی تہذیب پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ''لندن'' پر ان کی طویل نظم اسی رجحان کی نمائندہ ہے۔ ''لندنی معشوقہ اور دہلوی عاشق'' میں بھی طنز کا وہ انداز ہے جس میں اکبری ظرافت کا رنگ نمایاں ہے[1]:

اِک سنہرے بالوں والی میم نے ہنس کر کہا
اپنے اک ہندوستانی عاشق مفتون سے
میں نے یہ مانا کہ تم کھاتے چھری کانٹے سے ہو
شوق رکھتے ہو قمیص و کالر و پتلون سے
بنگلے میں رہتے ہو اور چڑھتے ہو موٹر کار پر
بیٹھتے ہو پاٹ پر دھوتے ہو منہ صابون سے
توڑتے ہو ٹانگ انگریزی کی اُٹھتے بیٹھتے
بات جب کرتے ہو تم کرتے ہو ٹیلیفون سے
کرتے ہو ہر موسم گرما میں لندن کا طواف
پاؤں آ جاتا ہے چکر میں تمہارا جون سے
لیکن آخر تم وہی کالے مچھندر ہی تو ہو
رنگ یورپ اُڑ گیا جس کی رگوں کے خون سے
یہ تمہاری جیب تھی جس پہ مرا دل آ گیا
ورنہ میں اور اختلاط ایسے سگ مختون سے

سیاسی طنزیات کے سلسلے میں افراد کی ہجو ظفر علی خاں کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر افراد وہ

---

(۱) یہ نظم جب ''زمیندار'' میں چھپی تو ایک معاصر نے غلط فہمی کی بنا پر یہ نظم اکبر الہ آبادی سے منسوب کر دی۔ ۱۰ فروری ۱۹۱۲ع کے زمیندار میں ''دھوکے میں نجات ہوگئی'' کے عنوان سے ظفر علی خاں نے اس غلط فہمی کو دور کیا۔

هیں ، جو پہلے ظفر علی خاں کے رفیق سفر اور وہ ان کی مدح میں رطب اللسان رہے تھے ۔ لیکن نظریاتی اختلاف جب شدید معارضے کی صورت اختیار کر جاتا ، تو پھر ظفر علی خاں کی ھجویاتی گولہ باری یوں ھوتی کہ حریف کو اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ھو جاتا ۔ اس رزم آرائی میں بھی پرانی رفاقت اور دوستی کا احساس دبی زبان سے اس درد و الم کا اظہار کیے بغیر نہ رہتا :

انقلاب زمانہ دیکھیے گا کل جو تھے دوست آج ہیں دشمن

علی برادران (محمد علی و شوکت علی) سے مسئلۂ حجاز اور مرکز خلافت کے سلسلے میں اختلاف ھوا ، اور پنجاب کی خلافت کمیٹی مجلس احرار کے قالب میں ڈھل گئی ۔ علی برادران سے معارضے کی صورت پیدا ھوئی تو ھجویات کی بوچھاڑ شروع ھو گئی ۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
انگشت رام پور کا پنجاب کی طرف
ہگلی کے گھاٹ پر وہ اشارا کہ ہائے ہائے
عبرت کی آنکھ کھول کے آپس کی پھوٹ کا
دیکھا وہ جاں خراش نظارہ کہ ہائے ہائے
آزادیٔ وطن کی تڑپ نے ہنود میں
وہ دل نواز جذبہ ابھارا کہ ہائے ہائے
ان میں وہ اتفاق کی طاقت کہ واہ وا
ہم میں وہ اختلاف کا یارا کہ ہائے ہائے

ملت کی آبرو سے علی بھائیوں کی ضد
لانے لگی وہ رنگ خود آرا کہ ہائے ہائے
بنگالہ کے اُفق میں کچھ ایسا ہوا غروب
اِن دونوں بھائیوں کا ستارا کہ ہائے ہائے!

"ترک موالات" کی تحریک شروع کرکے جب گاندھی جی نے حکومت کے خلاف پرامن جنگ کا اعلان کیا تھا، تو ظفر علی خاں نے کتنے جذب و خلوص سے یہ کہا تھا:

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

یہی گاندھی جب کانگرس کی ہندوانہ ذہنیت کے مظہر بن جاتے ہیں تو ظفر علی خاں ان کی شان میں یہ فرماتے ہیں:

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اِک ساورکر اِک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اُٹھتی آندھی ہے
منہ پر ہے صدا آزادی کی اور دل میں ہے شوق غلامی کا
اُکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی ان دونوں نے مل کر باندھی ہے

سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر پنجاب کے سرکار پرست مسلمان اکابر میاں سر محمد شفیع کی قیادت میں اپنی علیحدہ مسلم لیگ قائم کر لیتے ہیں اور حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے

---

(۱) مولانا محمد علی کی وفات کے بعد مولانا شوکت علی سے جب مسلم لیگ میں ہم آہنگی ہو گئی تو گلے شکوے جاتے رہے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۸ع کو "یوم محمد علی" کی تقریب پر ظفر علی خاں نے صدارت کرتے ہوئے حاضرین کی فرمائش پر جو نظم کہی، وہ ایک رہنما کا دوسرے رہنما کو پرخلوص خراج تحسین ہے۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے:

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی
رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی

لگتے ہیں ۔ شفیع لیگ یا لاہور مسلم لیگ ظفر علی خاں کی طنز کا نشانہ یوں بنتی ہے :

کون کہتا ہے کہ بے کار ہے لاہور کی لیگ
ملک سے بر سر پیکار ہے لاہور کی لیگ
جس سے پنجاب میں انگریز کا جلتا ہے دیا
آج اسی تیل کی اک دھار ہے لاہور کی لیگ
جتنے اس خطہ کے ٹوڈی ہیں مبارک ہو انہیں
کہ غلامی کی طلب گار ہے لاہور کی لیگ
سائمن اس کا خداوند یہ اس کی لونڈی
غازۂ عارض سرکار ہے لاہور کی لیگ
جنس دشنام ہے بازار ادب میں ارزاں
مہر و سالک کی خریدار ہے لاہور کی لیگ
جان اور دل سے ہے قربان مسلمانوں پر
فقط اسلام سے بیزار ہے لاہور کی لیگ
مفتی لندن کا اگر آئے تو قبل از مغرب
روزہ کھلوانے کو تیار ہے لاہور کی لیگ

اسی سیاسی مسلک کے سلسلے میں علامہ سر محمد اقبال بھی ہدف تنقید بن جاتے ہیں :

قوم کی لٹیا ڈبو دی ، کس نے ؟ سر اقبال نے !
قبر آزادی کی کھو دی ، کس نے ؟ سر اقبال نے !

مجلس احرار کے قیام میں ظفر علی خاں بھی پیش پیش تھے ۔ بعد میں اختلاف شروع ہوا ۔ مسجد شہید گنج (جسے ۲۲ جون ۱۹۳۵ع کو شہید کیا گیا) کے مسئلے میں مجلس احرار بعض سیاسی مصالح کی بنا پر الگ رہی ، اور ظفر علی خاں کا نشانۂ عتاب بن گئی :

اللہ کے قانون کی پہچان سے بیزار
اسلام اور ایمان اور احسان سے بیزار
ناموس پیمبرؐ کے نگہبان سے بیزار
کافر سے موالات مسلمان سے بیزار
اس پر ہے یہ دعویٰ کہ ہیں اسلام کے احرار
احرار کہاں کے یہ ہیں اسلام کے غدار
پنجاب کے احرار ! اسلام کے غدار !

آریہ سماجی فتنہ پردازوں نے شدھی اور سنگھٹن کی دلآزار تحریکیں شروع کرکے جس طرح ملک کی سیاسی فضا کو مسموم اور اتحاد ملکی کو پارہ پارہ کیا، وہ تاریخ ہند کا ایک اندوہناک باب ھے - ظفر علی خاں نے برادران وطن کی اس متعصبانہ روش پر جہاں رنج و الم کا اظہار کیا ھے، وہاں انہوں نے اپنی طنزیہ شاعری کے بھرپور حملوں سے مہاشوں اور لالاؤں کی خوب خبر لی ھے - اس سلسلے کی چند مثالیں پیش کی جاتی ھیں - روزنامہ "پرتاپ" کے مہاشہ نانک چند ناز کی اس تعریض کے جواب میں :

پنجاب کی ہوا ہی سراسر گئی بدل
کچلو نئے نئے ہیں ظفر خاں نئے نئے

ظفر علی خاں طنز و ھجو میں جو گل بوٹے کھلاتے ھیں ان میں ویرانیٔ چمن کی حسرتناک کیفیت بھی شامل ھے :

بھارت میں کھل گئے ہیں دبستاں نئے نئے
جن سے نکل رہے ہیں زباں داں نئے نئے
شدھی و سنگھٹن ہیں مضامیں کی سرخیاں
آرائش کلام ہیں عنواں نئے نئے

دہلی میں ''تیج'' ہے تو ہے لاہور میں ''ملاپ''
پیدا ہوئے ہیں دشمن ایماں نئے نئے
''پرتاپ'' کا دماغ ہے اور ناز کا قلم
پھر کیوں تراشے جائیں نہ بہتاں نئے نئے
ہندوستاں کے باغ کے مالی ہیں مالوی
ویرانیٔ چمن کے ہیں ساماں نئے نئے
ہیں لاجپت کہیں تو کہیں لالہ ہر دیال
ہیں قصر اتحاد کے درباں نئے نئے
''ہندو'' ہے اِس طرف تو آدھر ''بندے ماترم''
ہیں آندھیاں نئی نئی طوفاں نئے نئے
اِسلام اپنے کاسۂ سر کی منائے خیر
باندھے ہیں خشت و سنگ نے پیماں نئے نئے
صبح وطن میں شام غریباں کی ہے نمود
لائی ہے رنگ گردش دوراں نئے نئے
تک سے بھی تک ملانے کا جن کو نہیں شعور
شاعر نئے نئے ہیں غزلخواں نئے نئے

اس سلسلے کی ایک دلچسپ نظم ''نمستے علیکم'' ھے جس کی شان نزول بتفصیل ''نگارستان'' میں دی گئی ھے - سید غلام بھیک نیرنگ معتمد جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام نے اپنی رپورٹ لغایت مارچ تا دسمبر ۱۹۲۵ع میں مہاشے کالی چرن مدیر ''آریہ مسافر'' آگرہ کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''اخبار 'آریہ مسافر' آگرہ میں عجیب و غریب عربی نما زبان میں فرضی عربوں کے فرضی مکالمات شائع کیے گئے جو ''نمستے علیکم' علیکم نمستے'' سے شروع ہوتے تھے اور جن میں یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ گویا عرب لوگ مسرت آمیز

استعجاب کے ساتھ اقرار کرتے ہیں کہ ہم تو ویدک دھرم کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ یہ تو بڑا عمدہ مذہب ہے اور اسلام اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔" اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ظفر علی خاں لکھتے ہیں کہ "سید صاحب ایک کہنہ مشق سخنور ہیں اور حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ گوئی اور لطیفہ سنجی کے لیے مشہور ہیں۔ تعجب ہے کہ "نمستے علیکم، علیکم نمستے" کی خندہ آفرین ترکیب نے اُن کے سمند سخن پر تازیانے کا کام کیوں نہ دیا۔ شاید اُن کی لیلائے شاعری تبلیغ کے محمل میں بند ہو کر رہ گئی جس کا پردہ اب قیس کے لیے بھی نہیں اٹھتا۔ بہر حال یہ فرض کفایہ میں نے انجام دے دیا۔ ملاحظہ ہو":

سنا ہے کہ ایک آگرے کا مسافر
اٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق عرب میں پہنچ کر پکارا
نمستے علیکم، علیکم نمستے!
کبھی بھاؤ مہنگا تھا ہندو دھرم کا
ہیں لیکن اب اِس جنس کے دام سستے
یہ وہ بل ہے جس میں گھسا چاہتے ہیں
تمام اہل اسلام شدھی کے رستے
مسخر کریں گے عرب اور عجم کو
مہابیر دل کے گرانڈیل دستے
نہیں یوں ہی ان کی تباہی پہ ہم کو
برس تین گزرے کمر کستے کستے

اگر دھوتیاں باندھ لیتے مسلماں
نہ یوں آن پر اینٹ اور پتھر برستے

(۲)

چو از بت پرستے شنید ایں سخن ہا
بخندید و زد نعرہ یزداں پرستے
چہ عو عو کنی اے سگ کوئے کاشی
ہنوز اندریں بیشہ شیر نر استے
کہ سرپنجۂ سامری افگن
ز خونناب گوسالہ ہا احمر استے
مکن تکیہ بر پارۂ سنگ و خشتے
کہ ہندو سبھا را بدست اندر استے
مشو غافل از سیف مسلول مسلم
کہ از مہر رخشندہ روشن تر استے
بیک ضربتش صد سر از تن جدا شد
بسے کافراں را، ترا ہم سر استے

شدھی کا یہ حملہ صرف مسلمانوں ھی پر نہ تھا، بلکہ اردو زبان بھی اس کا نشانہ بنی۔ اردو زبان کی نشو و نما صدیوں کے ہندو مسلم ملاپ کے نتیجے میں ھوئی۔ لسانی اتحاد کے اس عظیم تہذیبی ورثے (اردو) کے خلاف ھندوؤں کا معاندانہ طرز عمل انیسویں صدی میں انگریزی سامراج کی سرپرستی میں سنسکرت آمیز ھندی کی تحریک کی صورت میں شروع ھوا جس نے ھندو مسلمانوں میں سیاسی اختلاف کا بیج بویا۔ بیسویں صدی میں دوسرے مسائل کے علاوہ اس مسئلے نے بھی شدت

اختیار کرلی ۔ زبان کو شدھ کرنے کے نتیجے میں عربی، فارسی کے سلیس و شیریں الفاظ کی جگہ سنسکرت اور بھاشا کے نامانوس اور بھدے الفاظ تحریر و تقریر میں استعمال کیے جانے لگے ۔ برادران وطن کے اس متعصبانہ رویے کے خلاف بھی ظفر علی خاں نے اپنے خامۂ بہار آفرین کو حرکت دی ۔ ''چو'' کی لفظی تحقیق کے سلسلے میں شاعر اور لالہ لال چند کا دلچسپ مکالمہ (ستارۂ صبح ، اگست ۱۹۱۷ ع) طنزیہ پیرائے میں اس مسئلے پر روشنی ڈالتا ھے :

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند
اور آگے آگے لالہ کے آن کی بہو گئی!
پوچھا جو میں نے 'لالہ للائن کہاں گئیں'
نیچی نظر سے کہنے لگے 'وہ بھی ''چو'' گئی'
میں نے دیا جواب انہیں از رہ مذاق
'کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی'
کہنے لگے کہ 'آپ بھی ہیں ، سخرے عجب'
اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی خو گئی
''چو'' ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد
بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ ''چو'' سے اگر ہے مراد ''جو''
پھر یوں کہو کہ تا بہ لب آب جو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ
دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بو گئی
لطف زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو
دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آکے ''جیم'' کو ''چے'' سے بدل دیا
چو آئی کوہسار میں گلشن سے جو گئی

لہجہ ہوا درشت زباں ہو گئی کرخت
لطف کلام و شستگیٔ گفتگو گئی
معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں
شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

"ستارۂ صبح" میں ظفر علی خاں کی اہل طریقت سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اسی زمانے میں اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کی اشاعت کے بعد شریعت اور طریقت کی آویزش کا ہنگامہ برپا ہوا۔ جدید دور کے برخود غلط صوفیوں پر اقبال اور ظفر علی خاں نے شدید تنقید کی۔ مسئلۂ حجاز پر بھی سخت جھڑپیں ہوئیں۔ ظفر علی خاں پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ انھوں نے اپنے قلم کے گرزِ گراں سے نام نہاد صوفیوں کے عشرت کدوں میں کھلبلی ڈال دی۔ طنزیات کا بہت سا سرمایہ اس سلسلے کی یادگار ہے۔ پیروں کی حکام پرستی اور انگریز نوازی کے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔ "منکم کی ضمیر کا متصوفانہ مرجع":

کیوں جنس وفا کوڑیوں کے بھاؤ نہ بک جائے
جب گرم ہو پنجاب میں بازار طریقت
قرآں میں اولی الامر کے معنی ہیں نصاریٰ
پیروں سے کوئی پوچھ لے منکم کی حقیقت

شریف مکہ انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس کی غداری نے اتحاد اسلام کو جو نقصان پہنچایا، واضح ہے۔ انگریزوں کا

مذاق لطیف اس قسم کے سلسلوں کا مربی اور سرپرست تھا :

لوٹی بہار آکے تصوف کے باغ کی
انگریز کا مذاق بھی کتنا لطیف ہے
تونسہ بھی ہے شریف علی پور بھی شریف
القصہ جو شریف ہے اس کا حلیف ہے

ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری کا ایک بڑا ھدف قادیانی فرقہ ھے ۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور آن کے جانشین اس لیے ان کی تنقید کا موضوع بنے کہ ظفرعلی خاں کے نزدیک انھوں نے ختم نبوت کے طے شدہ مسئلے میں رخنہ اندازی کرتے ہوئے اپنے دعوئ نبوت کے لیے من مانی تاویلات کی ھیں ۔ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں قادیانی فرقے نے عام مسلمانوں کے بارے میں جو معاندانہ رویہ اختیار کیا ، آزادی پسند قوتوں کی جس انداز میں مخالفت کی اور سامراجی مفاد کے لیے جس طرح کام کیا ، اس سے بھی ظفر علی خاں کے دل میں اس گروہ کے خلاف جذبات مشتعل ہوئے ۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں قادیانی فرقے کا محاسبہ کیا ھے ۔ نثر میں عالمانہ استدلال کے پیرائے میں اختلافی مسائل پر بحث کی ھے تو شاعری میں طنز کا پیرایہ اختیار کرکے اس فرقے کی غلط روی پر کڑی تنقید کی ھے ۔ اس سلسلے میں بعض اوقات وہ متانت کے دامن کو بھی ھاتھ سے چھوڑ دیتے ھیں لیکن جو شعریت اور تغزل آن کی ان طنزوں میں ھے ، وہ دوسری طنزوں میں کم ھے ۔ اس سلسلۂ کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے :

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجے ابن جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلا ہے
یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمانوں کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے
پلی ہے مغربی تہذیب کے آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیمبر بھی رسیلا ہے
نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطال جہاد انجاح مقصد کا وسیلا ہے
بیاس اور اس کی موجیں آئے دن کرتی ہیں غمازی
کہ پوتا قادیاں کے رب اکبر کا رنگیلا ہے
کیا صاد اس پہ اک گل پیرہن کی آپ بیتی نے
بخاری کی یہی اب تک روایت تھی کہ ڈھیلا ہے

''دور جاہلیت کی یاد'' زنداں کی تنہائی میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کی پرانی گنہگاری اس طرح گنگناتی ہے:

بگڑتا اِس لیے ہے آج مجھ سے اتقا اُن کا
کہ دور جاہلیت میں مرا دل اُن پہ مائل تھا
زکواۃ حسن دینے میں ذرا وہ بخل کرتے تھے
مگر میں بے لیے ٹلتا نہ تھا ایسا ہی سائل تھا
مرے ہونٹ آشنا تھے اُن کے لب ہائے عقیقی سے
مرا ہاتھ اُن کی نور افروز گردن میں حمائل تھا
پیمبر زادگی اُن کی مرے آڑے تو آتی تھی
مگر میں اِس نبوت کا نہ قائل ہوں نہ قائل تھا
میں رند لم‌یزل ہوں اس کی کچھ پروا نہ تھی مجھ کو
کہ اُن کے اور میرے درمیاں اسلام حائل تھا

ایک زمانے میں سسل ہوٹل[1] لاہور میں ایک اطالوی

(۱) صوبائی اسمبلی ہال کے عقب میں منٹگمری روڈ پر اس ہوٹل کی قدیم عمارت تاحال موجود ہے۔

حسینہ مس روفو کا بڑا شہرہ تھا - وارفتگان حسن و جمال (جن میں شیخ و برھمن سبھی شامل تھے) کے لیے یہ جگہ مرکز توجہ بنی ہوئی تھی - سبھی اس بہار جاں فزا کے شیدائی تھے - ظفر علی خاں کی چشم تخیل ان وارفتگان شوق میں اھل قادیان کو بھی موجود پا کر مچل جاتی ھے اور ایک دلفریب نظم تخلیق ھو جاتی ھے - پہلے ذرا اطالوی حسینہ کا سراپا ملاحظہ فرمائیے، حسن و جمال کا یہ پرکیف مرقع اردو شاعری میں بے مثال ھے :

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دمن ہے ترے فیض سے چمن
پیغمبر جمال تری دل ربا ادا
پروردگار عشق ترا چلبلا چلن
الجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں
ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سوختن
پروردۂ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار
آوردۂ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانۂ نشاط تری ساق صندلی
پیمانۂ سرور ترا مرمری بدن
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب
جس پہ فدا ہے شیخ تو لٹّو ہے برہمن
جب قادیاں پہ تیری نشیلی نظر پڑی
سب نشۂ نبوت ظلّی ہوا ہرن
میں بھی ہوں تیری چشم پرافسوں کا معترف
جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

اور ایک روز یہ اطالوی حسینہ سسل ھوٹل سے غائب ھو

جاتی ہے ۔ لاہور کے حسن پرست حلقے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ ظفر علی خاں اس گمشدگی کی خبر کو کس لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں ۔ رمزیت و ایمائیت میں بھرپور طنز کا وار ملفوف ہے اور انکشاف کس اچھوتے انداز میں ہوتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :

عشاق شہر کا ہے ''زمیندار'' سے سوال
ہوٹل سسل کی رونق عریاں کہاں گئی
اُس کے جلو میں جاں گئی ایماں کے ساتھ ساتھ
کیا کیا نہ تھا جو لے کے وہ جان جہاں گئی
خوف خدائے پاک دلوں سے نکل گیا
آنکھوں سے شرم سرور کون و مکاں گئی
بن کر خروش حلقۂ رندان لم یزل
لے کر گئی وہ حشر کا ساماں جہاں گئی
روما سے ڈھل کے برق کے سانچے میں آئی تھی
اب کس حریم ناز میں وہ جان جاں گئی
یہ چیستاں سنی تو ''زمیندار'' نے کہا
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ قادیاں گئی

الغرض، ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری میں خلوص، صداقت اور جوش پایا جاتا ہے ۔ سیاسی ہجویات میں اپنے مخالفین کو نشانۂ طنز بنانے کے لیے اُن کے پاس خاصی وجوہ ہوتی ہیں ۔ وہ طبعاً پرجوش جذباتی طبیعت اور مشتعل احساس کے مالک تھے ۔ یہ دور بھی سیاسی جد و جہد اور راست اقدام کا تھا ۔ اس لیے اُن کی طنزیات میں بڑی شدت ہے ۔ تاہم اس

میں وہ زہرناک تلخی کم ہے جو عموماً ذاتی مخاصمت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ظفر علی خاں کی طنزیہ شاعری زیادہ تر قومی مقاصد اور نظریات کے تابع ہے اور اس میں اتنی قوت اور توانائی ہے کہ اپنی بات منوا بھی سکتی ہے۔ اس راست اقدام طنز میں ظرافت کا وہ عنصر بہت حد تک دب کر رہ گیا ہے جو اکبر کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی ایک تماشائی اور مبصر کے روپ میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر تہذیبی و معاشرتی بدحواسیوں کو نشانۂ طنز بنا رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں ظفر علی خاں خود اس تماشا گاہ حیات کے ایک اہم کردار بنے ہوئے تھے۔ وہ فن کار بھی تھے اور ایک رہنما بھی۔ ان دونوں حیثیتوں کی یکجائی سے اُن کی طنزیات میں لطافت اور شگفتگی کا وہ عنصر زیادہ نہ اُبھر سکا جو ایک ایسے مزاح نگار فن کار کی خصوصیت کہا جا سکتا ہے جو تماشائی بن کر زندگی کی بدحواسیوں سے خود محظوظ ہوتا اور دوسروں کو محظوظ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ظفر علی خاں کو ایک ظریف یا مزاح نگار کی بجائے ایک شوخ و طرار طنز نگار کہہ سکتے ہیں جو لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے حریفوں کو تیر و تفنگ کا نشانہ بناتا جاتا ہے اور اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کرتا کہ اُس کے کشتگانِ ستم پر کیا بیتے گی۔

ظفر علی خاں کا شاعرانہ اسلوب

اصناف شعر میں ظفر علی خاں نے زیادہ تر قطعات نگاری کو اختیار کیا ہے ۔ اس کے بعد مثنوی یا نظم کو ترجیح دی ہے ۔ باقی شعری پیمانے (مخمس ، مسدس ، ترجیع بند ، مستزاد وغیرہ) کم استعمال کیے ہیں ۔ قطعہ ہیئت کے اعتبار سے قصیدے اور غزل کی طرح ہوتا ہے ، یعنی اس کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں ردیف اور قافیے کا التزام ہوتا ہے البتہ مطلعے اور مقطعے کی کوئی قید نہیں ہوتی ۔ اس کے اشعار دو سے کم نہیں ہوتے اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ۔ تسلسل بیان اور وضاحت و صراحت قطعے کے لیے ضروری ہے ، اور یہی چیز اس کو غزل سے جدا کرتی ہے ۔ غزل میں بھی جب چند اشعار میں کسی ایک ہی مضمون کو بیان کیا جاتا ہے تو ان اشعار کو قطعہ بند کہہ دیا جاتا ہے ۔ قطعے کا موضوع کسی موقعے ، واقعے ، حالت ، کیفیت کو بیان کرنا یا کسی اخلاقی یا حکیمانہ مسئلے پر روشنی ڈالنا اور نصیحت کرنا ہے ۔ قطعہ قدیم شاعری کی بھی ایک اہم صنف تھی لیکن دور جدید میں تاریخی ، سیاسی اور معاشرتی حالات و واقعات کے طنزیہ ، ہجویہ یا مصلحانہ بیان کے لیے یہ موزوں ترین صنف سخن سمجھی گئی ہے ۔ اردو شاعری میں حالی ، شبلی اور اکبر نے ان مقاصد کی خاطر اس صنف کو خاص طور پر اہمیت دی ۔ ظفر علی خاں کا موضوع بھی یہی تھا ۔ علاوہ بریں انہیں صحافتی تقاضوں کے

تحت بھی روزمرہ اہم واقعات کو منظوم کرنا پڑتا تھا ۔ اس لیے قطعے سے بہتر کوئی ایسا شعری پیمانہ نہیں تھا کہ جس میں وہ طبع آزمائی کر سکیں ۔
ظفر علی خاں کا شعری اسلوب ان کی صحافت اور خطابت سے بھی متأثر ہوا ہے ۔ ایک صحیفہ نگار کو ہر روز نئے نئے واقعات سے سابقہ پڑتا ہے اور اسے نئے نئے مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے ۔ بعض واقعات اور مسائل وقتی ہوتے ہیں جو چند روز کے بعد فراموش ہو جاتے ہیں ، بعض کسی قدر دیرپا اثرات چھوڑ جاتے ہیں ۔ جب انہی واقعات و مسائل کو جامۂ شعر پہنایا جانے لگے تو جو حیثیت اخبار میں مختلف خبروں کی ہوتی ہے وہی ان اشعار کو بھی مل جاتی ہے ۔ جہاں خبر یا واقعہ ذرا پرانا ہوا اور اس واقعے سے متعلق دلچسپی کم ہوئی ، اشعار بھی اپنی کیفیت کھو بیٹھے ۔ البتہ طنز و ظرافت کے نشتر اور محاورات و قوافی کی ندرت کچھ عرصے تک اپنا اثر قائم رکھتی ہے ۔

صحیفہ نگار کے علاوہ ظفر علی خاں ایک خطیب بھی تھے انہیں جہاں اپنے اخبار کے ذریعے قارئین کی ضیافت طبع کے لیے شعر و سخن کی نت نئی قابیں سجانا پڑتی تھیں ، وہاں ایک خطیب کی حیثیت سے اپنے سامعین کے جذبات کو گرمانے اور انہیں اپنا ہم‌نوا بنا کر آمادۂ عمل کرنے کے لیے شعر سے تازیانے کا کام لینا پڑتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کلام میں غور و فکر

کا عنصر کم ہوتا ہے، ہیجان انگیزی اور جوش آفرینی زیادہ ہوتی ہے جو سامعین کو مسحور کر کے اور جذبات کے تیز دھارے میں بہا کر کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ شاعرانہ خطابت کے اس قسم کے موقعوں کے لیے پرشکوہ الفاظ، بارعب تراکیب اور زوردار آہنگ اہم حصہ لیتے ہیں اور یہ اجزا ظفر علی خاں کی شاعری میں بکثرت موجود ہیں۔

صحافت اور خطابت کے ان تقاضوں نے ظفر علی خاں میں بدیہہ گوئی کے وصف کو اجاگر کیا جس کے لیے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ظفر علی خاں کی قادرالکلامی اور بدیہہ گوئی کسی تعارف، وضاحت یا دلیل کی محتاج نہیں۔ انھوں نے جس طرح کرسیٔ ادارت پر بیٹھ کر قارئین کے لیے نو بہ نو مضامین پر شعر کہے یا سیاسی جلسوں اور نجی مجلسوں میں سامعین کی عجیب و غریب فرمائشوں کو ارتجالاً پورا کیا اور پھر سنگلاخ زمینوں، مشکل سے مشکل قوافی سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ بندش الفاظ، روزمرے اور محاورے کا جس طرح التزام کیا، اس کی مثال میدان سخن میں کم ہی ملے گی۔

تغزل :

ظفر علی خاں نے چند غزلیں بھی کہی ہیں لیکن شاید ان کے مزاج کو غزل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی یا غزل کے لیے جس جذباتی خلوص اور دروں بینی کی ضرورت ہوتی ہے،

ان کے ہاں وہ مفقود تھا، اس لیے انھوں نے اس طرف سے توجہ ہٹا لی۔ بہر کیف وہ غزل کے شاعر نہیں تھے لیکن ان کی شاعری میں غزل کی بعض کیفیات موجود ہیں ــــ وہ کیفیات جنھیں ہم تغزل کا عنوان دے سکتے ہیں۔ تغزل وہ جوہر لطیف ہے جو غزل میں لطف و کیف گھولتا اور اثر آفرینی پیدا کرتا ہے۔ یہ جوہر بہت سے عناصر سے مرکب لیکن ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس میں جذباتی تجربے کے علاوہ ایک خاص زبان، ایک خاص لب و لہجہ اور ایک خاص پیرایۂ بیان ہوتا ہے۔ رمز و ایما اس کا بنیادی وصف ہے۔ سبک، شیریں، خیال انگیز الفاظ اور تشبیہ، استعارے، کنائے، صنائع وغیرہ کا استعمال، جو رمزی و ایمائی پیرایۂ بیان کے لیے ضروری ہے، اس میں شامل ہے۔ حسن و عشق کے مضامین میں تغزل اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے۔ تغزل، غزل کا جزو لازم تو ہے لیکن یہ اس تک محدود نہیں۔ نظم اور قطعے وغیرہ میں بھی جہاں ایمائی نکتہ آفرینی کی ضرورت ہوتی ہے، شاعر وہاں تغزل کے ایمائی پیرایۂ بیان سے کام لیتا ہے۔ ظفر علی خاں کی شاعری میں بھی اس ضرورت کے تحت رنگ تغزل اپنی جملہ کیفیات کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں تو جذبۂ عشق و محبت موجزن ہے، اس لیے وہاں تغزل کا رنگ بھی بکثرت موجود ہے۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل کے بیان اور طنزیات میں بھی انھوں نے تغزل سے خاصا

کام لیا ہے ۔ خصوصاً ان کی وہ طنزیات دیکھیے جن میں اطالوی حسینہ مس روفو کا سراپا بیان کیا گیا ہے ۔

یہ اشعار دیکھیے ان میں تغزل کی کیفیات کتنی مؤثر ہیں :

ہوا ہے دامن گل چیں ہی کوتہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ و گل اور وہی ان کی بہار اب بھی
دل وحشی سے اس پھندے میں الجھا ہی نہیں جاتا
ہے برہم ورنہ پہلے کی طرح زلف نگار اب بھی
سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں
نگاہ لطف ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی

ندرت قوافی :

نادر اور اچھوتے قافیے لانے اور ان کو برجستگی کے ساتھ کلام میں کھپانے میں ظفر علی خاں کو ید طولیٰ حاصل ہے - کلاسیکی شعرا میں سودا ، مصحفی ، انشا اور ذوق اس فن میں کمال رکھتے تھے - دور جدید میں اکبر الہ آبادی ندرت قوافی میں ماہر فن تھے - اکبر کے بعد ظفر علی خاں اس میدان کے چابکدست شہسوار تھے - انھوں نے مشکل سے مشکل قافیوں پر طویل سے طویل نظمیں کہہ کر قافیے تنگ کر دئیے ہیں - اپنے اس فن پر انہیں فخر و ناز بھی تھا :

نوا سنجان دہلی کو صلائے عام دیتا ہوں
کہ داد فکر دیں ان قافیوں میں ان ردیفوں میں

اچھوتے اور نادر قوافی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے -

سائمن کے ساتھ ڈھائی من کا قافیہ :

سواگت ہے نرالا سائمن کا پھٹا آتے ہی گولا ڈھائی من کا

اسی طرح پنڈت کے ساتھ کھنڈت کا قافیہ (مسوری ہوٹل میں طبلے پر تھاپ) بڑی خوبی سے نبھاھا ھے۔ ایک نظم ''الصلح خیر'' میں ''لاجپت'' کے سولہ قافیے (گت ، مت ، ست ، دھت ، تت وغیرہ) نکالے ھیں اور آخر میں یہ کہہ دیا ھے کہ اردو میں کوئی اور قافیہ ھے ھی نہیں۔ ''دور جاھلیت کی یاد'' میں تمام قافیے مائل ، سائل ، حمائل ، قائل ، حائل اور گھائل لائے ھیں ، چاھتے تو قاتل ، بسمل وغیرہ بھی لے آتے لیکن اس سے نظم کا ظاھری حسن کم ھو جاتا۔ اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ھے :

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ظفر علی خاں کی طبع سخن کو یہ شعر پڑھ کر مہمیز ھوتی ھے اور وہ کیا نادر نادر قافیے اس سنگلاخ زمین میں لاتے ھیں :

زمین سنگلاخ اکبر نے کیسی منتخب کی ہے
کہ مشکل ہو گیا اس میں قوافی نو بنو لانا
چلی لندن سے اک آندھی چمن میرا اڑانے کو
غضب ہے اس میں کرزن کا بگولا بن کے بولانا
صلاح الدین نے فصل صلیبی جس سے کاٹی تھی
دراتی اس ھلال نو کی ہنگام درو لانا
بچھائی آ کے اس بت نے جفا کاری کی پچیسی
اور اس پر ھم سے کہتا ہے وفاداری کی پو لانا

بہایا کفر کو جس نے خس و خاشاک کی صورت
اسی دریا کی ہاں اے ناخدا پھر ایک رو لانا
حریم مصطفیٰ کے بام و در جس سے فروزاں تھے
مرے اُجڑے شبستاں میں اُسی مشعل کی ضو لانا
چڑھا کنٹر بری کا پادری تو اپنے منبر پر
کدھر ہیں آپ مولانا جو تھے بالفضل اولانا
کہیں میں جاہدوا کے نعرہ سے تم کو نہ لرزا دوں
میرا خوں گرم ہے پہلے ہی اور اس کو نہ کھولانا

جادہ ، بادہ ، دادہ وغیرہ قوافی بھی کم ھیں اور ان میں داد سخن کوئی قادرالکلام شاعر ھی دے سکتا ھے ظفر علی خان نے ان تنگ قوافی اور سنگلاخ زمین میں بھی بڑی مشاق سے پانچ شعر نکالے ھیں ''شہیدان حریت کی یاد میں'' (۱۹۲۸ء) :

بس کہ سیر قدس پر پیک خیال آمادہ ہے
کہکشاں کی جلوہ افشانی فروغ جادہ ہے
میرے مضموں ہیں اچھوتے میرے نغمے ہیں لطیف
گوش معنی پردہ ہائے غیب کا دل دادہ ہے
مے سے مستغنی ہوں اور معشوق سے ہوں بے نیاز
طبع موزوں سادہ ہے اور فکر رنگیں بادہ ہے
خاک کاکوری میں ہے خون شہادت کا یہ رنگ
ذرہ ذرہ لعل ہے ، یاقوت ہے ، بیجادہ ہے
پھول پھل لانے کو ہے اُگتے ہی آزادی کا بیج
کل وہی استادہ ہوگا آج جو افتادہ ہے

اسی نظم کو بعد میں ''کسی صاحبزادے کی یاد میں'' چار شعروں کے اضافے کے ساتھ لکھا ھے ۔ ''خاک کاکوری'' کی بجائے ''خاک امرتسر'' اور باقی چار قافیے آزادہ ، یورپ زادہ ، صاحبزادہ ، سجادہ ھیں ۔

ایک اور نظم ''اطالوی حسینہ مس روفو'' میں نادر قوافی کی بہار دیکھیے :

تمھیں مستی فی النوم کی بھی خبر ہے زمانے کے اے بیخبر فیلسوفو
ملے گا تمھیں یہ سبق قادیاں سے جہاں چل کے سوتے میں آئی ہے روفو
دبستاں میں جانا نہیں چاہتے ہو تو پہنچو شبستاں میں اے بے وقوفو
بہار آ رہی ہے خزاں جا رہی ہے ہنسو کھلکھلا کر دمشقی شگوفو
کرشن اور خورسند کیا اسکو سمجھیں تمھیں داد دو اس کی عبدالرؤفو
جب اوقات موجود ہے قادیاں کی کہاں مر رہی ہو تفو اور زوفو

ایک قطعے میں (۱۹۰۳ع) گلبن ، تمدن ، فلاخن ، تلوّن ناخن وغیرہ سولہ قافیے لائے ہیں ، ان میں ایک قافیہ تن تن بھی ہے - ملاحظہ فرمائیے :

چاہیے یورپ کو شور بوق و کوس و علم و فضل
ہم کو سارنگی کی روں روں اور تن تن چاہیے

''لوقا'' کا قافیہ قرآن مجید کی آیت سے کس برجستگی سے لائے ہیں :

چپ ہوئے پاپا، چل دئیے پطرس، گم ہوئے مرقس، مٹ گئے لوقا
جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

محاورہ بندی :

اکبر الہ آبادی کی طرح ظفر علی خاں نے بھی اردو زبان سے بڑی بے تکلفی برتی ہے - اظہار خیال کے لیے جہاں نئے نئے الفاظ لائے ہیں ، نئی نئی تراکیب وضع کی ہیں ، وہاں محاورات کے استعمال میں بھی بڑی جدت دکھائی ہے - انھوں نے عام محاوروں کو نئے اور انوکھے طریقوں سے باندھ کر ان میں

جاذبیت اور دلکشی پیدا کی ھے ۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے ۔
''تلوار کے دھنی'' محاورہ ھے ' انھوں نے بات کے دھنی
ایک نیا محاورہ بنایا ھے :

ترکوں سے ایک بات میں ہم بھی نہیں ہیں کم
ہم بات کے دھنی ہیں ' وہ تلوار کے دھنی

''سر ھتھیلی پر لے کر'' اور ''بیل منڈھے چڑھنا'' دونوں محاورے
ایک ھی شعر میں کس چابکدستی سے کھپائے گئے ھیں :

سر ہتھیلی پہ لیے جب نکل آیا پنجاب
تو یہ سمجھو کہ منڈھے چڑھ گئی اس دیس کی بیل

''آب و ھوا راس آنا'' اور ''گل کھلنا'' :

آب و ہوا حجاز کی جس کو نہ آئی راس
ہندوستان میں وہ نیا گل بھی کھل گیا

''خون سے سینچنا'' اور ''بیل منڈھے چڑھنا'' :

جب اپنے خوں سے ان کو سینچنا تم کو نہیں آتا
چڑھاؤ گے منڈھے کس طرح آزادی کی بیلوں کو

''ھینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے'' :

پھٹکری سے مجھ کو مطلب ہے' نہ ہڑے سے غرض
رنگ بے داموں ہی اس دامن پہ چوکھا آئے گا

''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' :

وہ گوکل کا گوالا جو ہے میٹھی بانسری والا
یہ کہتا ہے کہ بھینس اُسکی جو ہانکے اسکو لاٹھی سے

''صبح کا بھولا شام گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے'' :

بھولا جو صبح کا ہو نہ بھولا کہو اُسے
گر اپنے گھر وہ چل کے سر شام آ گیا

''آوے کا آوا بگڑنا'' :

گلہ ہم کو کیا ہندو سبھا سے کہ ہے بگڑا ہوا آوے کا آوا

''مفلسی میں آٹا گیلا ہونا'' :

شکایت یہ مجھ کو تھی دور فلک سے کہ آٹا مرا مفلسی میں ہے گیلا

''سر منڈاتے ہی اولے پڑنا'' :

مسولینی کا سر اٹلی میں مونڈا جائے گا جس دن
برستا دیکھ لو گے اس پر انگلستان کے اولوں کو

''گوشمالی کرنا'' اور ''ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے'' :

اگر سرکار مرشد تھی تو احراری ولی نکلے
اور ان کی گوشمالی کو ملک برکت علی نکلے

آہنگ اور صوتی کیفیات :

شاعری کے اوزان و بحور کا جذبات انسانی کے زیر و بم سے خاص تعلق ہے ۔ الفاظ اور حروف کی اصوات بھی جذبات انسانی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں ۔ بعض الفاظ صوتی لحاظ سے نرم ، سبک ، چرب اور شیریں ہوتے ہیں ، بعض ہیبت ، دبدبہ ، طنطنہ اور شکوہ کا اظہار کرتے ہیں ۔ خوشی ، غم ، جوش ، ہیجان ، اضطراب ، خوف وغیرہ مختلف جذبات انسانی کی ترجمانی کے لیے شاعر ان الفاظ ، اوزان اور بحور سے کام لیتا ہے ۔ اس تخلیقی مرحلے میں فن کار کا مقصد ، اس کا مزاج اور اس کے ذہنی و نفسیاتی عوامل بھی اہم حصہ لیتے ہیں ۔

ظفر علی خاں کی شاعری کا یہ فنی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ ان کا مزاج زندگی کے ان عناصر سے مرکب تھا

جن میں قوت و توانائی، رعب و ہیبت، دبدبہ و طنطنہ، شان و شکوہ، جوش و خروش اور ہیجان و اضطرار ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت کو جوئے کہسار کی پرخروش روانی اور آبشاروں کے ہیجان انگیز شور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح جوئے کہسار کبھی کبھی جب دامن کوہ کی وادیوں میں سے گزرتی ہے تو سبک خرام ہو کر میٹھے میٹھے نغمے بھی الاپنے لگتی ہے، اسی طرح ظفر علی خاں کی پرخروش جذباتی طبیعت میں سبک خرامی اور شیریں بیانی کے مواقع بھی آ جاتے ہیں۔ تاہم ان کے مزاج کی بنیادی کیفیت جوش و خروش ہی ہے۔ ان کا مقصد بھی عظیم الشان تھا۔ قوم کے خفتہ حواس، مضمحل قویٰ اور نیم مردہ رگوں میں جوش عمل کا حیات آفرین جذبہ ابھارنا اور ولولۂ انقلاب کی تازہ روح پھونکنا، یہ ان کی زندگی کا اہم مقصد رہا۔ اس مقصد نے بھی ان کے شعری لہجے اور آہنگ کو جوش و خروش سے ہم کنار کیا۔ جذبے اور لہجے کے مطابق الفاظ کا انتخاب اور ان کا موزوں استعمال ظفر علی خاں کے کلام میں جوش آفرین آہنگ پیدا کرتا ہے۔ وہ پرشکوہ الفاظ کو شیریں اور سبک الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ب، ٹ، ج، خ، د، ڈ، ش، ق، گ وغیرہ حروف والے الفاظ کا کثرت استعمال بھی اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انھیں شیشہ سازی سے زیادہ خارا شگافی عزیز تھی۔ الفاظ اور حروف کی صوتی تکرار سے بھی ظفر علی خاں اپنی شاعری میں بڑا

اہم کام لیتے ہیں ۔ اس سے شعری آہنگ میں جو دلآویز نغمگی اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے ، وہ پڑھنے والے کو مسحور کر لیتی ہے ۔ گزشتہ صفحات پر ظفر علی خاں کی شاعری کے جو نمونے پیش کیے گئے ان میں یہ عناصر فراوانی سے موجود ہیں ، تاہم چند اشعار بطور مثال یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں

ہم حق کے علم برداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی
بادل کی گرج تکبیروں میں، بجلی کی چمک تلواروں میں

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

حقہ اور چائے ظفر علی خاں کی شعری تخلیقات کے دو اہم رفیق تھے ۔ نغمہ و آہنگ میں رجزآور کیفیات پیدا کرنے میں بھی ان چیزوں نے بڑا حصہ لیا ہے ۔ ذیل کی نظم ''چائے کا گھونٹ اور حقہ کا کش،، ملاحظہ فرمائیے ، کس طرح یہ دونوں رفیق قدم سے قدم ملا کر اور رجزیہ ترانہ گاتے ہوئے مارچ پاسٹ کر رہے ہیں :

مے اگر حرام ہے چائے تو حلال ہے
دور چاء کا چلے فصل برشگال ہے
ابر ہے گہر بدوش اور ہوا گہر فروش
میرے گھرمیں کیوں کہوں موتیوں کا کال ہے
ترک شوخ و شنگ کی دیکھ خود فشانیاں
خال چہرۂ فرنگ مصطفیٰ کمال ہے
ہو رہی ہے شکوہ سنج مسجد شہید گنج
جو لٹا مری طرح وقف کا وہ مال ہے
حقہ پی رہا ہوں میں پی کے جی رہا ہوں میں
جس میں جی رہا ہوں میں عالم مثال ہے
گنگنا رہا ہوں میں گڑ گڑا رہا ہے وہ
سُر ملا رہا ہوں میں دے رہا وہ تال ہے
سمجھے ہو جسے مذاق وہ ہمارے واسطے
زندگی و موت کا آخری سوال ہے

محاکات (امیجری) :

کسی کیفیت یا منظر کی لفظوں کے ذریعے تصویر کشی یا لفظی پیکر تراشنے کو امیجری (اردو میں محاکات) کہتے ھیں ۔ ظفر علی خاں کی شاعری میں مصوری اور پیکر تراشی کا یہ پہلو ھیجان انگیزی کی بدولت دب گیا ھے، تاھم انھوں نے بعض مضحک کیفیات کی دلچسپ تصویریں (کارٹون نما) بنائی ھیں ۔ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے :

وائے ناکامی کہ چشمے تیل کے سوکھے تمام
لے کے لائنڈ جارج جب دوڑے کنستر ٹین کا

لائڈ جارج (برطانوی وزیراعظم) کا ٹین کے کنستر کو لے کر دوڑنا اور تیل کے چشموں کا خشک ہونا، سامراج کی ہیت کذائی کی دلچسپ اور جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہے - یہ مرقعے بھی ملاحظہ فرمائیے:

پیچ گاندھی کی لنگوٹی کا چلے تھے کھولنے
کشمکش میں اپنی ہی پتلون ڈھیلی ہو گئی

ہوئی پتلون ڈھیلی آبری کی
دیا گھوڑے کو جب انور نے کاوا

غرض یہ کہ ظفر علی خاں کی شاعری اپنے متنوع موضوعات کے علاوہ زبان و بیان کی ان خوبیوں کی وجہ سے بھی قابل قدر ہے۔ یہ درست ہے کہ وقتی ہنگاموں میں الجھنے اور ان کو سلجھانے کی وجہ سے ان کی شاعری کا بیشتر سرمایہ دائمی قدر و قیمت کا حامل نہیں رہا - ان کی شاعری میں ایسے فکری عناصر بھی کم ہیں جو ہمہ گیر اور آفاقی ہوں - با ایں ہمہ ان کے کلام میں ایسے جواہرات بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکے گی اور جب تک اردو زبان زندہ ہے ظفر علی خاں کا کلام زندہ رہے گا —— اور اردو زبان کی زندگی و تابندگی کی شہادت تو وہ خود ہی بڑے عزم و ایقان سے دے گئے ہیں:

فردوس گوش ہو گئی آواز اہل دل
زینت ہماری بزم کی اُردو زباں سے ہے

پانچواں باب

ظفر علی خاں کی نثر

بطور نثر نگار ظفر علی خاں کی تین حیثیتیں ہیں۔ (۱) مترجم (۲) مصنف (۳) صحافی ۔ زیر نظر باب میں پہلی دو حیثیتوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ صحافت کا جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا۔

ظفر علی خاں کی نثر کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام نثر، ادبی نثر اور اسلوب کے بارے میں چند بنیادی امور طے کر لیے جائیں تاکہ بحیثیت انشا پرداز آن کا مقام متعین کرنے میں سہولت رہے۔

نثر بنیادی طور پر معلومات بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے عملی لحاظ سے یہ شعر سے زیادہ کارآمد اور مفید ہے۔ معلومات شعر میں بھی ہو سکتی ہیں اور جذبے اور تخیل کی عکاسی نثر میں بھی ممکن ہے لیکن نثر اور شعر میں بنیادی فرق یہی ہے۔ ذہن انسانی کے دو اوصاف ہیں، (۱) منطقی اور (۲) خیالی، پہلے کو نثر سے اور دوسرے کو شعر سے تعلق ہوتا ہے، تاہم ان دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل قائم

نہیں کی جا سکتی - بعض اوقات یہ ایک دوسرے میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ اگر دوسری فنی پابندیوں (اوزان و بحور) کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو شعر اور نثر میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے -

بعض مغربی مصنفین نے نثر اور شعر کو ایک دوسرے کی ضد بھی قرار دیا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ نثر دو طرح کی ہوتی ہے - ایک وہ جو منطقی انداز میں معلومات بہم پہنچاتی ہے ، دوسری وہ جس میں جذبے اور تخیل کی رنگ آمیزی ہوتی ہے - پہلی قسم کی نثر کو ہم علمی نثر کہہ سکتے ہیں ، دوسری قسم کی نثر کو ادبی نثر کہا جا سکتا ہے - شاعری کی طرح ادبی نثر کی تخلیق کا سرچشمہ جذبات و احساسات ہیں اور اس کا خطاب بھی جذبات و احساسات ہی سے ہوتا ہے - جذبات انسانی کی ترجمانی اور زندگی کی مسرتوں میں اضافہ کرنا اس کا اہم مقصد ہے -

اب رہا اسلوب (Style) کا مسئلہ ، تو اس امر میں چند باتیں قابل ذکر ہیں - ایک تو اسلوب کا عام مفہوم ہے ، یعنی کسی تحریر کی خارجی خصوصیات ، جس میں صرفی و نحوی قواعد کا لحاظ رکھا جاتا ہے - تحریر میں ساخت کا یہ مفہوم اسلوب کی بحث میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ نثر علمی ہو یا ادبی ، اس میں قواعد زبان کی پابندی اور ساخت کا حسن قدر مشترک ہے - اسلوب کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کسی

تحریر میں ایسی خوبیاں پیدا ہوں جو پڑھنے والے کو متأثر اور محظوظ کریں، اسے انفرادی یا شخصی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ہر لکھنے والے کی انفرادی خصوصیات کی جھلک ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں کبھی کبھی کوئی ایسا صاحب طرز ادیب بھی جلوہ گر ہو جاتا ہے جس کا مہتم بالشان اسلوب صدیوں تک ناقابل فراموش ہوتا ہے۔

اسلوب کی بحث میں آخری دونوں مفہوم قابل ذکر ہیں۔ اس اسلوب کے اندر پوری شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔ لکھنے والے کا مزاج، اس کا مقصد اور وہ سب شعوری اور غیر شعوری عوامل جن کی بے ساختہ لہر جذبات کے سہارے تحریر میں آجاتی ہے، اس شخصی اسلوب کو بناتے ہیں۔ علاوہ برین زمانے کا انداز اور ماحول کی کیفیات بھی اسلوب کی تشکیل میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ایک زمانے کے مختلف مصنفوں کی تحریروں میں اسلوب نگارش کا تنوع ہوتا ہے بلکہ ایک دور کی تحریر دوسرے دور کی تحریر سے اسلوب کے معاملے میں مختلف خصائص کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً سرسید کے زمانے میں استدلال (Reason) اسلوب کا اجتماعی رنگ تھا، اس لیے سرسید، حالی، شبلی اور نذیر احمد وغیرہ کا اسلوب اپنے اپنے انفرادی طرز تحریر کے علاوہ اس اجتماعی میلان سے بھی متأثر تھا۔ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ عقل سے زیادہ جذبے کی کار فرمائی کا تھا، اس لیے اس دور میں استدلال سے

زیادہ جذبات کا وفور اجتماعی صورت میں ملتا ہے۔ ظفر علی خاں ہوں یا ابوالکلام آزاد، اپنے اپنے انفرادی طرز نگارش کے علاوہ اس اجتماعی رنگ کے بھی حامل تھے۔ گویا اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھنے والے کی شخصیت کے علاوہ اس زمانے کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں [جو شاعری سے زیادہ نثر کے فروغ کا زمانہ تھا] اردو نثر زندگی کے ہمہ گیر مسائل کی ترجمان بنی۔ اس میں مختلف اصناف ادب (انشائیہ، افسانہ، ناول، سوانح عمری، آپ بیتی، سفرنامہ وغیرہ) کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ دور اصلاح، مفاہمت اور عقل پسندی کا تھا جس کا انعکاس اس دور کے ادب میں ہوا۔ بیسویں صدی کا آغاز نئے رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ عقل پسندی کے خلاف ادب میں اس کا رد عمل رومانی رجحان کی صورت میں ہوا جس میں جذبات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ جذبات کئی طرح کے تھے۔ ان کا ایک سلسلہ قومی احساس اور اتحاد اسلام کے تصور سے ملا ہوا تھا۔ ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد اسی سلسلے کے دو صاحب طرز رومانی ادیب تھے۔ اس لیے ان کی نثری نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی شخصیت اور مزاج کے علاوہ ان مقاصد اور تصورات کی خاص اہمیت ہے جو اتحاد اسلام دور میں کار فرما تھے۔

ظفر علی خاں بحیثیت مترجم

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا [جبکہ دونوں زبانیں مختلف لسانی خصائص کی حامل ہوں] اور اس میں اصل مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے عبارت میں حسن و دلآویزی پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے ۔ اگر کوئی مترجم اس مشکل سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو جائے تو اس کی مشاقی اور ہنر وری قابل تحسین ہے ۔ ظفر علی خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ترجموں سے کیا ۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں انگریزی کتب بینی کا شوق اور پروفیسر آرنلڈ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مطالعہ شدہ کتب کا ملخص تیار کرنے کی عادت نے بہت اثر کیا ۔ حیدرآباد کی ملازمت کے دوران میں ظفر علی خاں نے کئی علمی و ادبی کتابوں کے ترجمے کیے ۔ ان کی جودت طبع نے ان تراجم میں اپنے پورے جوہر دکھائے ہیں ۔ اصل مضمون کی لفظی و معنوی خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ترجمے میں سلاست اور صفائی کا ایسا شستہ اور برجستہ انداز اختیار کیا ہے کہ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتا ہے ۔ ترجمے کا یہ سلیقہ کہ اصل مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے وہ تخلیق کے درجے تک جا پہنچے اس فن کی معراج ہے ۔ عام ترجمہ کرنے والا لفظوں اور ترکیبوں کے چکر میں الجھ کر تکلفات کا اسیر ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون کی اصل روح ترجمے میں

پرواز کر جاتی ہے۔ ظفر علی خاں کے تراجم میں یہ تکلف اور اہتمام کہیں نہیں ملے گا۔ وہ اصل مفہوم کو ملحوظ رکھتے ہوے آزاد ترجمہ کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ ترجمہ لطف زبان اور حسن بیان کے اعتبار سے اصل عبارت سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ ''معرکۂ مذہب وسائنس'' اور ''خیابان فارس'' کے چند اقتباسات (مع اصل عبارات) یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ موازنے میں سہولت رہے اور ظفر علی خاں کے ترجمے کی خوبیوں کا اندازہ لگایا جا سکے:

'' کوہستان لبینس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور دریائے ارانطس کے خوش سواد اور پرفضا کناروں کی رہنمائی سے عربی فوج دمشق کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ رستہ میں بعلبک اور حمص دو شہر پڑتے تھے۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے اس نے مسخر کیا۔ ہرقلس کو پل پل کی خبریں لگتی تھیں۔ حملہ آوروں کی مزید پیش قدمی کا سد باب کرنے کے لیے اُس نے ایک لاکھ چالیس ہزار کا لشکر جرار جمع کیا۔ یرموک کے میدان میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ پہلے حملہ میں عربی فوج کے میمنہ کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن عرب عورتوں نے ہزیمت کھائے ہوؤں کے دلوں میں اپنے غیرت آفرین الفاظ سے نیا جوش پیدا کر دیا۔ وہ پلٹے اور اس بے جگری سے لڑے کہ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ رومی فوج اُن کے حملے کی تاب نہ لا سکی اور اُسے شکست فاش ملی۔''[1]

(معرکۂ مذہب و سائنس' ص ۱۳۰)

---

(1) From Damascus the Saracen army advanced northword, guided by the snow-clad peaks of Libanus and the beautiful river Orontes. It captured on its way, Baalbec, the capital of the Syrian valley, and Emesa, the chief city of the eastern plain. To resist its further progress, Heraclius collected an army of one hundred and forty

—*Contd. to page 259.*

''فتح! اور وہ بھی بیت المقدس کی!! عیسائیت کے پایۂ تخت کی!!! کس طرح ممکن تھا کہ لوگ اس واقعہ کو اسلام کے غلبہ اور مسیحیت کی شکست سے تعبیر نہ کریں - دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر اس یقین کے ساتھ کہ فتح سچائی کو ہوگی، ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا اور فیصلہ خدا پر چھوڑا تھا - خدا نے فتح اسلام کو عطا کی اور فتح کا تمغہ بیت المقدس کی شکل میں مسلمانوں کو دیا اور اگرچہ حروب صلیبیہ کے دوران میں عیسائیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہزار سال کی جد و جہد کے بعد آج بھی وہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے -'' (معرکۂ مذہب و سائنس' صفحہ ۱۳۳) -

معرکۂ مذہب و سائنس ایک علمی کتاب ہے - ظفر علی خاں نے جس سادگی و سلاست کے ساتھ اسے اردو میں منتقل کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ کتاب ترجمہ معلوم نہیں ہوتی - اردو محاورات کا برمحل استعمال، نئی تراکیب اور مصطلحات

---

thousand men. A battle took place at Yermuck ; the right wing of the Saracens was broken, but the soldiers were driven back to the field by the fanatic expostulations of their women. The conflict ended in the complete overthrow of the Roman army.''

Draper, J. W. *History of the conflict between Religion and Science*, London 1882, p. 89.

(1) The fall of Jerusalem ! the loss of the Metropolis of Christianity ! In the ideas of that age the two antagonistic forms of faith had submitted themselves to the ordeal of the judgment of God. Victory had awarded the prize of battle, Jerusalem, to the Mohammedan ; and, notwithstanding the temporary successes of the Crusaders, after much more than a thousand years in his hands it remains to this day.''

[*Religion and Science* p. 91]

علمیہ کا اختراع اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ظفر علی خاں نے اپنی جولانیٔ طبع اور شگفتہ مزاجی کی بدولت فلسفے اور تاریخ کی ایک خشک کتاب کو دلچسپ اور پرلطف بنادیا ہے، اور یہی اُن کا کمال فن ہے۔ اب ''خیابان فارس'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''مشرق کے اس قسم کے سفر کی جو بہت سی غیر معمولی یادگاریں مسافر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اُن میں شاید سب سے زیادہ وحشت خیز اور پر اثر یاد اُن اونٹوں کے قافلوں کی ہے جن سے وہ رستے میں رات کے وقت دوچار ہوتا ہے۔ شب تاریک میں دور سے فریاد جرس سنائی دیتی ہے اور اس کی ماتمی آواز جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد بلند ہوتی ہے، بتدریج زیادہ قریب آتی جاتی ہے اور گاہ بہ گاہ کسی چھوٹی گھنٹی کی ٹن ٹن اس کے ساتھ مل کر بتاتی ہے کہ اُسی قافلے کا آخری حصہ بھی قریب آ پہونچا ہے۔ بڑا جرس قطار کے پہلے اونٹ کے گلے میں پڑا ہوتا ہے لیکن جب اس کی آواز قریب تر اور بلند تر ہوتی جاتی ہے تو نہ تو کوئی اور آواز اُس کا ساتھ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور نہ کوئی چیز ہی نظر آتی ہے۔ دفعتاً تاریکی میں سے ایک جہاز کے سایہ کی طرح قافلے کا سر گروہ دبے پاؤں نمودار ہوتا ہے۔ اُس کے گدگدے تلووں کی دھمک ریت کے نرم بچھونے پر آہستہ آہستہ پڑتی ہے اور بیابانی غولوں کی ایک بڑی مسلسل قطار کی طرح یہ خاموش سلسلہ پاس سے گزر جاتا ہے اور شب تار کی پہنائی میں نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔''[۲]

(خیابان فارس، ص ۵۶۰ - ۵۶۱)

مندرجہ بالا سادہ و سلیس عبارت میں ہم آہنگ آوازوں

---

(2) Perhaps the weirdest and most impressive of the many unwonted memories that the traveller carries away with him from such-like travel in the East is the recollection

Contd. to page 261.

کا حسن تناسب ، لفظوں کے جوڑے ، حروف کی صوتی تکرار اور کہیں کہیں قافیے کی جھنکار، عبارت کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔ لہجے کا دھیماپن اور سبک اور نرم الفاظ کا استعمال بھی شب تار میں خاموش صحرا کو عبور کرتے ہوئے پرسکون قافلے کی غمازی کرتا ہے جس میں سوائے "فریاد جرس" کے ہر چیز پر سکوت اور غنودگی طاری ہے۔

علمی کتابوں کے علاوہ ظفر علی خاں نے انگریزی کے صاحب طرز ادیبوں رڈیارڈ کپلنگ ، رائیڈر ہیگرڈ اور ایڈگر ایلن پو وغیرہ کے افسانوی ادب کو بھی اردو ادب کا جامہ پہنایا۔ یہاں بھی انھوں نے لفظی ترجمے کی بجائے مفہوم کو اہمیت دی ہے اور اردوے معلیٰ کی با محاورہ زبان میں اصل قصے

---

of the camel caravans which he has encountered at night. Out of the black darkness is heard the distant boom of a heavy bell. Mournfully, and with perfect regularity of iteration, it sounds, gradually swelling nearer and louder, and perhaps mingling with the tones of smaller bells, signalling the rearguard of the same caravan. The big bell is the insignia and alarum of the leading camel alone. But nearer and louder as the sound becomes, not another sound, and not a visible object, appear to accompany it. Suddenly, and without the slightest warning, there looms out of the darkness, like the apparition of a phantom ship, the form of the captain of the caravan. His spongy tread sounds softly on the smooth sand, and, like a great string of linked ghouls, the silent procession stalks by and is swallowed up in the night.

[Curzon, G. N. *Persia and the Persian Question*, London, 1892, p. 275]

کو اس طرح سمو دیا ہے کہ یہ ترجمہ تخلیق کے مرتبے کو پہنچ گیا ہے۔ چند اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

شیر کے غرانے کی آواز اب بلند ہو چلی اور انجام کار وہ زور سے چنگھاڑا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی شے پر حملہ کیا ہے۔ تب شیر خاں نے ایک زور کی چیخ ماری۔ بھیڑیے کی مادہ نے کہا: "لو اسے شکار نہیں ملا۔ دیکھو تو کیا ہے؟" بھیڑیا جست بھر کر کچھ دور گیا اور اس نے شیر خاں کو جھاڑیوں میں لڑکھڑاتے اور غصے سے کچھ بڑبڑاتے سنا۔ اپنی مادہ سے اس نے آ کر کہا: "ایسا احمق ہے کہ لکڑ ہاروں نے جو الاؤ روشن کر رکھا تھا اس میں جا کودا اور اپنے پنجے جلا لیے۔ طباقی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔" بھیڑیے کی مادہ نے ایک کان پھڑ پھڑایا اور بولی: "کوئی چیز پہاڑی پر آ رہی ہے، تیار رہو۔"

گھنی جھاڑیوں کے پتوں میں ذرا سا کھڑکا ہوا اور بھیڑیا اپنے پچھلے پنجوں کے بل جست بھرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت اگر تم نے دیکھا ہوتا تو ایک نہایت ہی حیرت انگیز نظارہ تمہارے دیکھنے میں آیا ہوتا اور وہ یہ کہ بھیڑیے کا زقند بھرتے اپنے تئیں روک لینا۔ بھیڑیے نے جست لگائی ہی تھی کہ اس نے دیکھا میں کس شے پر کودا ہوں اور تب اس نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار یا پانچ فٹ بلند اوپر کو اچھلا اور جہاں سے کودا تھا، وہیں آ رہا۔ اپنی مادہ سے اس نے کہا: "اجی یہ تو انسان ہے۔ ایک ننھا سا آدمی کا بچہ! دیکھو تو آ کر۔"

(جنگل میں منگل، صفحہ ١٦)

"مگر یہ شکر لب، سرو اندام اور مہ پارہ لڑکی جس کے آگے لعل و جواہرات ماند ہیں، میں کس کو دوں۔ تم میں سے ہر ایک نوجوان دولت و ثروت، شوکت و وجاہت اور تہور و شجاعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نظیر ہے۔ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ سب سے زیادہ

مستحق کون ہے ۔ اس لیے جو شخص میرے آگے سب سے زیادہ نذرانہ پیش کرے گا وہی اس کا مستحق ہوگا اور اس پری پیکر کا جام وصال نوش کرے گا ۔ آپ لوگ یاد رکھیں کہ میں نذرانہ طلب کر رہا ہوں نہ کہ قیمت ۔ یہ بھی آپ صاحبوں پر پوشیدہ نہ رہے کہ حسب معمول آپ لوگ اپنی اپنی بولی سونے کے اونسوں میں بولیں ۔

ایک شرط اور ہے اور اس میں کوئی بات خلاف ضابطہ نہیں ۔ شرط یہ ہے کہ اس معاملے میں پادری صاحب کا ضرور دخل ہوگا ۔ وہ ہم سب کے روبرو اس شخص کا نکاح اس لڑکی سے پڑھیں گے ۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ ہمارے پاس ایک پادری صاحب موجود ہوں اور بیوی میاں کی نکاح خوانی میں اُن کو کوئی حصہ نہ لینے دیا جائے ۔ میرے عزیزو ، وقت گزرتا جاتا ہے ، اب چاہیے کہ ہم اپنے کام میں مصروف ہوں ۔ کوئی ہے ؟ اچھا (ایک شخص کی طرف اشارا کرکے) تم اس انگریز لڑکی کو لے آؤ ۔،، جب پیلا بھتنا اپنی تقریر ختم کر چکا تو سب خاموش ہو کر جوانا کے آنے کے منتظر بیٹھ گئے ۔

(سیر ظلمات، ص ۱۴۳-۱۴۴)

،،کئی سال کی بات ہے کہ ایک صاحب مسٹر ولیم لیگرنڈ سے میری گہری دوستی ہو گئی ۔ مسٹر لیگرنڈ خاندانی شخص تھا اور کسی زمانے میں اُن کا گھرانہ بہت مالدار متمول تھا لیکن دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے ۔ زمانے نے یک بیک ایسا پلٹا کھایا کہ شام تک جس گھر میں اشرفیاں کھنکتی تھیں ، صبح ہوتے ہوتے کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگیا ۔ لیگرنڈ کے اچھے زمانے کے رفیق جو اس کے ساتھ جام بلوریں میں شراب ارغوانی پی پی کر حق دوستی جتایا کرتے تھے ، اب کہ لب تر کرنے کو کاسۂ سفالین میں صرف ٹھنڈا پانی باقی رہ گیا تھا ، ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اور مصیبت میں ہمدردی ظاہر کرنا تو ایک طرف رہا ، اس

کے سائے سے بھاگنے لگے ۔"

(سنہرا گھونگا (ایڈ گرایلن پو)، ستارۂ صبح جلد ۱، نمبر ۱۲)

ان جستہ جستہ اقتباسات سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ظفر علی خاں ترجمہ کرتے وقت محض انگریزی الفاظ اور فقرات ہی کو اُردو کا لباس نہیں پہناتے بلکہ اصل تصنیف کی روح تک پہنچ کر اُسے اُردو میں منتقل کرتے ہیں ۔ اردو زبان اور اس کے محاورات پر انھیں ایسی قدرت ہے کہ کسی جگہ بھی اظہار مفہوم میں تردد محسوس نہیں ہوتا، بلکہ یہ مفہوم کچھ اس بے تکلفی اور روانی کے ساتھ اردو میں ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمے کی بجائے تخلیق معلوم ہوتا ہے ۔

ظفر علی خاں کے ان تراجم کی زبان و بیان میں سادگی، سلاست اور روانی ہے ۔ محاورات کا استعمال بھی بیشتر موقع و محل کے مطابق ہے ۔ علمی تراجم میں عربی، فارسی کے الفاظ اور تراکیب جابجا نظر آتی ہیں لیکن افسانوی ادب میں یہ صورت بہت کم نظر آئے گی ۔ وہ رنگین، پرشکوہ اور پیچ و خم کھاتا ہوا بلند آہنگ اسلوب جو ظفر علی خاں کی بعد کی تحریروں میں ملتا ہے، ابتدائی دور میں کم ملے گا ۔ غالباً اس لیے کہ یہ دور سکون و اطمینان کا تھا اور ظفر علی خاں کا قومی اور سیاسی مقصد بھی ابھی پوری طرح متعین نہیں ہوا تھا جس کی خاطر بعد میں انھیں قومی جذبات ابھارنے کے لیے رنگین اور بلند آہنگ اسلوب اختیار کرنا پڑا ۔

ظفر علی خاں بحیثیت مصنف

ظفر علی خاں کا ابتدائی (دکنی) دور اُن کی ادبی نگارشات کے سلسلے میں بہت اہم ہے ۔ اس دور میں اگرچہ انھوں نے زیادہ تر ایک مترجم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، تاہم دکن ریویو اور پنجاب ریویو کے بعض مضامین ، افسانے و ڈرامے ، ادارتی مقالے اور تبصرے اُن کے طبع زاد تصنیفی سرمائے میں شامل ہیں ۔ اس دور کے بعد اُن کی زندگی کا بڑا محور سیاست کا میدان تھا یا صحافت کا خارزار ، جن سے کبھی کبھی جبری فرصت ملتی تھی تو ادب کے مرغزار میں چہل قدمی کے مواقع میسر آ جاتے تھے ۔ پنجاب ریویو کے علاوہ ھفتہ وار زمیندار اور ھفتہ وار ستارۂ صبح کا زمانہ اسی قسم کی فرصت و فراغت کا تھا جس میں ظفر علی خاں نے کئی مقالات (تاریخی ، تحقیقی و تنقیدی) اور طبع زاد افسانے وغیرہ لکھے ، اسے ان کی تصنیفی زندگی کا دوسرا دور کہا جا سکتا ہے ۔

پہلے دور کی نثر میں تراکیب و محاورات اور رنگینیٔ بیان کے جو نقوش ذرا ھلکے تھے وہ دوسرے دور میں خاصے گہرے ہو جاتے ھیں ۔ عربی ، فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی کثرت سے ہونے لگتا ہے ۔ ”ستارۂ صبح“ کی زبان و بیان پر بعض لوگ معترض ہوئے تو اس کا جواب ظفر علی خاں نے یہ دیا :

” افتاد طبیعت کی طرح طرز تحریر و انداز بیان بھی انسان کے اختیار سے باہر ہوا کرتا ہے اور اس لیے ہم سے اس بات کی توقع رکھنا

کہ اپنی تحریر کو عربیت اور فارسیت کے پیرایہ سے عاری کر کے بھی ہم اس کی شگفتگی برقرار رکھ سکیں گے، ایسا ہی ہے جیسا سپہر منیر سے اس بات کا متوقع ہونا کہ ابر سیہ منہ پر ڈال کر بھی وہ اپنی شان جہانتابی قائم رکھ سکے گا۔ اس کے علاوہ "ستارۂ صبح" کا ایک بڑا مقصد ادب آموزی ہے کہ اس کے مطالعہ سے نئے نئے استعارے، نئی نئی بندشیں اور نئے نئے اسلوب بیان پیش نظر ہو جائیں اور یہ ظاہر ہے کہ اردو لٹریچر میں یہ شیفتگی عربی و فارسی کے امتزاج ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔"

(ستارۂ صبح، جلد ۱، نمبر ۵)

پہلے دور کی تصانیف میں سلاست اور رنگینیٔ بیان کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہ طرز بیان کسی قدر پرتکلف اور تراجم سے قدرے مختلف ہے۔ تراجم میں نسبتاً سادگی ہے۔ طبع زاد مضامین میں اسلوب سادا اور رواں نہیں بلکہ پیچ و خم کھاتا ہوا جاتا ہے۔ محاورات اور تراکیب کے ساتھ کہیں کہیں قافیوں کا استعمال اور ہم آواز لفظوں کا التزام عبارت کو دلکش بناتا ہے۔ اس دور کے مختلف مضامین اور افسانوں کے جستہ جستہ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جو اس دور کے نثری اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں:

"اردوئے معلیٰ کا ایڈیٹر شیرازہ بندی دواوین اساتذۂ قدیم کرتے کرتے دفعتہً کاسۂ لیس سفرۂ ارباب کانگریس ہو گیا۔ اور جسے اس کاسہ لیسی میں اس درجہ توغل ہے کہ اپنے نئے سرپرستوں کی شان میں قصیدہ خوانی کرنے کے ساتھ اپنے پرانے بزرگوں کو موقع بہ موقع چرکا لگانے سے نہیں چوکتا۔ چھ کروڑ مسلمانوں کی متفقہ قومی پالیسی سے منحرف ہو کر دوسروں کا ہم آہنگ جا بننا ایک ایسی جسارت ہے، جس کا ارتکاب اردوئے معلیٰ کا ایڈیٹر اور

اُس کے ہم نوالہ دوست ہی کر سکتے ہیں - ہمیں ایڈیٹر صاحب کشمیر درپن سے اتفاق ہے کہ مسٹر حسرت موہانی نے مسٹر تلک کو ہندوستان کا حقیقی لیڈر اور اخبار بندے ماترم کو ہندوستان کی پولیٹکل کشتی کا ناخدا قرار دے کر اپنی کمال ناعاقبت اندیشی اور بد مذاقی کا ثبوت دیا ہے - بہ حالت موجودہ اس پرچے کی ترتیب مضامین خلط مبحث کے شدید مرض میں مبتلا ہے کہ آغاز رسالہ نسیم دہلوی سے ہوا جو ہرگز کانگریس والے نہ تھے - اوس کے بعد سودیشی اور بائیکاٹ کا مضمون ہے جس میں کاسہ لیسی کی داد خوب پانی پی پی کر دی گئی ہے ' اور اوس کے بعد ہی کیٹس کی بدیسی نظم کا ترجمہ کیا گیا ہے جسے سودیشی سے کوئی تعلق نہیں - آگے چل کر " بیاض حسرت " کے بعد ہی ملا عبدالقیوم مرحوم کا مضمون انبیائے ہنود ہے جو پرچہ کی موجودہ پالیسی کے لحاظ سے اپنی جگہ پر ہے لیکن اس کے اور تنقید کانگریس و کانفرنس کے درمیان بلجیم کے دلفریب نظارے حائل ہیں - ہماری رائے میں جب اس پرچہ کو کانگریس نے اپنا کر لیا ہے تو مکتوبات امیر مینائی اور اسی قسم کے لٹریری مضامین کے چھاپنے کی اجازت ارباب کانگریس کو ہرگز نہ دینی چاہیے -"

(دکن ریویو - جلد ۱ نمبر ۵' مارچ ۱۹۰۷ع' صفحہ ۴۹' ۵۰)

"یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ جس قدر کوششیں موجودہ زمانہ میں مسیحی دنیا نے نوع بشر میں تثلیثی عقائد پھیلانے کے متعلق کی ہیں ' اس کا عشر عشیر بھی مسلمانوں کی طرف سے ظاہر نہیں ہوا ' اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ باوجود اُن دلچسپ اور دلکش ترغیبوں کے جن کا جال پری جمال وعظ کرنے والیوں اور سیم و زر کی تھیلیوں کی شکل میں بیچارے سراپا لغزش انسان کے لیے بچھایا گیا جس کی کل کائنات لے دے کر ایک تہمد اور ایک بوریا تھی ' اور اوس نے اس حالت مسکنت کو اُس شان تمکنت پر پھر بھی ترجیح ہی دی ' تو اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ

اسلام کو اپنے معتقدین کے دلوں پر کہاں تک قابو ہے"۔

........(دکن ریویو۔ جلد ۱ نمبر ٦ تا ۱۰ ص ۱۲)

"اس تحریک کا نام یورپ کی پولیٹکل اصطلاح میں پین اسلامزم ہے۔ یورپ کے معصوم بھولے بھالے کمسن بچوں کی نظروں میں پین اسلامزم چین و جاپان کی پیلی اور افریقہ کی کالی بلا کی طرح ایک مہیب دیو ہے، جس کا سر سلطان عبدالحمید خاں ہے اور ہاتھ پاؤں ایران، افغانستان اور دوسری اسلامی حکومتیں۔ عدم مداخلت اغیار، پولیٹکل آزادی کا معیار، اور پولیٹکل آزادی قومی زندگی کی روح ہے۔ بقائے روح کے لیے جو کوششیں اسلامی حکومتوں کی طرف سے عمل میں آتی ہیں، اونہیں مسیحی تمدن و تہذیب کے پیشوا تعصب اور فتنہ انگیزی کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن خود جب نہ صرف انہیں جائز اور لازمی کوششوں کو عمل میں لا کر بلکہ تہذیب آموزی کے بہانہ سے دوسروں کے گھروں میں زبردستی گھس کر جرم مداخلت بیجا بخانہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس طرز عمل کا نام پابندیٔ اصول جہدللحیوٰۃ و اقتضائے قانون بقائے اوق رکھا جاتا ہے۔"

"قدرت نے اپنی گوناگوں فیاضیوں سے دکن کو کچھ کم حصہ نہیں دیا۔ معتدل موسم، بہتی نہریں، بھرے تالاب، شاندار پہاڑ، گھنے جنگل، ہرے مرغزار، دلکشا وادیاں، انواع و اقسام کے وحوش و طیور، بھانت بھانت کی نباتات، غرض تمام وہ زیور جن سے قدرت اپنے باغوں کو آراستہ کیا کرتی ہے، دکن کی زیب و زینت کے لیے وقف ہیں۔ زمین ایسی ہے کہ ہل کے ایک اشارہ پر سونا اگلے، آسمان ایسا ہے کہ بادلوں کی ایک جنبش کے ساتھ ہن برسائے، درخت میووں سے لدے کھڑے ہیں، کانیں جواہرات سے پٹی پڑی ہیں۔ گولکنڈہ کے ہیروں کی یاد سے تاریخ کے منہ میں ابھی تک پانی بھر آتا ہے اور دولت آباد کی اشرفیوں اور جواہرات کے دفینوں کا راز گنج قارون کے بوسیدہ طلسم کو توڑ رہا ہے۔ اس خطۂ فردوس کی بے مثالی میں اگر کمی تھی تو تمدن کی سرگرمیوں

کی، اس کمی کو ایک بہت بڑی حد تک میر محبوب علی خاںؒ کی انتظام آرائی، عدل گستری اور رعایا نوازی نے پورا کر دیا، جس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے - لیکن بادشاہ خواہ اوس میں عمر فاروق کی سی ہمت، علی مرتضیٰ کا سا علم و فضل، اکبر کی سی ہردلعزیزی اور نپولین کی سی ان تھک مستعدی کیوں نہ ہو، ملکی ترقی کے تمام شعبوں پر اکیلا حاوی نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ رعایا اُس کا ہاتھ نہ بٹائے -"

"لیکن زمانے کے زبردست پہلوان نے اڑنگے پر لا کر ہمیں ایسی پٹخنی دی اور ایسا ذلیل کیا کہ اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اگر اور کسی خیال سے نہیں تو کم از کم اپنی جان بچانے کے خیال سے ہم سب ایک ہو جائیں، شیعہ، سنی اور مقلد و غیر مقلد کے باہمی اختلافات کی اب ہمیں فرصت نہیں - یہ سب اختلافات اب ایک عالمگیر غرض میں ضم ہو جانے چاہئیں اور وہ غرض ہونی چاہیے ترقیٔ اسلام -"

.........(دکن ریویو - جلد ۱ نمبر ۶ تا ۱۰ ص ۱۷-۱۹-۲۳)

"ہمارا ارادہ نہ تھا، کہ اس غیر خوش آئند بحث میں پڑ کر اور نکتہ چینوں کے غیر دل نشین اعتراضات کی تردید میں قلم اوٹھا کر اپنے معزز ناظرین کی تضیع اوقات کے مجرم بنیں کیونکہ اسی قسم کے ایک ایراد پر نظر ڈالتے وقت ہم نے کسی گذشتہ اشاعت میں بوضاحت بیان کیا تھا کہ مولانا اکبر حسین کا کلام جو اُردو شاعری میں ایک نئے دور کی ابتدا ہے، اپنی انوکھی طرز اور نرالی شان کے لحاظ سے اس سے بہت اونچا ہے کہ آج کل کا عامیانہ اور سطحی مذاق اُس کی لم کو پہنچ سکے -"

.........(دکن ریویو - جلد ۱ نمبر ۱۱-۱۲، ص ۵۲)

"جوانی کے دنوں میں مسٹر مڈبرن ایک بہت بڑے دولت مند تاجر تھے لیکن شامت اعمال سے آپ نے اپنی ساری پونجی ایک مخدوش تجارتی منصوبے میں لگا دی جس نے آپ کا دیوالہ نکال دیا اور آپ تماشا گاہ عالم میں بیک بینی و دوگوش جوتیاں چٹخاتے

رہ گئے - کرنیل صاحب کو بھی عالم شباب میں مبدء فیاض نے دولت و صحت کے انعامات سے مالا مال کر رکھا تھا، لیکن آپ کی وارستہ مزاجی نے ان دونوں نعمتوں کی کوئی قدر نہ کی بلکہ اُن کو بے لذت اور با لذت گناہوں کی نذر کر دیا جس کا خمیازہ آپ کو عہد پیری میں بشکل وجع مفاصل و دیگر آلام جانفرسا کھینچنا پڑا - مسٹر گسکان نے اپنی عمر عزیز کا بہترین حصہ پولیٹکل بدنامیوں کے خرمن کی خوشہ چینی میں صرف کیا تھا اور گو نصف صدی پیشتر آپ اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے بہت کچھ مشہور تھے لیکن اس ناقابل رشک شہرت کی لاش آج کل گمنامی کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی -"

........(معاشرت - ڈاکٹر ہیڈگر کا تجربہ ص ۲۰۱)

محمد یوسف : "کوکب صبح" تو چلتا چلاتا نظر نہیں آتا - اپنا خرچ ہی نکالے جائے تو غنیمت ہے - وہ اصول یا بے اصولیاں جو اخبار کو آج کل کامیاب بناتی ہیں، مجھے پسند نہیں - نہ میں مسلمان جہلا کو خوش کرنے کے لیے ہندوؤں کو گالیاں نکالنے کا روادار ہوں، نہ ہندوؤں کے حلقہ میں اپنے اخبار کو ہردلعزیز بنانے کے لیے اُن کی قابل اعتراض باتوں کو لائق تحسین ظاہر کرنے کا حامی ہوں - نہ گورنمنٹ کی جھوٹی خوشامد کرکے اپنے شیشۂ ضمیر کو ارباب ذوق سلیم کے سنگ استہزا کا مد مقابل بنانا چاہتا ہوں - پھر آج کل کے طوفان بد تمیزی میں میرے اخبار کی اشاعت بڑھے تو کیونکر بڑھے - اس کو میں بند بھی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ اس کا بند کر دینا گویا حق و راستی کے منہ میں جان بوجھ کر کپڑا ٹھونس دینا ہوگا - اس لیے اپنی آمدنی کے بڑھانے کی کوئی اور ہی فکر کرتا ہوں - دو کتابیں لکھی رکھی ہیں، ایک ناول ہے اور دوسرے ایک علمی کتاب کا ترجمہ ہے - یہ چھپ جائیں تو عجب نہیں کہ ہزار پانچسو روپیہ مل جائے -

نازلی بیگم : تم ہمیشہ خیالی پلاؤ پکانے کے عادی تھے - کتابیں بیچ کر اگر نفع حاصل کرنا چاہو گے تو رہا سہا اثاث البیت بھی نیلام ہو

جائے گا۔ تم ہو کس خیال میں ؟ مولوی شبلی اور خواجہ حالی جیسے مصنفوں تک کی کتابیں تو بکتی ہی نہیں، تمہاری کتابوں کو کون پوچھے گا۔ یہ میں نے مانا کہ تم اچھے لکھنے والے ہو لیکن یہ زمانہ اہل قلم کے لیے سازگار نہیں، علمی کتابوں کا تو نام مت لو۔ کہنے کو سب کہتے ہیں کہ علمی کتابوں کے تراجم سے اردو لٹریچر میں اضافہ ہونا چاہیے، اور بڑے بڑے شاندار فقروں میں اُن لوگوں کو ملامت کی جاتی ہے جو دماغ رکھتے ہیں لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ لیکن جب کوئی کتاب جو حقیقت میں قابل قدر ہو، چھپتی ہے تو چھاپنے والا اُس کی چھپائی کا خرچ بھی نہیں نکال سکتا۔ باقی رہے ناول، سو آج کل اُن کا بازار بھی سرد پڑا ہے۔ میں آج تک یہی نہیں سمجھی کہ پبلک پسند کس چیز کو کرتی ہے اور اُس کا مذاق کیا ہے ؟

محمد یوسف : تو پھر کیا کروں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا رہوں ؟

نازلی بیگم : بھانڈ بنو۔ نقلیں کرو۔ بندر نچاؤ۔ سرکار رس اور دربار نشین لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔ جھوٹ بولو۔ خوشامد کرو۔ اس قسم کی ہر بات کرو۔ لیکن خدا کے لیے مضمون نگاری یا تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بنانے کے خبط سے باز آ جاؤ۔

[نازلی بیگم کا فیصلہ، پنجاب ریویو نومبر، دسمبر ۱۹۱۰ء ص ۶۵، ۶۶۔]

پروفیسر : جناب آپ نے جواب کیوں نہ دیا ؟

میجر : جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آ جائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ ابے سنتا ہے کہ نہیں۔ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس ولیس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے۔

پروفیسر : جناب عالی ! آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔ مجھے آپ کے اس اشتعال طبع پر رہ رہ کر

تعجب ہوتا ہے - آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بڈھوں کی طرح چڑے - اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا - آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ اختتام تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے - اب کہیے نبض کی رفتار کیا ہے ؟

میجر : ایک سو بیس ہے - گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے-

پروفیسر : ہمت نہ ہارئیے - آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے ؟

میجر : نیلی تو نہیں سبز ہے -

پروفیسر : سبز ! ناممکن ہے -

میجر : ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو - کیونکہ میری نگاہ خراب رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتی -

پروفیسر : سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو - سخت تعجب ہے - شاید آپ کے ہاتھ میلے ہوں گے - اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریائی معلوم ہوتی ہوگی - آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا ؟

میجر : نہ صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں -

پروفیسر : مرحبا اور حرارت غریزی ؟

میجر : ۱۰۳ - ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں - کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے ؟

پروفیسر : ابھی کلہم سوا گھنٹہ ہوا ہے ' اس پر یہ شور برپا کر دیا کہ الامان ' ابھی تجربہ کی ابتدا ہی ہے - (یہ کہہ کر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا) -

........(معاشرت - تولہ بھر ریڈیم)

لفٹننٹ او کوما : میں جب مدرسے میں پڑھتا تھا ' تو کیمسٹری کے پروفیسر صاحب جماعت کے طلبا کے سامنے ایک جوہر لطیف کا تجربہ کیا کرتے تھے جس کا نام ''غار خندہ آور'' ہے - جب اس غار کی بوتل کا منہ کسی طالب علم کی ناک کے سامنے کھولا جاتا تھا تو وہ کھل کھلا کر ہنس دیتا تھا - آپ کے قہقہوں سے اس وقت مجھے اپنے منہ پر غار خندہ آور کے مرتبان کا گمان ہونے لگا -

سرجن میجر شموسی : جان برادر ! مجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ اہل مغرب کی اچھی باتوں کی تقلید کرتے کرتے آپ نے اُن کی بری عادتوں کو محض اس لیے نظر استحسان سے دیکھنا شروع کیا کہ ان عادتوں کا ماٰخذ یورپ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب نے مادی امور میں اپنے ذہن رسا اور عقل دقیقہ سنج کے کرشموں سے وہ ترقی کی ہے جو اپنی نظیر آپ ہے ۔ ریل ۔ تار ۔ جہاز ۔ برق کلوں ۔ تجارتی اور صنعتی کارناموں میں مشرق مغرب کا شاگرد ہے لیکن اخلاق و روحانیت کا ذکر آیا اور مغرب سٹی بھولا ۔ فلسفہ ٔ اخلاق اور سادگی اور سچائی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے فن میں مغرب ابھی تک مشرق سے سبق لے سکتا ہے ۔ ان باتوں میں بھی اگر تم نے مغرب کی تقلید کی تو کوئی دن جاتا ہے کہ مشرق کے دریاؤں کی تہہ ایسے لاکھوں بے زبان اور ناکردہ گناہ بچوں کا گہوارہ بن جائے گی جنہیں اُن کی ناخدا ترس اور آبرو باختہ ماؤں نے اپنی شہرت دوشیزگی برقرار رکھنے کے لیے موج آب کے حوالے کر دیا ہوگا ۔ مشرق کے شہروں کی محفلوں میں ایسے لاکھوں اشخاص نظر آئیں گے جن کا نام نسبت ابوّت کا شرمندہ احسان نہ ہوگا ۔ ازدواج اور خانگی تعلقات کو آزادی کا سنگ راہ سمجھ کر اکراہ و تنفر کی نظر سے دیکھا جائے گا ۔ عدالتوں میں طلاق کے مقدمات کی وہ کثرت ہوگی کہ ججوں کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملے گی ، بچوں کا وجود ایسا نحس اور مکروہ سمجھا جائے گا کہ فرماں رواؤں کو اس ڈر کے مارے کہ کہیں نسل انسان منقطع نہ ہو جائے کثیر الاولادی کے لیے انعام اور تمغے مقرر کرنے پڑیں گے ۔ مندر ویران ، کلیسا برباد اور مسجدیں مسمار ہو جائیں گی اور اُن کے کھنڈروں پر ایک نیا معبد بنے گا جس کا نام روپیہ ہوگا اور حرص ، خود غرضی ، ریا کاری ، بے ایمانی اور جھوٹ اس معبد کے پجاریوں کے مذہبی اصول ہوں گے ۔ سادھو ، گسائیں ، کاہن اور ملا اپنے گیان اور دھیان اور مراقبہ کو چھوڑ کر پالیٹکس میں دخل دینے لگیں گے اور دوسرے ملکوں میں جا کر تلقین مذہب کے بہانے سے

نئے نئے فتنے بپا کر کے اپنی گورنمنٹوں کے لیے کشور کشائی اور غاصبانہ پیش قدمی کا پیش خیمہ بنیں گے۔

("جنگ روس و جاپان" - ایکٹ ۴ - سین ۳ - ص ۱۳۷ - ۱۳۸)

دوسرے دور کی نثر میں پر شکوہ الفاظ اور بلند آہنگ تراکیب کا استعمال جذبات کے جوش و خروش کے ساتھ ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ سرسید کے دور کی عقل پسندی کے برعکس یہ جذبات پسندی کا دور تھا۔ سیاسی حالات اضطراب انگیز صورت اختیار کرچکے تھے۔ محکومی کا تلخ احساس جذبات میں ہل چل پیدا کر رہا تھا۔ بلاد اسلامی کے حادثات ہیجان انگیز تھے۔ اس دور کے ہیجان و اضطراب نے صحافت اور خطابت کے ذریعے اظہار کا نیا راستہ تلاش کیا۔ ابوالکلام آزاد کا "الہلال" بھی اسی زمانے میں منصۂ شہود پر آیا اور اس رومانی رجحان کا نمائندہ بن گیا جس میں جذبات اور استدلال گھلے ملے تھے۔ ظفر علی خاں بھی اسی رجحان کے ادیب تھے۔ اُن کی ذات میں صحافت اور خطابت کے عناصر نے مل کر جوش انگیزی کی جو صورت اختیار کی، اُس سے اُن کی اس دور کی نثر خاصی متاثر ہوئی ہے۔ پہلے دور کی نثر میں جو رنگ ہلکے تھے وہ اس دور میں شوخ ہوگئے۔ تاہم یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ یہ شوخ رنگ وہیں تک ہیں جہاں جذبات کو بھڑکانا مقصود ہے اور جہاں معتدل انداز میں کسی مسئلے کو بحث و استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، وہاں اُسلوب نگارش ٹھوس اور منطقیانہ ہوتا ہے۔ اس دور کی نثر کے جستہ جستہ چند

اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائیے تاکہ اس دور کے اسلوب کی مذکورہ بالا کیفیات واضح ہوسکیں:

''موتیوں میں کیسی لطیف آب و تاب ہوتی ہے، چمک دمک ہوتی ہے، مگر جنس لطیف کے سیرت و سریرت (کیرکٹر) کی تابانی و درخشانی ان پر بھی فائق ہے کہ صدف کے موتی اگر آویزۂ گوش بننے کے لیے ہیں تو یہ شرف کے موتی آویزۂ عقل و ہوش بننے کے لیے ہیں۔ صدف کے موتیوں نے اگر بڑی ترقی کی تو فرعون کی سفید داڑھی میں پروئے گئے، لیکن شرف کے موتی اگر تنزل میں بھی رہے تو موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون کی بے سبب آزاری سے بچایا کیے۔ عربی مذاق اسی لیے شریف عورتوں کو ''لولؤۃ اشرف'' (شرافت کے موتی) کا خطاب دیتا ہے کہ یہی تابدار موتی نظم و نظام عالم کی آرائش ہیں، اور یہی وجہ مناسبت ہے کہ نسائیات کی یہ سلک گوہریں اپنے لیے ''موتیوں کی لڑی'' کا عنوان تجویز کرتی ہے کہ دنیا کی نامور عورتوں کے روشن ترین سوانح زندگی اسی لڑی میں منسلک ہیں۔''

.... (ستارۂ صبح)

''فلسفہ حقیقت اشیا کا نام ہے۔ شعر اس حقیقت کی تصویر کو کہتے ہیں جو اس انداز سے کھینچی گئی ہو کہ دیکھنے والے کے دل کو بے اختیار لبھا لے اور اس میں کیفیت گداز پیدا کر دے۔ وزن اور قافیہ اس کا ایک وصف اضافی ہے، ورنہ اس کا جمال ایسی آرائشوں سے مستغنی ہے ع

باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

یہ سخن ورانہ اعجاز ہمیں قرآن مجید کے اوراق میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ کروڑوں دلوں کو جو قوت اپنی فوق الادراک جاذبیت سے اپنی طرف تیرہ سو سال سے کھینچتی چلی آئی ہے وہ اس کی سطر سطر اور حرف حرف میں کرشمہ سنج ہے۔ ''معلقات'' کی ہوش ربا بلاغت کی طرف سے عرب کو جسے اپنے نطق کے بالمقال باقی تمام دنیا ابکم نظر آتی تھی اگر کسی چیز نے بے نیاز کر دیا، تو وہ قرآن

ہی کی آیات تھیں جن کے حسن دانش گسل اور بینش گداز نے نثر عاری تک کا پلہ نظم مرصع سے گراں کر دیا ۔ سورہ کوثر جب سخن سنجان حجاز کے سامنے پڑھی گئی تو وہ وجد میں آ کر جھومنے لگے اور ایک ساتھ پکار اٹھے کہ یہ زمین تو آسمان سے آئی معلوم ہوتی ہے ۔"

.... "ستارۂ صبح"

"شاید انسان کی اصلاح کے لیے خاک عرب کو کار فرمایان قضا و قدر نے پہلے سے ہی مقدر کر رکھا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خیر اپنی آسمانی تجلیات سے اس سر زمین کے ذرہ ذرہ کو شمس بازغہ بنا دیا ۔ لیکن دور جاہلیت میں بھی بعض خصائص عرب میں ایسے پائے جاتے تھے جن سے آگے چل کر اس فتنہ کے قیامت بننے کے آثار صاف نمایاں تھے ۔"

....

" کائنات پر قانون کا عمل ہے ۔ تمام موجودات ایک خاص ضابطہ کی پابند ہے ۔ آسمانوں اور زمینوں میں ایک اَن دیکھی اور اَن بوجھی مگر اٹل قوت اپنا کام کر رہی ہے جو ایک خاص قاعدہ کے ماتحت ہے جس سے وہ سر مو انحراف نہیں کرتی ۔ سیاروں کی گردش ، ثوابت کا سکون ، دن کا نور ، رات کی ظلمت ، برق کی چشمک ، شرار کا تبسم ، ابر کی تراوش ، بہار کا جوش ، بلبل کا نغمہ ، سب اسی غیر متغیر قانون کے سلسلہ انقیاد میں منسلک ہیں ۔"

....

" اگر یہ صنعت تغزل کی نگار آرائیوں ہی میں صرف ہوتی تو ایک بات بھی تھی ، لیکن بعض بےباک شعرا نے حضور سرور کون و مکاں کی ذات اقدس تک کو اس بری طرح سے صنعت ایہام کا بازیچہ بنایا کہ مذاق سلیم کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں ۔"

.... "ستارۂ صبح"

"سچائی ازل سے ایک چلی آئی ہے اور ابد تک ایک چلی جائے گی ۔ اس میں نہ فرق آیا ہے نہ آئے گا ۔ حقیقت کبریٰ ، کائنات کی وہ

روح اعظم جس کے جلوے زمین و آسمان میں ہیں ہمیشہ سے ایک تھی اور ابدلآباد تک ایک ہی رہے گی - یہ ممکن ہے کہ کان بہرے ہو جائیں اور اس کی آواز نہ سنیں ' آنکھیں اندھی ہو جائیں اور اس کا نور نہ دیکھیں ' لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کے نقارۂ جلال پر چوب انا و لاغیری کسی قرن میں پڑنی موقوف ہو اور اس کے فانوس خیال سے وحدانیت کی تجلی چھن چھن کر نہ بکھرتی رہے -"

.... "ستارہ صبح"

"بہت سے مغربیوں نے جن کی ایک عمر فارسی کی تحصیل میں صرف ہوئی ہے ' اس کوچہ میں قدم رکھا ہے - لیکن قدم قدم پر ٹھوکر کھائی ہے - مجاز و حقیقت فارسی شاعری میں دست و گریبان ہیں - مے باقی سے اسکاچ وسکی کا بچا بچایا پگ ہی مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی شراب معرفت کے بھی لیے جا سکتے ہیں - یوسف و زلیخا اس شاعری کی ذو معنی مصطلحات میں عاشقی و معشوقی ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ وجود مطلق و وجود مقید کے باہمی تعلقات کے اسرار بھی اس میں مضمر ہیں - سمرقند و بخارا نام کو ترکستان کے دو معروف شہر ہیں ' لیکن شاعر کا تخیل ان سے دو دنیائیں مراد لے سکتا ہے - غزل ' ہجر و وصل ' سوز و گداز اور ناز و نیاز کے مضامین رنگین کا نام ہے لیکن ایشیا کی متصوفانہ صنعت گری نے انہیں مضامین کو روحانیت ' یزداں شناسی اور اخلاق کے لطیف ترین نکات کی تفہیم و تلقین کا ذریعہ بنا لیا ہے - اس قسم کی ذو معنی شاعری جو قرآن و حدیث اور اسلامی روایات کے استعاروں اور اشارات اور کنایوں سے بھری پڑی ہو کس طرح انگریزی یا کسی اور مغربی زبان میں اس شان سے منتقل کی جا سکتی ہے کہ اصلی لطف سخن بدستور قائم رہے -"

.... "ستارہ صبح"

"یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے کے بعد ہمارا عام شیوہ یہ ہے کہ اپنی تمام کتابوں کو یا تو کسی کباڑی کے ہاں بیچ دیتے ہیں کہ ان کے اوراق مفت میں دیمک اور چوہوں کی

نذر نہ ہوں اور ہلدی یا نمک کی پڑیا بن کر ملک کی کوئی قومی خدمت تو بجا لا سکیں اور یا اگر ہمارا مذاق حسن اتفاق سے بہت ہی سلجھا ہوا ہوتا ہے اور گھر میں ایک آدھ آئینہ دار الماری بھی موجود ہوتی ہے تو ان کتابوں کو جن کا پشتہ مطلا و مذہب ہو قرینہ سے اس میں چن دیتے ہیں تاکہ یہ علمی سرسوں ہر وقت آنکھوں میں پھولی رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ الماری میں نہایت اہتمام سے قفل ابجد بھی ڈال دیا جاتا ہے، جس کی کشائش کے لیے کلید وسواس ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔"

....

"ہم جو کالج سے ہزاروں علمی ولولوں کا خلعت فاخرہ پہنے ہوئے بصد شان زیبائی نکلے تھے، اس موج گونا گوں کے بوقلموں تھپیڑے کھاتے ہوئے اتفاق سے ہانپتے کانپتے کرارے پر چڑھ آئے، تو حالت یہ تھی کہ بجز ایک غرقی کے قامت کج اندام پر اور کچھ نہ تھا۔ یاران سر پل نے استفہام استہزائی کی نئی دھن میں آوازہ کسا کہ ع

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟"

"ستارۂ صبح، یکم دسمبر ۱۹۱۶ء" ....

"وادی بطحا سے جو ابر رحمت ۵۷۰ء میں اٹھا تھا وہ در افشانی کرتا ہوا ربع مسکون کے چپے چپے پر دولت و اقبال، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے موتی بکھیرتا گیا جن کی فراوانی کو تاریخ کی تنگ دامانی کا آج تک گلہ ہے۔ اسلام کے سایہ میں بیسیوں قوی شوکت سلطنتیں قائم ہوئیں جن کی دھاک اقصائے عالم میں بندھ گئی۔" [(المرابطین) پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰ء]

"محمد مصطفیٰ کی آمد آمد کا غلغلہ دنیا میں تین ہزار سال سے بلند تھا اور وہ جنہیں مبدء فیاض نے گوش شنوا اور دیدۂ بینا عطا کیا تھا، خلیلؑ آذر کے دست بدعا ہوتے ہی سمجھ گئے تھے کہ کائنات انسانی کی تخلیق کا منشا زود و دیر پورا ہونے والا ہے۔"

(لطائف الادب صفحہ ۱) ....

"آخر اپنے وقت پر خدا کا عہد پورا ہوا اور دیکھنے والوں نے

دیکھ لیا کہ مکہ کے ایک یتیم کے آنسو کفر سے لتھڑی ہوئی دنیا کی اُن آلائشوں کو کس طرح بہا لے گئے جو طوفان نوح کی موجوں سے بھی نہ دھوئی جا سکتی تھیں۔"

.... (لطائف الادب صفحہ ۲)

"اس پر بخت نصر اور زیادہ بگڑا اور استبداد کی اُس جبارانہ شان کے ساتھ جو آج بھی ملوکیت کے دیوتاؤں کی چتونوں سے ٹپکتی ہوئی دیکھی جاتی ہے، حکم دے دیا کہ بابل کے تمام کاہن اور جادوگر اور ستارہ شناس اور دانشور چن چن کر قتل کر دیے جائیں۔"

.... (لطائف الادب صفحہ ۳)

"صاحبدلوں کے لیے تو صرف یہی شہادت کافی ہے لیکن بے بصروں کو اگر روشنی کی ضرورت ہو تو وہ ۱۹۲۲ء کے واقعات پر نظر ڈال لیں کہ کس طرح جب طواغیت کفر و جہولت ضلالت کے ہجوم سے خلافت الٰہیہ پر جہان تنگ ہو گیا تھا تو دفعۃً وہی ازغیبی پتھر جو تیرہ صدی پیشتر اوج بطحا پر بلند ہوا تھا فضائے انگورہ میں نمودار ہو کر اُن کے کاسۂ سر پر گرا اور اُنہیں خاک میں ملاتا گیا اور اب رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے کہ تمام دنیا پر از سر نو چھا جائے۔"

.... (لطائف الادب صفحہ ۱۰)

"یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کی جبلت بدل گئی ہے اور ایثار و احسان کے ملکوتی قواء اُس کی فطرت سے چھین لیے گئے ہیں۔ "لن تجد لسنة الله تبديلا ۔ ولن تجد لسنة الله تحويلا ۔" یہ فطرت اپنی اصلی صورت پر آج بھی قائم ہے۔ لیکن اس کا جلوہ بجلی اور بھاپ، شراب اور کباب، کوٹ اور پتلون کے اُس لعنت کدہ میں نظر نہ آئے گا جس کے بسنے والے آنکھوں کے اندھے ہونے پر بھی اپنا نام نین سکھ بتاتے ہیں اور اپنے سوا باقی تمام دنیا کو ابدالآباد تک غلام بنائے رکھنے کی دھن کے باوجود مہذب کہلاتے ہیں۔ انسانیت کو اگر اپنی اولین غیر مسخ شدہ حالت میں دیکھنا ہو تو اُن گھنے جنگلوں میں چلے جاؤ جن کے درختوں کی جڑیں ابھی تک

تہذیب فرنگ کے تیشہ کی ضربوں سے محفوظ ہیں ۔ اس تاریکی میں تمہیں اُس نور کی ایک جھلکی سی نظر آ جائے گی جو کبھی آدم کے سینے میں چمکا، کبھی طوبیٰ کی وادی میں جھلملایا اور کبھی فاران کی چوٹی پر جگمگایا تھا ۔“

(لطائف الادب صفحہ ۴۰) ....

” از بسکہ عالم رویا میں کوئی طاغوتی قوت حضور ختم المرسلینؐ کی شکل اختیار کرنے پر قادر نہیں ہے، یہ خواب از قبیل اضغاث احلام نہیں بلکہ منجملہ رویائے صادقہ تھا ۔“

”تسخیر حجاز کا گستاخانہ عزم ریجینالڈ ڈی شاٹیلان کی زبان سے اچھی طرح ادا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نور الدین زنگی کی کفر سوز تلوار کی طرح صلاح الدین ایوبی کی شمشیر خون آشام صاعقہ قہر ذوالجلال بن کر اُس کی گردن پر تھی ۔“

(لطائف الادب صفحہ ۷۱، ۷۲)

”چارلس مارٹل کے زور بازو نے یورپ کے دور جہالت پر دو بڑے احسان کیے ہیں ۔ فرانس میں اندلسی عربوں کی فاتحانہ پیش قدمی کو روک کر اُس نے شمع علم و حکمت کی گیتی افروز شعاعوں کو قرنہا قرن تک ظلمت کدۂ فرنگ میں داخل نہ ہونے دیا ۔ اسی کے ساتھ گریگوری ثالث پاپائے روما کو جو اُس وقت تک دنیوی امور میں قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت کا دست نگر تھا اپنی تلوار کی حمایت میں لے کر اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ کلیسائے روما نہ صرف دینی بلکہ دنیوی معاملات میں بھی مسیحی دنیا کا پیشوائے اعظم ہے ۔“

(حقیقت و افسانہ ۔ ”تصریحات“ مونسرات صفحہ ۱۲۳)

ظفر علی خاں کا اُسلوب نگارش

ظفر علی خاں کی نثر اُن کے مخصوص ذہن، مزاج اور ماحول کی آئینہ دار ہے۔ اُن کی سیمابی فطرت اور ماحول کی ہیجانی کیفیت نے مل کر اُن کے اُسلوب نگارش کو رعب دار اور پر شکوہ بنایا۔ ظفر علی خاں محاربۂ عمل کے ایک تیز رو مسافر تھے۔ عقل سے زیادہ جذبہ، فکر سے زیادہ عمل اور سکون سے زیادہ ہنگامہ اُنھیں عزیز تھا۔ طوفانوں کی تندھی، بادلوں کی کڑک، بجلی کی چمک، آبشاروں کے خروش اور پیچ و خم کھاتے ہوئے پرشور پہاڑی ندی نالوں سے اُن کے مزاج کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ شاعری کی طرح اُن کی نثر میں بھی ہیبت و جلال کے یہ عناصر بڑی فراوانی سے مل جاتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی نثر میں پرشکوہ اور بلند آہنگ تراکیب کا جابجا استعمال اسی رجحان طبع کے نتیجے میں ہوا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ و تراکیب ظفر علی خاں کے مخصوص مزاج کا پتہ دیتی ہیں: کاسہ لیس، کاسہ لیسان ازلی، حقیقت نفس الامری، ربع مسکون، ظلمت کدۂ فرنگ، ببانگ دہل، جابر و قاہر، آن بان، گجردم، اڑا اڑا دم، فیروزہ گوں، زلزلہ، آتش صاعقہ، برق، طاغوت، استبداد، قہر ذوالجلال، کفر سوز، آویزۂ گوش، داد و دہش، جلال و جبروت، قضا و قدر وغیرہ۔

ظفر علی خاں کی نثر میں محاورات کا استعمال بڑی کثرت سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ محاورے بڑے بر محل ہوتے ہیں

اور بعض دفعہ محاورات موقع بے موقع ٹھونسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض محاورے حسن و لطافت کا مظہر ہوتے ہیں اور بعض بڑے تخیف اور عامیانہ نظر آتے ہیں جو مذاق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کے عامیانہ محاورات کا استعمال وہ اپنی تحریروں میں بڑے شوق اور کثرت سے کرتے ہیں: اڑنگے پر لانا، پٹخنی دینا، کرارے پر چڑھنا، دیدے پٹم کرنا وغیرہ۔ یہ محاورے ظفر علی خاں کے مزاج سے تو ایک خاص مناسبت رکھتے ہیں لیکن اُن کی سنجیدہ علمی یا خطیبانہ تحریروں کو پایۂ ثقاہت سے گرا دیتے ہیں۔

ظفر علی خاں کی نثر میں جذبے کے علاوہ تخیل کی بھی کارفرمائی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک رومانی نثر نگار تھے۔ ٹھوس حقائق کو بیان کرتے ہوئے بھی اُن کا ذہن تخیل کے شہپروں پر سوار ہو کر انجانی فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کے بھی پر جلتے ہیں:

"انسانیت کو اگر اپنی اولین غیر مسخ شدہ حالت میں دیکھنا ہو تو ان گھنے جنگلوں میں چلے جاؤ جن کے درختوں کی جڑیں ابھی تک تہذیب فرنگ کے تیشے کی ضربوں سے محفوظ ہیں۔ اس تاریکی میں تمہیں اس نور کی ایک جھلکی سی نظر آئے گی جو کبھی آدم کے سینے میں چمکا کبھی طوبیٰ کی وادی میں جھلملایا اور کبھی فاران کی چوٹی پر جگمگایا تھا۔"

"عقل انسانی صحراؤں کو چھانتی، گلزاروں کو روندتی، سمندروں کو کھنگالتی، ہواؤں کو چیرتی ہوئی آسمانوں کو بھی توڑ کر

نکل گئی لیکن اس گھاٹی میں سے ہو کر نہ گزر سکی جو آدمیت کا اولین مرحلہ تھا۔''

یہ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ یہ ایک رومانی ادیب کا لہجہ ہے۔ اس کے آہنگ میں خطیبانہ جوش بھی بل کھاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ شاعری کی طرح ظفر علی خاں کی نثر میں بھی آہنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ جوش آفرین آہنگ کے طبعاً دلدادہ تھے۔ دھیمی دھیمی آنچ کے مقابلے میں انھیں بھڑکتے ہوئے شعلے اور آتش بار شرارے عزیز تھے۔ جوئے نغمہ خواں کے مقابلے میں انھیں جوئے کہسار کا مہیب شور پسند تھا۔ طبیعت کی اس شورش پسندی نے اُن کے نثری آہنگ میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ کبھی وہ ہم صوت حروف کی تکرار سے، کبھی ہم آواز الفاظ کے استعمال سے اور کبھی فقروں کے باہمی تضاد اور ٹکراؤ سے ایک ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس میں عبارت کا زیر و بم ایک ایسے شخص کے دل کی دھڑکنوں کو ظاہر کرتا ہے جو میلوں پیادہ پا اور تیز رو چلنے کے بعد بھی اپنے تنفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے اور اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر سکتا ہے۔ شاید اُن کی میلوں لمبی اور تیزگام سیر نے بھی اُن کے آہنگ میں یہ کیفیت پیدا کی ہو۔ یہ صورت اُن کی نثر کے پہلے دور میں بھی ملتی ہے اور دوسرے دور میں بھی۔ وہ کسی چیز کے بیان میں ایجاز و اختصار کی بجائے شرح و تفصیل سے کام لیتے ہیں۔

پھیلاؤ کے اس رجحان نے ان کی عبارت میں فقرات کی طوالت کو طویل تر بنا دیا ہے۔ حروف ربط و اتصال کی مدد سے وہ ایک ہی بات کو مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایک ہی طویل فقرہ پیچ و خم کھاتا ہوا بلا تکان ایک طویل پیراگراف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عبارت کے اس پیچ و خم میں ایک ایسا نغمہ و آہنگ پیدا ہوتا ہے جو پہاڑی چٹانوں سے ٹکراتی اور بل کھا کر اپنا راستہ بناتی ہوئی پرخروش ندی کے شور سے مشابہ ہوتا ہے [مثلاً معرکۂ مذہب و سائنس کے دیباچے کی عبارتیں ملاحظہ ہوں]۔ ذیل کے پیراگراف میں طویل فقرات کا آہنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"مسیحیوں نے اپنی ان گنت شکستوں کا بدلہ مسلمانوں سے گن گن کر لیا۔ بیت المقدس میں پہنچ کر ستر ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے ہاتھ رنگے، آندلس کے لاکھوں فرزندان توحید کو آگ میں جلا کر، پھانسی پر لٹکا کر یا دیس نکالا دے کر ان کا نام و نشان ایسا مٹایا کہ آج وہاں خدائے واحد کا ایک پرستار بھی نظر نہیں آتا، مراکش، تونس، الجزائر اور طرابلس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ترکستان، ماوراءالنہر اور خوارزم کے کان میں اپنے تعبد کا حلقہ ڈال دیا، ہندوستان کے اسلامی اقتدار کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دیں، بلقان میں کلمہ گویوں کے خون کی ندیاں بہا کر اُن مسجدوں اور مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنا اصطبل بنالیا، مسیحی دنیا نے یہ سب کچھ کیا، مگر اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اُس کے دل سے اُس گزرے ہوئے زمانے کی یاد محو نہ ہوسکی، جب اسلام کے سپاہی یثربی جوش میں بھرے ہوئے دنیا میں خدا کا نام بلند کرنے نکلے تھے جب اُن کے صحرا نورد باد پاؤں نے اپنی برق ٹاپوں سے بحر اوقیانوس کی فیروزہ گوں موجوں کو اُچھالا تھا

جب اُن کا نیزۂ خوں فشاں ہسپانیہ کے سینے کو چھلنی کرتا ہوا فرانس کے جگر پر جا پہنچا تھا جب اُنہوں نے روما پر شبخون مار کر سینٹ پیٹر کی چاندی کی قربان گاہ آ کھاڑ پھینکی تھی جب ان کے قدموں کی دھمک سے وائنا کے در و دیوار میں زلزلہ پڑ گیا تھا۔ اسلام کی اقبالمندی کے اس گزشتہ دور کی صرف ایک یادگار جسے دولت عثمانیہ کہتے ہیں دنیا میں باقی رہ گئی تھی اور اب مسیحی اس فکر میں تھے کہ کسی طرح یہ یادگار بھی مٹ جائے اور کالدیہ یونان، مصر اور روما کی طرح اس کا نام بھی افسانہ ہوجائے۔"

..........[لطائف الادب (تحریک اتحاد تورانی) ص ۲۱]

ظفر علی خاں کی نثر میں رومانی خطابت کا پرجوش انداز بھی ملتا ہے جس میں کوئی منطقی ربط شاذ ہی ہوتا ہے۔ جذبہ اور ہنگامہ اس انداز کی خصوصیت ہے۔ ساز کے جس تار کو بھی چھیڑ دیجیے اُس میں سے پرخروش زمزمے نکلنے لگیں گے۔ بعض اوقات ایک ایک فقرہ اپنے دامن میں کوہ آتش فشاں کی حرارت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ مثلاً:

"داس کی چتا کے شعلوں میں مجھے برطانی مملکت کا سنگھاسن لرزتا ہوا نظر آتا ہے!"

"داس کی موت برطانی ملوکیت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی!"

یہ ایک رومانی انقلاب پسند کا لہجہ ہے۔ کبھی دلائل و براہین کے طویل سلسلے کے بعد فیصلہ کن انداز میں ایک بلند آہنگ فقرہ، جو تھوڑے سے پیچ و خم کے بعد قاری کے ذہن کو ایک حتمی نتیجے پر پہنچا کر تحسین و آفرین کہنے

پر مجبور کر دیتا ہے :

"کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک کہ اُس کے باشندے مصنوعات میں اپنی ضروریات زندگی کے متکفل آپ نہ ہوں۔ وہ ملک جو اپنے لوازم تمدن کے لیے اغیار کا دست نگر ہے کلاغ بےپروبال کی طرح طفیل خوارہ ہے۔ اس پر بھی اگر اسے شاہین تیز پرواز کی ہمسری کا دعویٰ ہو تو اُس کی حالت پر رونا چاہیے۔"

(روح معانی، صفحہ ۲۴)

"عزیزانِ ملت! آپ نے مسیحی تہذیب کے کارناموں کی کسی قدر تفصیل سن لی جس پر آج تک نہ لارڈ رابرٹ سیسل چراغ پا ہوئے نہ مسٹر ایسکوئتھ کی رگ انسانیت پھڑکی نہ اسقف کنٹربری کو طیش آیا نہ لندن ٹائمز کے ابروئے ثقاہت میں گرہ پڑی۔"

(روح معانی صفحہ ٦٢)

"رچرڈ کی شمشیر زنی، کینن مکال کی آتش بیانی اور گلیڈ سٹون کی زہر چکانی سے جو کام نو سو سال میں نہ نکل سکا تھا کرنیل لارنس کے چند چکنے چپڑے فقروں سے چٹکی بجاتے میں نکل آیا۔ عرب اسلام کا ساتھ چھوڑ کر کفر سے جا ملا اور ترک خدا کے گھر سے جبراً نکال دیے گئے۔"

[لطائف الادب (تحریک اتحاد تورانی)]

ظفر علی خاں کی نثر میں شاعرانہ وسائل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ وہ طبعاً بھی شاعر تھے اور عملاً بھی ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ مسلم ہے۔ نثر میں صنائع بدائع کا استعمال، گاہے گاہے قافیوں کا التزام اور مسجع فقروں کا اہتمام اُن کی نثر کو شاعری کے قریب لے آتا ہے۔ یہ عناصر جب پرسکون فضا میں بےساختگی کے ساتھ تحریر میں آتے ہیں اور جذبے اور تخیل کی لہروں کے ساتھ مل کر

پر کیف نغمگی پیدا کرتے ہیں، تو عجیب لطف و کیف کا سماں ہوتا ہے۔ مثلاً ذیل کی عبارت نثر میں شاعرانہ مرقع کشی کا ایک دلآویز نمونہ پیش کرتی ہے:

"شام کا سہانا وقت تھا۔ ہوا کے جھونکے تازگی اور فرحت میں بسے ہوئے تھے۔ آسمان کا فیروزہ گوں دامن ابر کے ہر داغ، غبار کے ہر دھبے سے پاک و صاف تھا۔ دامن کوہ کے خود رو پھولوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ سورج مغربی افق کے نارنجی آنچل میں اپنا منہ چھپانے کے قریب تھا اور اس کی تمام تجلیاں سمٹ کر پہاڑی کی چوٹی پر پھیل گئی تھیں جہاں سے اُن کا عکس سمت مقابل کی زمردیں ڈھلوان پر پڑ کر کچھ بھیڑوں اور اُن کے چرواہوں کو موج نور میں غوطہ دے رہا تھا۔ درختوں کی شاخوں میں ہوا کی سرسراہٹ اور چار چشموں کی آبشاروں کے شور نے قدرت کے اس دلربا منظر میں ایک نئی ادائے دلآویزی پیدا کر دی تھی لیکن شاید اس سے بھی زیادہ دلکشا نظارہ اُن بھولے بھالے مہ جمال معصوموں کا تھا جنھیں موت کشاں کشاں اس وادی میں لے آئی تھی۔ وہ دیر سے میدان میں کھیل کود میں مصروف تھے۔ کبھی وہ تتلیوں کے پیچھے دوڑتے تھے کبھی پھول چنتے تھے، کبھی صاف اور چکنی کنکریاں اٹھا اٹھا کر جیبوں میں بھرتے تھے، کبھی سبز گھاس پر لوٹتے تھے، کبھی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ افسوس بیچارے اس سے غافل تھے کہ قضا اُن کے سر پر کھڑی ہے۔"

[حقیقت و افسانہ' (وقائع واثق باللہ عباسی) ص ٦٣]

ہم سانس روکے ہوئے حیرت و دلچسپی سے اس پر فضا منظر کے دلکش نظارے کو دیکھتے ہیں اور اس طرب ناک فضا کا المناک انجام ہمیں دم بخود کر کے آنے والے واقعات کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہ عبارت کسی افسانے کی نہیں

بلکہ ایک تاریخی مضمون کی ھے ۔ حقیقت و افسانے کا یہ حسین مرقع ادبی لحاظ سے قابل قدر ھے ۔

ذیل کی عبارت میں قافیوں کی دلآویزی ملاحظہ کیجیے :

''وہ قوم جسے دنیا بداوت کی وحشیانہ زندگی بسر کرتے دیکھتی تھی ، جس میں ساسانیوں کی عظمت و شان نہ تھی، رومائیوں کی آن بان نہ تھی، جو نا آشنائے فلسفۂ افلاطون تھی، نا آشنائے حکمت سولون تھی، تہذیب متعارفہ سے جو بیگانہ تھی، وحشت و بداوت کی دیوانہ تھی، وہی قوم، وہی غیر متمدن قوم جب شاعری کی دنیامیں آتی ہے تو اس کی زبان ابر رحمت بن کر حکمت کے موتی برساتی ہے''
[حقائق و معارف، ص ۷۳]

شبلی کی طرح ظفر علی خاں کی نثر میں بھی کہیں کہیں حروف کی صوتی تکرار اور الفاظ کے جوڑے پر کیف شاعرانہ رنگ پیدا کر دیتے ھیں :

''زمانہ ماضیہ کے تذکرے میں ہے کہ کیسے کیسے پیغمبر کیسے کیسے پادشاہ گزرے ہیں جن کی سیرتیں کس کس نہج کی تھیں ۔ اسی طرح اقوام و ممالک کے حالات میں ہے کہ کون کون سی قومیں کن کن ملکوں میں آباد ہوئیں اور انھوں نے کیا کیا آبادیاں بسائیں ۔'' [حقائق و معارف، ص ۹۶]

جذبے، تخیل ، آھنگ اور صوتی کیفیات کے یہ وہ عناصر ھیں جو ظفر علی خاں کی نثر اور شاعری کے اتصال پر واقع ھیں اور جن کے ذریعے آن کی تحریروں میں ایسی دلاویزی پیدا ھوتی ھے جو پڑھنے والوں کو مسرور بھی کرتی ھے اور مسحور بھی ۔

بحیثیت انشا پرداز ظفر علی خاں کا مرتبہ

ظفر علی خاں نے شعر و ادب کے کوچے میں جب قدم رکھا تو سر سید، حالی، شبلی اور نذیر احمد کا دور آخر تھا۔ انیسویں صدی کے اصلاحی رجحانات بیسویں صدی کے انقلابی رجحانات میں بدل رہے تھے۔ دور سر سید کی تعقل پسندی پر جذبات غالب آ رہے تھے۔ "مخزن" کے اجرا سے وہ تعلیم یافتہ نئی پود میدان عمل میں آگئی جو مشرق و مغرب کی کشمکش اور جذبے و عقل کی آویزش کے ماحول میں پروان چڑھی تھی اور اب نئی صدی کے نئے حالات اس کو دعوت فکر و عمل دے رہے تھے۔ حالات کی اس تبدیلی کے نتیجے میں سر سید کی عقلی تحریک کے رد عمل میں ایک جذباتی رومانیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔ سرسید دور کے ادیب عقل و استدلال پر زیادہ زور دیتے تھے نئے دور کے ادیب جذبے اور تخیل کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔ اس رجحان نے اردو کے نثری اسلوب کو اجتماعی طور پر خاصا متأثر کیا۔ ہنگامہ و پیکار کی فضا میں اردو نثر پرجوش خطیبانہ لہجے سے آشنا ہوئی جس کے اس زمانے میں دو بڑے نمائندے تھے، ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں۔

ظفر علی خاں کی نثر کے دو پہلو ہیں، بحیثیت (۱) مترجم اور (۲) مصنف۔ مترجم کی حیثیت سے وہ لفظی ترجمے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اصل تصنیف کے مفہوم پر ان کی نظر رہتی ہے اور وہ اس کی معنوی خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے آزاد

ترجمہ کرتے ہیں۔ موضوع کی پابندی کی وجہ سے اردو ترجمے میں بھی وہ منطقی ربط و تسلسل قائم رہتا ہے جو اصل تصنیف میں ہوتا ہے۔ محاورات سے انھیں طبعی دلچسپی تھی لیکن ترجمے میں وہ حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ مجموعی طور پر اُن کے تراجم میں سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ رنگینی کی ایک ہلکی سی لہر ملتی ہے جو اُن کے شاعرانہ مزاج کے مطابق ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اُن کے تراجم بعض اوقات ایسی پر کیف صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ شاید اصل (انگریزی) عبارت میں بھی وہ لطف و کیف نہ ہو۔ اس لیے پیشہ ور ترجمہ کرنے والوں سے اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ اس میں ذہنی کاوش ہی نہیں بلکہ اُن کی تخلیقی صلاحیتیں بھی کار فرما نظر آتی ہیں۔

بحیثیت مصنف و انشا پرداز ظفر علی خاں کی نثر میں قوس قزح کی طرح مختلف رنگوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ رنگین اور مرصع انداز بیان جو تراجم میں ذرا ہلکا ہے یہاں شوخ ہو جاتا ہے۔ محاورات کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ و تراکیب کا سلسلہ وسیع ہو جاتا ہے۔ ظفر علی خاں کا ذہن مختلف النوع الفاظ، محاورات اور تراکیب کا ایک ایسا مخزن ہے جس میں ہر رنگ اور ہر کیف کے نمونے بھرے پڑے ہیں اور جب وہ کسی جذباتی تحریک کے تحت اس مخزن سے ان نمونوں کو نکالتے اور استعمال کرتے ہیں

تو ان کا انداز اتنا بے تکلف اور بے ساختہ ہوتا ہے کہ آورد کا کہیں دخل نہیں ہوتا ۔ اردو کے ٹکسالی محاوروں کو جس بے تکلفی اور برجستگی سے انھوں نے استعمال کیا ہے اس کی مثال کم ہی ملے گی ۔ ظفر علی خاں کے اسلوب میں ایک جذباتی تسلسل تو ہوتا ہے، لیکن منطقی ربط ذرا کم ہوتا ہے ۔ وہ کسی خاص فکر و فلسفے کے داعی بھی نہیں تھے ۔ ان کا ایک جذباتی نقطۂ نظر ضرور تھا جس کے لیے وہ اظہار و بیان کے نئے نئے پیرائے اختیار کرتے رہتے تھے ۔ سیاست اور صحافت کے ہمہ جہت تقاضوں نے بھی انھیں ہمہ رنگ تحریروں کا عادی بنا دیا تھا ۔ ''اس طرز تحریر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے انداز نگارش میں ہر شعبۂ ادب کا حق ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ۔ جب وہ حکایت و افسانہ لکھتے ہیں تو شرر اور سرشار سے چشمک کرتے جاتے ہیں ۔ جب ٹھوس علمی مضامین پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ان کا طرز تحریر اسی غرض کے لیے وجود میں آیا تھا ۔ جب مزاح پر آتے ہیں تو ان کے اسلوب تحریر کا دامن وسیع ہو کر اس کو اس طرح اپنی پہنائیوں میں قبول کر لیتا ہے کہ طبیعت پر فرحت و انبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ تنقید کے وقت وہی اسلوب نگارش جو ابھی بزم طرب میں ساغر و مینا کی لطافت باریاں کر رہا تھا میدان رزم کا رہوار بن جاتا ہے اور ہر طرف شور الاماں بلند ہو جاتا ہے ۔ الغرض نہ خود

ظفر علی خاں علم و ادب کے کسی شعبے میں بند ہیں اور نہ اُن کا رھوار نگارش کسی وادی میں لنگ۔ وہ مزاح پر آتے ہیں تو کشت زعفران پیدا کر دیتے ہیں، تنقید پر آترتے ہیں تو جگر کو چھلنی چھلنی بنا دیتے ہیں۔ ٹھوس علمی مضامین لکھتے ہیں تو خشک ملا معلوم ہوتے ہیں، افسانہ نگاری کرتے ہیں تو سماں باندھ دیتے ہیں۔ لیکن ہر معاملے میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر موجود رہتی ہے اور وہ الفاظ کا شکوہ، محاورے کی صحت اور برجستگی، بندشوں کی چستی اور بیان کا بے ساختہ پن ہے۔"[1]

ظفر علی خاں کا اسلوب نگارش اپنے زمانے کے حالات اور ماحول کے تقاضوں کی پیداوار ہے جسے ان کے شاعرانہ مزاج نے بوقلموں رنگوں سے سنوارا ہے۔ یہ زمانہ عقل سے زیادہ جذبے اور استدلال سے زیادہ خیال کا آئینہ دار بن کر رومانیت کو فروغ دے رہا تھا۔ یہ زمانہ ایسے خواب دیکھتا تھا جو حقیقت میں موجود نہیں تھے، البتہ لوح تاریخ پر ان کے نقوش پارینہ ضرور ثبت تھے۔ یہاں پہنچ کر ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد دوسرے رومانی نثر نگاروں سے بالکل علیحدہ ہو جاتے ہیں جو ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر حقائق زندگی سے بہت دور چلے گئے تھے، کیونکہ وہ تاریخ کے ان نقوش پارینہ کو اپنے جذبۂ عمل سے ابھارنا بھی چاہتے تھے۔ عمل

(۱) نصراللہ خاں عزیز، دیباچہ حقیقت و افسانہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۰ء

کے اس جذبے نے ان کے خیالات میں جوش و خروش اور ترغیب و تلقین کا ایسا عنصر شامل کر دیا ہے جو پڑھنے والوں کو سلاتا نہیں بلکہ جھنجوڑ کر آمادۂ عمل اور برسر پیکار کرتا ہے۔ اس چیز نے ظفر علی خاں کی نثر کے آہنگ کو بڑا پرخروش بنا دیا ہے اور وہ سیدھی سادی بات کو اپنے جذباتی اور رومانی انداز میں بلند آہنگ بنا کر قارئین کو دعوت عمل دیتے ہیں۔ لیکن یہ تمام انشا پردازی بقول سالک ہنگامی مواقع پر محض شدت اور اثر پیدا کرنے کی غرض سے ہوتی تھی، ورنہ جہاں صبر و سکون کے عالم میں اپنے خیالات پیش کیے جاتے تھے وہاں اُن کا بہار آفرین قلم نہایت سادگی و سلاست کے ساتھ دہلی و لکھنؤ کے دلآویز محاورات کے پھول بکھیرتا جاتا تھا۔[۲]

ظفر علی خاں کی نثر نگاری اور انشا پردازی نے دبستان پنجاب کی نئی پود کی ذہنی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اگرچہ اب زمانے کا رنگ بدل گیا ہے اور انشا پردازی کا وہ جوش آفرین انداز کچھ متروک ہو گیا ہے جسے ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد نے عصری تقاضوں کے تحت اختیار کیا تھا، تاہم اس اثر پذیری کے نقش و نگار اب بھی بعض ادیبوں کے ہاں بکھری ہوئی شکل میں مل جاتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی نگارشات اپنے ماحول کی پیداوار اور اپنے زمانے کی ترجمان ہیں،

(۲) عبدالمجید سالک، علی گڑھ میگزین (۵۴-۱۹۵۵ع)۔

اس لیے اُن کا شمار ادب العالیہ کی صف میں ہونا چاہیے۔ ظفر علی خاں کا مرتبہ بحیثیت صاحب طرز ادیب و انشا پرداز مسلّم ہے اور اُردو کے رومانی ادیبوں میں انھیں ایک بلند حیثیت دیے بغیر چارا نہیں۔

چھٹا باب

ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری

آردو صحافت کی تاریخ میں ظفر علی خاں کا کیا مرتبہ و مقام ہے ؟ نیز بحیثیت صحیفہ نگار آن کی نثر کی قدر و اہمیت کیا ہے ؟ ان امور کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے برعظیم میں صحافت، علی الخصوص آردو صحافت کے ارتقا پر ایک نظر ڈال لیں۔

صحافت اور صحیفہ نگاری انسانی تہذیب و تمدن کے عروج کا نشان ہیں۔ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، اور معاشرتی مقتضیات کے ماتحت وہ ہمیشہ اپنوں اور بیگانوں کے حالات جاننے اور اپنے گرد و پیش کے واقعات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اسی تجسس اور جاننے کی فطری خواہش نے ترقی کرتے کرتے صحیفہ نگاری کو جنم دیا۔ ابتدا میں یہ ناپختہ روایت شاہی درباروں اور امرا کے حلقوں تک محدود رہی۔ مخبر، پرچہ نویس اور وقائع نگار شاہی درباروں سے منسلک ہوتے تھے اور سلطنت کی چھوٹی سے چھوٹی خبر سے حکومت کو مطلع کرتے رہتے تھے، اور حکومت کے اعلانات و فرامین سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچاتے تھے۔ گویا اس

انتظام کا تعلق رعایا سے زیادہ راعی کی ذات سے تھا - کہا جاتا ہے کہ ساڑھے سات سو سال قبل از مسیح رومن سلطنت میں روزانہ ایک قلمی خبر نامہ جاری کیا جاتا تھا جس میں سرکاری اطلاعات ، نیز میدان جنگ کی خبریں ہوتی تھیں -[1] صحافت کی ترقی کے سلسلے میں تہذیب کے پرانے گہوارے چین کو اس اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ وہاں کاغذ کی ایجاد کے علاوہ چھپائی کا کام بھی سب سے پہلے ہوا - ساتویں صدی عیسوی تک چین میں طباعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اسی زمانے میں پیکنگ سے دنیا کا پہلا مطبوعہ اخبار جاری ہوا - یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی میں پہلے پہل ٹائپ کا استعمال شروع ہوا اور جرمنی میں پہلا مطبوعہ اخبار ۱۶۰۹ع میں جاری کیا گیا - اس کے بعد انگلستان ، فرانس اور امریکا میں بھی اخبارات جاری ہوئے - انگلستان میں اخباروں کی آزادی کے حق کو ۱۶۴۱ع میں قانوناً تسلیم کیا گیا جس نے اخبارت کی ترقی میں مہمیز کا کام دیا ، اور اخبارات سیاسی و معاشرتی مسائل میں اہم حصہ لینے لگے - غرضیکہ طباعت اور مواصلات کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ صحافت کی روایت بھی دنیا کے اکثر ملکوں میں پھلتی پھولتی رہی اور اس کو سیاسی در و بست اور معاشی و معاشرتی مسائل پر بحث کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہونے لگی -

---

(۱) عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی ، (علی گڑھ) ۱۹۵۷ع ص ۱۹-

برعظیم پاکستان و بھارت میں موجودہ صحافت (یعنی مطبوعہ صحافت) کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں - بلکہ کمپنی کی حکومت اور ہندوستانی صحافت کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے .. زمانۂ قدیم میں یہاں بھی خبر رسانی یا صحیفہ نگاری کی وہی ناپختہ روایت قائم تھی جو دنیا کے دوسرے حصوں میں ہمیں نظر آتی ہے - منوجی کے دستور حکومت میں بھی خبر رسانی کا باقاعدہ انتظام تھا جس کو کسی نہ کسی شکل میں مابعد کی ہندو اور مسلمان حکومتوں نے بھی اپنے اپنے عہد میں جاری رکھا - وقائع نگار اور اخبار نویس سلطنت کا جزو لاینفک سمجھے جاتے تھے - مغلوں کے عہد میں وقائع نگار، خفیہ نویس، پرچہ نویس اور ھرکارے اس سلسلے کی اہم کڑیاں تھے، اور وقائع نویسی باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کرکے ملک گیر صورت اختیار کر چکی تھی - بقول علامہ ابوالفضل "واقعات سلطنت کا قلم بند کرنا نہ صرف مملکت و دولت کی ترقی اور انتظام کے لیے ضروی ہے بلکہ ہر طبقے اور ہر مجلس کی رونق کو بحال رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے - اگرچہ قدیم زمانے میں بھی اس طریقے کا پتہ چلتا ہے مگر اس کی اصل حقیقت سے اھل زمانہ کو اس عہد مبارک میں (یعنی اکبر اعظم کے وقت میں) آگاھی ھوئی -"[۱] چنانچہ اس وقائع نویسی کے نتیجے میں شاھی قلعے

---

(۱) آئین اکبری (اُردو ترجمہ - مطبوعہ جامعہ عثمانیہ) ص ۳۸۱ -

سے قلمی اخبار بھی جاری ہونے لگے جس کی نقلیں شاہی محل کے علاوہ دور دراز کے امرا تک بھیجی جاتی تھیں۔ گویا جدید صحافت کے آغاز سے پہلے بھی یہاں صحیفہ نگاری کا ایک سلسلہ موجود تھا۔ بقول عبداللہ یوسف علی ہندوستان کی اخبار نویسی کے حالات پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے ملک میں اخبار نویسی کا آغاز موجودہ مطبوعہ اخبار کی صورت میں ہوا، اس خیال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ڈاک کا سلسلہ ۱۸۴۰ع میں ڈاک کے ٹکٹ کی ایجاد سے شروع ہوا۔ ڈاک کا عمدہ اور بہتر انتظام سرکاری اغراض کے لیے قدیم زمانے سے جاری ہے۔[1]

بہرکیف، موجودہ مطبوعہ صحافت کا آغاز ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اس وقت ہوا، جب یہاں چھاپہ خانے قائم ہوئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برعظیم میں سب سے پہلے بدیسی مطبوعہ صحافت کا آغاز ہوا، یعنی انگریز تاجروں نے سب سے پہلے کمپنی کے مقبوضات میں اخبار جاری کیے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا انگریزی اخبار "بنگال گزٹ" ۱۷۸۰ع میں جاری ہوا جو اپنے مدیر Hicky کے نام کی رعایت سے ہکیز گزٹ بھی کہلاتا تھا۔ اس کے بعد کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے کئی اور انگریزی اخبار نکلے جو بالعموم ۸"×۱۲"

---

(۱) انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، الہ آباد ۱۹۳۶ع، ص ۱۱۸۔

سائز کے چار صفحوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ہفتے میں ایک بار نکلتے تھے اور اشاعت دو دو تین تین سو سے زائد نہ تھی۔ ان کے قارئین بھی زیادہ تر یورپین لوگ ہی تھے۔

دیسی زبان کے اخباروں کے اجراء کے سلسلے میں پہلے عیسائی مشنریوں نے قدم اٹھایا اور ۱۸۱۸ء میں بنگلہ زبان میں ''سماچار درپن'' نکالا۔ اس کے بعد بنگلہ ہی میں پہلا خالص ہندوستانی اخبار ''سمبد کمودی'' ۱۸۲۱ء میں جاری ہوا جس کے شرکاء تارا چند دت، بھوانی چرن بندھو پادیا، راجا رام موہن رائے تھے۔ بنگلہ کے بعد اردو، فارسی صحافت کا آغاز ہوا۔ فورٹ ولیم کالج نے سادہ نثر نگاری اور چھاپے کا سلسلہ قائم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اردو کا حلقۂ اثر وسیع تر ہونے لگا تھا۔ تاہم ملک کی علمی، دفتری اور کاروباری زبان تاحال فارسی ہی تھی۔ اردو، فارسی صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء سے ہوا۔ ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا اخبار تھا جو غالباً مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا لیکن چھ نمبروں کی اشاعت کے بعد مئی ۱۸۲۲ء میں اس نے اردو کا چولا آتار کر فارسی کا جامہ پہن لیا۔[1] اس اخبار کے مدیر کا نام سدا سکھ تھا۔ فارسی کا پہلا اخبار ''مراۃالاخبار'' ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا۔ اس کے مدیر راجا رام موہن رائے تھے۔ مئی ۱۸۲۳ء میں فارسی ''جام جہاں نما'' کے ساتھ ساتھ

---

(۱) عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۹۔

اردو ''جام جہاں نما'' بھی نکلنے لگا۔ اس کی ضخامت ۲۰×۳۰/۸ سائز کے چار صفحات تھی۔ یہ دو کالمی اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اردو کا یہ پہلا اخبار ۲۲ جنوری ۱۸۲۸ع سے بند کر دیا گیا کیونکہ بقول مدیر ''قدر شناس جن کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی، اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جنہوں کی زبان (اردو) ہے، وے فارسی تحریر چاہتے ہیں۔ میں خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتہ سے ہندی فرمان کے عوض ایک فرمان اور بھی فارسی میں لکھا جائے جس میں اس اخبار کے پڑھنے والے خوشی سے پڑھیں اور یہ کاغذ نمود پائے۔''[1]

ان دیسی اخبارات کے اجرا سے باقاعدہ طور پر دیسی مطبوعہ صحافت کا آغاز ہوتا ہے اور کچھ اور اخبارات بھی رفتہ رفتہ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ کمپنی کی حکومت کے لیے بڑا نازک تھا۔ ہر چند کہ سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۸۹۹ع) کے بعد انگریزوں کا ایک بڑا حریف میدان سے ہٹ گیا تھا لیکن مرہٹوں کے ساتھ ابھی جنگیں جاری تھیں۔ ہندوستانی عوام کا اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ علما کی جد و جہد شروع ہو چکی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر کمپنی کے ارباب بست و کشاد اخبارات پر احتساب کی پابندیاں عاید کرنے لگے تھے۔ بقول سرٹامس منرو:

---

(۱) عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۱۶۴۔

"ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں، اُن کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی۔ . . . . . اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا۔ لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔" [۱۸۲۲ع]

چنانچہ بر عظیم کا پہلا پریس آرڈیننس دسمبر ۱۸۲۳ع میں نافذ کیا گیا جس نے اخبارات کی آزادی کو سلب کر لیا۔ اس آرڈیننس کے خلاف راجہ رام موهن رائے اور دوسرے هندوستانی اور کچھ منصف مزاج انگریز اخبار نویسوں نے اپیل کی جو نامنظور ہو گئی۔ راجا رام موهن رائے نے اپنی اپیل کے خارج هونے کے بعد بطور احتجاج "مراۃ الاخبار" کو بند کر دیا اور اس طرح آزادیٔ رائے کی خاطر ایک هندوستانی اخبار نویس نے پہلی قربانی اس صورت میں پیش کی !

سر چارلس مٹکاف کے عہد (۱۸۳۵ع) میں اخبارات پر عاید شدہ ڈیکلریشن کی پابندیاں ہٹا دی گئیں۔ یہاں سے بر عظیم کی صحافت کا ایک نیا دور شروع هوتا هے۔ کلکتہ کے علاوہ دهلی، آگرہ، کانپور، لکھنئو، لاهور، بنارس وغیرہ مختلف شہروں سے (جہاں چھاپہ خانے قائم هو چکے تھے) اردو، فارسی اخبارات جاری هونے لگے۔ اردو میں مولوی محمد باقر کا "دهلی اخبار" اور سید محمد کا "سید الاخبار" دهلی سے

۱۸۳۷ع میں جاری ہوئے اور پھر یہ سلسلہ (ایک سو کے قریب) وسیع ہوتا گیا ۔ یہ اخبارات ہفتہ میں ایک بار چھپتے تھے۔ چھپائی لیتھو کی ہوتی تھی ۔ تعداد اشاعت چند سو تک ہوتی تھی۔ خبروں کے علاوہ شعر و ادب بھی اخبار کی زینت اور دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ع میں بہت سے اخبارات بند ہوگئے ۔ انقلاب سے پہلے اور دوران انقلاب میں ان اخبارات میں سے بیشتر نے ملکی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کیا ۔ بقول لارڈ کیننگ :

”اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں ۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے ۔“ [۱۳ جون ۱۸۵۷ع]

غرض انقلاب ۱۸۵۷ع سے قبل کی ملکی صحافت سیاسی و معاشرتی اعتبار سے اس دور خلفشار کے مبہم خیالات اور دھندلے تصورات کی آئینہ دار تھی ۔ اجتماعی زندگی کا اضطراب و انتشار اس میں بھی موجود تھا ۔ کوئی منزل مقصود اس کے سامنے بھی نہیں تھی ۔ تاہم بعض اخبار نویس اپنے ضمیر کی آواز کو بڑی بے باکی سے ظاہر کر کے ملکی صحافت کی عمدہ روایات قائم کر رہے تھے ۔ مثلاً راجہ رام موہن رائے (مراۃ الاخبار)، رجب علی الحسینی لکھنوی (سلطان الاخبار)[۱]، مولوی محمد باقر

---

(۱) رجب علی لکھنوی (مدیر سلطان الاخبار، فارسی، کلکتہ، اجرا

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۳ پر]

(دھلی اردو اخبار)، ماسٹر رام چندر (فوائد الناظرین، محب ھند) اس دور کے نیم قومی شعور و احساس کے ترجمان تھے - لاھور کا ''کوہ نور'' اس دور کا ایک ٹوڈی اخبار تھا اور اس کا لب و لہجہ بھی بغایت پست تھا -

انقلاب ۱۸۵۷ع کی ناکامی کے بعد نئے سیاسی و معاشرتی حالات میں اصلاحی تحریکوں کا سلسلہ شروع ھوا تو مختلف تحریکوں نے اپنے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے صحافت کو ایک اھم ذریعے کے طور پر اپنایا - انگریزی اور دیگر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اخبارات جاری ھوئے - ۱۸۵۸ع میں منشی نولکشور نے لکھنئو سے ھفت روزہ ''اودھ اخبار'' نکالا جو ۱۸۷۴ع میں روزنامہ ھو گیا - اس اخبار کا کوئی خاص سیاسی مسلک نہیں تھا - سر سید نے ۱۸۶۶ع میں ''سائنٹفک سو سائٹی اخبار'' (بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) نکالا - اس اخبار کا سیاسی مسلک انگریزوں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۲

۲ اگست ۱۸۳۵ع) اور مرزا رجب علی بیگ سرور (مؤلف فسانۂ عجائب) دو الگ الگ شخصیتیں تھیں - سلطان الاخبار کے مدیر رجب علی بیگ سرور نہیں تھے، جیسا کہ عبداللہ یوسف علی کا خیال ہے (ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۱۲۷) - رجب علی لکھنوی کے حالات زندگی پردۂ اخفا میں ہیں، تاہم ''سلطان الاخبار'' کے صفحات ان کی جرأت و بیباکی، انگریز دشمنی اور وطن دوستی کی شہادت دیتے ہیں [ملاحظہ ہو ''ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۲۴۲ تا ۲۵۲]

اور مسلمانوں کی مصالحت تھا۔ سر سید نے دسمبر ۱۸۷۰ع میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرکے مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۷۷ع میں منشی سجاد حسین نے لکھنئو سے ''اودھ پنچ'' نکلا اور اردو صحافت میں طنز و مزاح کے چٹخارے کا اضافہ کر کے صحیفہ نگاری کو خاص و عام میں مقبول بنایا۔ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ملک میں کثیرالتعداد اردو صحیفے نکل آئے۔ ریاض الاخبار (خیر آباد)، نورالانوار (کانپور)، اخبار عام (لاہور)، محشر (لکھنئو)، پیسہ اخبار (لاہور)، وطن (لاہور)، پنجابی اخبار (لاہور)، اخبار انجمن پنجاب (لاہور)، وغیرہ اس زمانے کے قابل ذکر اخبار ہیں۔ اس دور کے نامور صحیفہ نگاروں میں سر سید، منشی سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، ریاض خیر آبادی، منشی محبوب عالم قابل ذکر ہیں۔ ان صحیفہ نگاروں نے اردو صحافت میں معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ صحافت کے معیار کو بھی ترقی دی۔ تاہم ابھی صحافت کو ملک میں وہ ہمہ گیری اور وسعت پذیری حاصل نہ ہوئی تھی کہ اسے عمومی صحافت کا درجہ دیا جائے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں کوئی ایسا بڑا طوفان نہیں آیا تھا جس سے صحافت پھیل کر عام ہو جاتی۔ انڈین نیشنل کانگرس اور علی گڑھ تحریک نے ملک کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں کچھ سوجھ بوجھ پیدا کر دی

تھی اور یہ طبقہ بھی محدود تھا اور صحافت بھی اسی دائرے تک محدود تھی !

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ھی بعض داخلی و خارجی محرکات کے تحت ملک کے سیاسی حالات پلٹا کھاتے ھیں۔ پرسکون فضا میں کچھ اضطراب کے آثار پیدا ہوتے ھیں اور بر عظیم کا حساس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ملک کی محکومی و بے کسی کو شدت سے محسوس کرنے لگتا ھے۔ شاعروں اور ادیبوں کے نغموں میں بھی وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش کروٹیں لینے لگتی ھے۔ بعض ھنگامی مسائل کی بدولت بنگال اور پنجاب میں یہ اضطراب تعلیم یافتہ طبقے سے بڑھ کر عوام میں پھیل جاتا ھے۔ عام بیداری کی اس لہر کا اثر اردو صحافت پر بھی پڑا۔ اسی زمانے میں بر عظیم کی اردو صحافت کے میدان میں تین بڑے صحیفہ نگار قدم رکھتے ھیں۔ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوھر اور ظفر علی خاں — ان پرجوش صحیفہ نگاروں کے خامہ ھائے خوں چکاں سے نکلے ھوئے حریت پرور افکار نے ملک کی ساکن فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا اور اردو صحافت کو بھی زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا !

ظفر علی خاں کی صحافتی زندگی کا آغاز دکن سے ھوا۔ انھوں نے پہلے ایک ادبی پرچہ ”افسانہ“ جاری کیا اور پھر ”دکن ریویو“ جس میں علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مضامین شائع ھوتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے انگریزی

جریدوں بمبئی گزٹ اور ٹائمز آف انڈیا میں بھی مضمون نویسی کا سلسلہ شروع کیا ۔ پنجاب کے بعض اخبارات سے بھی قلمی تعاون کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا ۔ ۱۹۰۷ع میں انہوں نے دکن ریویو کے دو ضخیم ''اسلام نمبر'' نکالے ۔ ان میں عالم اسلامی کے سیاسی و معاشرتی کوائف پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ مولوی عبدالحق نے اپنے طویل مضمون ''العالم اسلامی'' میں اسلامی ممالک کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کی تھیں اور ظفر علی خاں نے ''اتحاد بین المسلمین'' پر سیر حاصل بحث کر کے اس تصور کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا تھا ۔

حیدرآباد سے اخراج کے بعد ظفر علی خاں پنجاب چلے آئے ۔ وہ لاہور سے ایک انگریزی اخبار جاری کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ والد کے انتقال (دسمبر ۱۹۰۹ع) پر انہیں والد مرحوم کی وصیت کے مطابق ہفتہ وار ''زمیندار'' کی ادارت کے فرائض سنبھالنے پڑے ۔ مولوی سراج الدین احمد نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کسانوں اور زمینداروں کی فلاح و بہبود کے لیے جون ۱۹۰۳ع میں لاہور سے ''زمیندار'' جاری کیا تھا جسے پھر کرم آباد لے گئے ۔ جب ظفر علی خاں نے زمیندار کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کی اشاعت چھ سات سو تک محدود تھی ۔ یہ پرچہ کرم آباد سے ہر مہینے کی پہلی ، آٹھویں ، سولہویں اور چوبیسویں تاریخ کو جہازی سائز کے بارہ صفحات پر نکلتا تھا اور اس کی پیشانی پر یہ عبارت

(قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ) ہوتی تھی "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت آپ نہ بدلے۔" یکم فروری ۱۹۱۱ع سے اس عبارت کو اس شعر کا جامہ پہنا دیا گیا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہفتہ وار "زمیندار" معاشرتی اصلاح کا داعی تھا۔ مختلف خبروں کے علاوہ "سلسلۂ حکایات دلنشین" اور نظموں سے بھی اخبار کو مزین کیا جاتا تھا۔ تاہم ایک ہفتہ وار معاشرتی اصلاحی اخبار کی تنگ دامانی ظفر علی خاں کے حوصلوں کی جولانی کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ انھوں نے اگست ۱۹۱۰ع سے ایک ماہوار ادبی رسالہ "پنجاب ریویو" بھی جاری کر دیا۔ وہ "زمیندار" کو بھی ہفت روزہ کی بجائے ایک مؤقر روزنامہ بنانا چاہتے تھے جس کے لیے وسائل کا جائزہ لینے کے علاوہ موقع کا انتظار کرتے رہے۔ ۱۶ اپریل ۱۹۱۱ع کے پرچے میں کرم آباد کی بجائے لاہور سے "زمیندار" کی اشاعت کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"اس وقت تک "زمیندار" کو کرم آباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جو دنیا جہان سے الگ تھلگ ہے، ہم نے بھلی یا بری طرح جیسے بھی بن پڑا چلایا۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ ہمارے احباب اس کمی اشاعت کی تلافی جس کی ذمہ دار ہماری خلوت نشینی تھی، اپنی کرم گستری اور قدر شناسی کے اقتضا سے خود فرماتے رہیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قسام ازل نے "زمیندار" کی تقسیم عمل کی برکات میں سے حصہ نہ دینے ہی کی

ٹھانی ہوئی تھی، اور اس کے حلقۂ اشاعت کے وسیع کرنے کا کل بوجھ بھی ہماری ہی کمزور و ناتواں گردن کی ودیعت کیا گیا تھا۔ اس لیے مفصلات اور خاص لاہور کے بہت سے احباب کے تقاضوں اور مشوروں سے مجبور ہو کر ہم اپنا بوریا بدھنا اٹھاتے ہیں اور کرم آباد سے لاہور جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ لاہور کی آب و ہوا ''زمیندار'' کو راس آئے اور اس کی اشاعت اتنی بڑھ جائے کہ ہم اس کو رفتہ رفتہ ایک اعلیٰ پیمانہ کے روزانہ اخبار کی شکل میں ترقی دے سکیں۔''

اس کے بعد ''زمیندار'' کا آئندہ پرچہ یکم مئی ۱۹۱۱ع کو لاہور سے نکلا۔ وجاہت حسین جھنجانوی نے اس تبدیلیٔ مقام پر ایک نظم کہی[۱]:

شکر صد شکر نئی شان کا اخبار آیا
کرم آباد سے لاہور ''زمیندار'' آیا

---

(۱) لاہور میں ظفر علی خاں ہیرا منڈی کے ایک مکان میں مقیم ہوئے، اس پر یار لوگوں کو مذاق کا موقع مل گیا۔ یکم مئی ۱۹۱۱ع کے ''زمیندار'' میں ''عرض حال'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

خدا کا نام لے کر ہم لاہور آ گئے اور ہیرا منڈی میں ایک مکان لے لیا جس کے ایک طرف بادشاہی مسجد ہے اور دوسری طرف ایک شوالہ۔ لیکن خدا کا گھر پھر بھی چند قدم کے فاصلہ پر ہے اور مہا دیو جی کے استھان کی دیوار سے تو غریب خانہ کو نسبت اشتراک حاصل ہے۔ بادشاہی مسجد کے سربفلک میناروں کے منظر اور اس کی پنجوقتہ اذان کی صدا کو بلحاظ اتصال مکان و زمان چشم و گوش سے پھر بھی ایک طرح کی اعتباری مغائیرت ہے لیکن

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۹ پر]

لاھور آ کر ''زمیندار'' کی اشاعت بارہ سو ھوگئی ۔ اخبار کے نقطۂ نظر میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ۔ زمینداروں اور کسانوں کے علاوہ اسے مسلم عوام کے جذبات و احساسات کا ترجمان بنایا گیا ۔ نشر و اشاعت کے ذرائع کو وسعت دی گئی ۔ رائٹر نیوز سروس سے براہ راست خبریں حاصل کی جانے لگیں ۔ ھندوستان ، ٹریبون ، سول اینڈ ملٹری گزٹ ، پرکاش ، پنجابی اخبار ، وطن اور اخبار عام وغیرہ سے معاصرانہ چشمکوں کا دلچسپ سلسلہ شروع ھوا ۔ موضوعات کے تنوع پر حسن بیان نے سونے پر سہاگے کا کام دیا ۔ اخبار کی مقبولیت کا دائرہ وسیع ھونے لگا اور چند ماہ میں اشاعت دو ہزار تک جا پہنچی ۔

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸]

مہادیو جی کے گھنٹہ کی ٹن ٹن ، پیپل جی کے پتوں کی زمردیں بہار ، لنگ جی کی ترشی ہوئی پتھریلی چکنائی تو ہر وقت اندر لوک نگاہ اور بیکنٹھ گوش ہے ۔ غرض :

روکے مجھے ایماں ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے ، کلیسا میرے آگے

اللہ میاں اور شوجی کی ہمسایگی پر تو اپنے اپنے رنگ میں کون ہے جو نازاں نہ ہوگا لیکن پاس ہی ٹبی کا غارتگر ہوش و عقل محلہ واقع ہے جس کا قرب غضب ہے ۔ پنجاب مسلم کلب میں جب میاں محمد شفیع ، شیخ محمد اقبال ، مرزا جلال الدین اور دوسرے احباب نے پوچھا کہ مکان کہاں لیا اور ہم نے پتہ بتایا تو سب کے سب مسکرا دیے ۔ اس معنی خیز تبسم کا جواب ہمارے پاس بھی موجود تھا :

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سیاسی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں ''زمیندار'' آزادانہ تنقید کرتا تھا جس کی وجہ سے ابتلا و آزمائش کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ چند دیسی ریاستوں میں اخبار کا داخلہ بند کر دیا گیا لیکن انھیں ایام میں اطالیہ نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور ترکی کو مجبوراً جنگ میں کودنا پڑا۔ ''زمیندار'' کے فروغ کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۱۱ع سے ''زمیندار'' روزانہ اخبار ہوگیا اور جہازی سائز کے چار صفحوں پر چھپنے لگا۔ چند روز میں زمیندار کی اشاعت پانچ ہزار سے متجاوز ہوگئی۔ اخبار کی پیشانی پر پہلے والا شعر جلی حروف میں، اور دائیں جانب نیچے تاج کی تصویر اور اس کے ساتھ مرحوم نواب میر محبوب علی خاں (نظام دکن) کا یہ شعر درج ہوتا تھا:

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے بارے میں تازہ تازہ خبروں اور ظفر علی خاں کے پرجوش اداریوں نے ''زمیندار'' کو عوام کا مقبول ترین اخبار بنا دیا اور چند ماہ کے عرصے میں اس کی اشاعت بیس ہزار تک جا پہنچی جو برعظیم کی اردو صحافت میں اُس وقت ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ عوام کو اخبار کا چسکا پڑ گیا۔ ہر شخص صبح سویرے اٹھ کر ''زمیندار'' کا منتظر رہتا۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں ان پڑھ لوگوں کا

ذوق و شوق دیکھنے کے لائق تھا ۔ وہ دو پیسے کا ''زمیندار'' خریدتے اور ایک آنہ اس کی پڑھوائی پر خرچ کر دیتے ۔ گویا ''زمیندار'' برعظیم کا پہلا اُردو روزنامہ تھا جس نے ملک کے تعلیم یافتہ خواص کے علاوہ ان پڑھ عوام میں بھی اخبار بینی کا بے پناہ شوق پیدا کر دیا ۔

''زمیندار'' کے معاصر چند دوسرے نامور جریدوں کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ محمد علی جوہر نے ۱۹۱۱ع میں ریاست اندور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر کلکتہ سے ایک انگریزی صحیفہ ''کامریڈ'' نکالا جو شروع میں بذلہ سنجی کے پیرائے میں مسائل ملکی پر بحث کرتا تھا ۔ برطانیہ سے مخاصمت کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا ۔ شاہی دربار (دسمبر ۱۹۱۱ع) کے موقع پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کے ساتھ ہی نوجوان مسلم صحافیوں کے لب و لہجے میں تغیر نمایاں ہو گیا ۔ برطانوی حکومت کی بد عہدی کے خلاف اُن کا رویہ جارحانہ صورت اختیار کر گیا ۔ بقول سرمائیکل اوڈوائر ''محمد علی اور ظفر علی خاں پیدائشی صحافی تھے اور پرجوش فن خطابت کے شاندار ماہر ، اُن کے جوشیلے انداز خطابت نے ہندوستانی قارئین کو ازحد متأثر کیا ۔''[1] دارالحکومت کی تبدیلی کے ساتھ محمد علی جوہر ''کامریڈ'' کو دہلی لے آئے اور یہاں اس کے ساتھ اُردو میں ''ہمدرد'' بھی جاری کر دیا ۔

(۱) *India as I knew it.* London, 1925. p 175.

۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے وحید الدین سلیم کی ادارت میں ''مسلم گزٹ'' نکلنے لگا جس میں شبلی نعمانی کی نگارشات بھی چھپتی تھیں - جون ۱۹۱۲ء میں ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا جو ٹائپ میں چھپتا تھا اور اپنے دیدہ زیب صوری محاسن کے علاوہ آزاد کے پرجوش رومانی انداز خطابت کی وجہ سے اس نے ملکی صحافت میں بہت جلد ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کر لیا -

''زمیندار'' کی عام مقبولیت اور ظفر علی خاں کی صحافتی خدمات کی قدر و قیمت کا اندازہ معاصرانہ شہادتوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے - جب ۱۹۱۳ء میں ''زمیندار'' کی ضمانت طلبیوں اور ضمانت ضبطیوں کا پیہم سلسلہ شروع ہوا' تو ''الہلال'' نے ذیل کا ادارتی شذرہ لکھا :

''روزنامہ زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی طبقۂ خواص میں محدود تھی اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں یہ ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی - جنگ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنایا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہوگئی - اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کی ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دوکانداروں اور بازار کے بیٹھنے والوں تک پہنچا دیا - ہر شخص جو اُردو عبارت پڑھ سکتا ہے علی الصباح اس طرح زمیندار کا خواہش مند ہوتا تھا گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعۂ اخبار کے لیے بے قرار ہے - اس نے گو ابتدا میں ہندوستان کے معاملات کے متعلق کچھ نہ لکھا اور مسلمانوں کی سیاسی حالت پر

بھی کوئی توجہ نہ کی، تاہم اس نے جن جن معاملات کو لکھا، آزادی اور جرأت کے ساتھ لکھا اور پڑھنے والوں میں یقیناً زندگی کی ایک روح پیدا کر دی۔۔۔ اس کے حالات میں مزید تغیرات ہوئے اور زمیندار نے بیرون ہند کے اسلامی مسائل کے علاوہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کے متعلق بھی لکھنا شروع کیا۔ گو اس سے بے اعتدالیاں ہوئی ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ اصولاً اس نے ہمیشہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی سعی کی۔''

(الہلال، کلکتہ ۲۱ جنوری ۱۹۱۴ع)

غرض اس زمانے میں ظفر علی خاں نے زمیندار کے ذریعے اُردو صحیفہ نگاری کو ہمہ گیر بنا کر اسے مستحکم بنیادوں پر آستوار کر دیا۔ اس دوران میں انھوں نے ملکی سیاسیات میں بھی بڑی سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ یوں بھی اس زمانے میں سیاست اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ سیاسی جلسوں اور اخبار کے اداریوں میں خطابت کا لب و لہجہ یکساں کارفرما تھا۔ ظفر علی خاں نے اپنی سیاسی مصروفیات کے بڑھ جانے کی وجہ سے صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بعض کہنہ مشق ادیبوں اور صحیفہ نگاروں کو زمیندار کے عملۂ ادارت میں اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ چیز بعد میں زمیندار کی ایک مستقل روایت بن گئی۔ شروع دور میں جو صحیفہ نگار زمیندار سے منسلک رہے اُن میں وحیدالدین سلیم، عبداللہ العمادی، وجاہت حسین جھنجھانوی، نیاز فتحپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر

ھیں ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد [1] جو صحیفہ نگار وقتاً فوقتاً زمیندار سے منسلک رہے اُن میں عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت، اظہر امرتسری،

---

(۱) ظفرعلی خاں کی انگلستان سے دوسری بار مراجعت (۲۰ ستمبر ۱۹۱۴ع) کے موقع پر پہلی جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی ۔ ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ع کو حکومت پنجاب کے حکم سے انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا ۔ زمیندار نکلتا رہا اور ظفر علی خاں کا نام اس کی پیشانی پر مالک کی حیثیت سے چھپتا رہا ۔ ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ع سے زمیندار کی ملکیت بیگم صاحبہ ظفر علی خاں کے نام منتقل کر دی گئی ۔ دسمبر ۱۹۱۵ع کے اواخر تک زمیندار نکلتا رہا، پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کی بجائے مارچ ۱۹۱۶ع میں روزنامہ ''لمعات'' جاری ہوا ۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بھی بند ہو گیا ۔ دسمبر ۱۹۱۶ع میں ظفر علی خاں کو کرم آباد سے ایک ہفتہ وار علمی و ادبی رسالہ ''ستارۂ صبح'' نکالنے کی اجازت مل گئی جس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا تھا :

من آں ستارۂ صبحم کہ در محل طلوع
ہمیشہ پیش رو آفتاب می باشم

چھ سات ماہ کے بعد ''ستارۂ صبح'' کرم آباد کی بجائے لاہور سے نکلنے لگا اور ۲۷ اگست ۱۹۱۷ع سے روزانہ ہو گیا جس پر وجاہت حسین جھنجانوی نے ایک نظم لکھی :

نئی ادا سے ہوا جلوہ گر ستارۂ صبح
پئے ظفر ہے نشان ظفر ستارۂ صبح

سیاست ان دنوں ظفر علی خاں کے لیے شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتی تھی ۔ ''ستارۂ صبح'' میں قادیانیوں اور اہل طریقت سے نوک جھونک جاری رہی ۔ اس بحث و تکرار نے جب ناگوار صورت اختیار کر لی تو ظفر علی خاں کو مجبوراً یہ کہتے ہوئے :

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر]

نصراللہ خاں عزیز، انعام اللہ خاں ناصر، حسین میر کاشمیری، حاجی لق لق وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری پر روشنی ڈالنے کے لیے چند اداریوں کے اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۷ دسمبر ۱۹۱۱ع کے اداریے میں "اٹلی کی حالت زار" کے

[بقیہ حاشیہ]

"رخصت اے اہل نظر ہم تو سفر کرتے ہیں"

حیدر آباد (دکن) کا رخ کرنا پڑا۔ ستارۂ صبح کچھ عرصے تک عبداللہ العمادی کی ادارت میں نکلتا رہا، یہ بند ہوا تو پھر "آفتاب" نکلا جو کچھ دنوں کے بعد غروب ہو گیا۔ حریفوں نے ظفر علی خاں کا پیچھا حیدر آباد میں بھی نہ چھوڑا۔ وہاں سے دوبارہ ریاست بدر ہو کر پنجاب آئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ع میں پابندیاں ختم ہوگئیں اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ع سے "زمیندار" ازسرنو جاری ہوگیا۔ اب کے زمیندار نکلا تو اس کی پیشانی پر نظام حیدر آباد کا شعر حذف کر دیا گیا تھا، البتہ پہلا شعر بدستور قائم رہا۔

۱۹۲۴ع میں (جب کہ ظفر علی خاں جیل میں تھے) زمیندار میں ایک جلسے کی روداد میں مسٹر آئس مونگر (کپتان پولیس) کے بارے میں یہ فقرہ چھپ گیا تھا "سپرنٹنڈنٹ پولیس نے فیروز دین خادم خلافت کے ایک ہنٹر رسید کیا۔" اس پر سامراج کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور زمیندار کے خلاف سولہ ہزار روپے کی ڈگری ہو گئی۔ اس موقع پر ۱۴ جولائی ۱۹۲۴ع کو "زمیندار" کا ایک خاص نمبر نکلا جس کی پیشانی پر یہ شعر درج تھا:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ظفر علی خاں کی وفات تک "زمیندار" اس شعر کی ضیا بار کرنوں میں نکلتا رہا، اگرچہ اس کی آب و تاب عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔

عنوان سے یورپئین طاقتوں کی سیاسی بدعنوانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا گیا :

اب سے دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ اٹلی نے بغیر کسی وجہ و دلیل کے نہایت بے باکی سے باب عالی کے نام جنگ کا الٹی میٹم بھیج دیا تھا - حکومت عثمانیہ اٹلی کی اس پھرتی اور غداری کو دیکھ کر حیران رہ گئی - کیونکہ بظاہر اٹلی کے تمام مدبرین حکومت عثمانیہ کی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے اور بادی النظر میں کوئی بنائے خصومت بھی نظر نہ آتی تھی - لیکن حکومت عثمانیہ نے کمال فراخ حوصلگی و متانت سے کام لیا اور یورپ کو جس کا دعویٰ ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ساری دنیا کا پیش رو ہے ' اٹلی کی اس حرکت پر متوجہ کیا - مگر خدا جانے یورپ کیوں خاموش بیٹھا رہا - آخر اٹلی اپنے الٹی میٹم کے جھوٹے مطالبات کو پورا ہوتے نہ دیکھ کر طرابلس پر دیوانہ وار دوڑ پڑا - بابعالی نے دول یورپ کو اٹلی کی اس غاصبانہ کارروائی پر مکرر سہ کرر توجہ دلائی- لیکن یورپ کی طرف سے وہی ایک جواب ملا کہ بیچ بچاؤ کا موقع نہیں - ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دول یورپ کی کیا مراد تھی - انہیں میں سے ایک طاقت قانون بین الاقوام کے تمام قواعد کو توڑ کر دفعتاً جنگ کا اعلان کر دیتی ہے اور تمام یورپ مزے سے تماشا دیکھ رہا ہے - یوں تو دول یورپ اور مدبرین و منصفین یورپ نے چلا چلا کر اپنے گلے پھاڑے ہیں کہ صلح و امن کا قائم رکھنا ضروری ہے - بندگان خدا کا خون بہانا اچھی بات نہیں - ہیگ کانفرس پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور معاہدات کی ترتیب و تکمیل میں بڑے شد و مد سے حصہ لیا جاتا ہے - لیکن جب عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو کوئی واحد طاقت ان سب قوانین و قواعد کو بالائے طاق رکھ کر خونریزی پر کمربستہ ہو جاتی ہے اور باقی طاقتیں منہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھ جاتی ہیں - اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی قواعد صرف

دھوکے کی ٹٹی ہیں جس کی آڑ میں بیٹھ کر دول یورپ پولیٹکل شکار کھیلا کرتی ہیں اور جب اُن کا جی چاہتا ہے علانیہ بھی خونریزی پر آمادہ ہو جاتی ہیں ـ ـ ـ الخ

"تقسیم بنگال" کے طے شدہ مسئلے کی تنسیخ کے بعد "مسلمانوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کوشش" کے عنوان سے نئی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ۲ فروری ۱۹۱۲ع کے طویل اداریے میں لکھا گیا :

سودے کے بہانے سے مجھے گھر سے نکالا
میں خوب سمجھتا ہوں تری دال میں کالا

ابلق لیل و نہار کی شوخیاں بھی قابل دید ہیں ـ ابھی رات تھی ابھی دن ہے ـ ابھی صبح تھی ابھی شام ہے ـ کسی چیز کو ثبات نہیں ـ کسی شے کو قیام نہیں ، تغیر و تبدل کا ایک سلسلہ نامتناہی ہے جو ازل سے لے کر ابد تک پھیلا ہوا ہے ـ اس پر بھی اگر کوئی شخص کسی بات کو "امر فیصل شدہ" سمجھے تو اس کی سادہ لوحی میں کسے شک ہو سکتا ہے ـ

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ع سے پیشتر کسی کو تقسیم بنگال کی تنسیخ کا گمان تک نہ ہوگا ـ جناب لارڈ مارلے سابق وزیر ہند ایک دفعہ نہیں ، دو دفعہ نہیں ، بلکہ متواتر اور بارہا اس امر کا اظہار فرما چکے تھے کہ تقسیم بنگال ایک طے شدہ امر ہے ـ اب اس کی تنسیخ یاترمیم کا دل میں وہم بھی نہ لانا چاہیے ـ لارڈ منٹو اگرچہ اپنے پیشرو لارڈ کرزن کی روش سے اختلاف رکھتے تھے لیکن ان کی پنج سالہ میعاد حکومت میں لارڈ کرزن کے عہد حکومت کے اس مہتم بالشان واقعہ یعنی تقسیم بنگال کی تنسیخ کے مسئلہ پر بحث کرنے کا خیال تک گورنمنٹ ہند یا وزارت ہند کو نہ ہوا ـ پارلیمنٹ میں جب بنگالیوں کے چند ہمدرد ممبروں کی طرف سے تقسیم بنگال کے خلاف آواز بلند ہوئی تو وزیر ہند بس یہی ایک جملہ پیشانی پر بل لا کر ارشاد فرما دیتے تھے کہ یہ ایک "امر فیصل شدہ" ہے ، اور یہ

سن کر وہ بیچارے ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ادھر ہندوستانیوں کو بھی تاروں کے ذریعہ سے خبریں مل جاتی تھیں کہ تقسیم بنگال کی سر زمین پر پتھر کی لکیر بن کر کھنچ گئی ہے۔ اب دست حسرت و کف افسوس ملنے سے شاید ہاتھ کی لکیریں مٹ جائیں تو مٹ جائیں مگر تقسیم بنگال کا معاملہ بنگالیوں کے لیے خط تقدیر بن گیا ہے۔ اگر قسمت بدل سکتی ہے تو تقسیم بنگال کی ترمیم و تنسیخ بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ع کو دربار قیصری میں جو شاہی اعلان اہل ہندوستان کو پڑھ کر سنایا گیا اُس نے ثابت کر دیا کہ خط تقدیر مٹ سکتا ہے۔ قسمت بدل سکتی ہے۔ ''امر فیصل شدہ'' امر غیر فیصل شدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور مسلمان جس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی قناعت اور وفاداری کی چادر تانے پڑے سوتے تھے اُس میں سے وہ

پا بہ دست دگرے دست بدست دگرے

باہر نکالے جا سکتے ہیں۔

ہم اُن کیفیات کا تجزیہ کرنے سے جو اس اعلان کو سن کر مسلمانوں کے قلب پر طاری ہوئیں ایک رستے ہوئے ناسور کو ایک اور چرکا نہیں لگانا چاہتے۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ گورنمنٹ عالیہ نے تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کلکتہ کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت قرار دینے میں جن پولیٹکل لغزشوں کا ارتکاب کیا ہے وہ اپنے پہلو میں بہت سے ایسے خمیازے چھپائے ہوئے ہے جو گورنمنٹ ہند کو مسلمانان ہند کے قلب کی غیر مطمئن کیفیت اور بنگالیوں اور اُن کے ہم نواؤں کے مزید نامتناہی مطالبات کی شکل میں رہ رہ کر کھینچنے پڑیں گے۔۔۔

آج کل مسلمانان ہند عجیب مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اگر خاموش رہتے ہیں تو اس کا کچھ اچھا نتیجہ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج کل اسی کا زمانہ ہے جو ذرا ہاتھ پاؤں اور زبان ہلائے۔ خاموش اور صابر آدمی اس تعلیم و تہذیب کے زمانے میں گونگا اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اگر غریب مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہاتھ پاؤں

ہلاتے ہیں تو انہیں کے بعض بھائی بند اُن کی روش کو ملک اور قوم اور گورنمنٹ کے حق میں خطرناک مشہور کر کے سرکاری حکام کی نظروں سے انہیں گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب بیچارے مسلمان حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں!

ستمبر ۱۹۳۱ع میں جب جاپان نے ہوس جوع الارض میں مبتلا ہو کر چین پر حملہ کیا تو ظفر علی خاں کا خامۂ حریت نواز، جو کبھی زار روس کے خلاف جاپان کی فتح پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسا چکا تھا، اب جاپان کی سامراجی حکمت عملی کے خلاف مظلوم چین کا ساتھ دیتا ہے اور دنیا بھر کی استعماری طاقتوں کے مکر و فریب کا پردا یوں چاک کرتا ہے:

"انصاف اور رحم کے جذبات نے اگر جہاں کشا اقوام میں سے ایک آدھ کے سینہ میں پرورش پائی ہو، تو یہ فسانہ عہد قدیم کی ایک دلآویز فصل ہے جو صرف آرائش سخن کا کام دے سکتی ہے۔ ورنہ آج انصاف کہاں اور رحم کیسا؟ یہ دونوں الفاظ تو تہذیب جدید کی لغات میں سرے سے مفقود ہیں، یا اگر ہیں تو شرمندۂ معنی نہیں۔ آج دنیا کا نظام حکومت جن اخلاقی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے، وہ غرق آہن جہاز ہیں، اژدردم توپیں ہیں، فلک پرواز طیارے ہیں، قطار اندر قطار عسکریوں کی جگر گداز سنگینیں ہیں، صف اندر صف پولیس کی جمعیت فرسا لاٹھیاں ہیں، جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیر دستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے ---- ملوکیت کا یہ عفریت لعین جس نے عسکریت کی گود میں پرورش پائی ہے، آج ربع مسکون پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کھا رہا ہے۔ مغرب اس خونخوار دیو کا زاد بوم تھا۔ کاش یہ اپنے ہی وطن میں رہتا، مگر اس نے ایشیا کو بھی اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرق اقصیٰ اس کی جہنمی

سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے - ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ع کی خونچکاں
تاریخ چین کے چالیس کروڑ باشندوں کو مدتوں نہ بھولے گی -
اس لیے کہ اس دن ان کی فوجی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر
جاپان کے عسکریت پرستوں نے جن کی نخوت کا سر روس کو نیچا
دکھانے کے وقت سے آسمان تک اونچا ہوگیا ہے ، کسی قسم کا
الٹی میٹم دیے بغیر ، کوئی معقول حجت پیش کیے بغیر دفعۃً ایک
ہی بے جگرانہ تاخت میں - - - اور تمام دوسرے اہم جنگی نقاط پر
قبضہ کر لیا ، اور اس بدعہدانہ یلغار میں قتل و غارت کے ایسے
ایسے آدمیت سوز نظارے دنیا کو دکھائے جو زمانہ قدیم میں تو
چنگیز اور ہلاکو نے دکھائے تھے یا حال میں یورپ کے سورماؤں
نے دکھائے ہیں -"

ظفر علی خاں کی ان صحافتی تحریروں (اداریوں) میں
جذبات بھی ھیں اور استدلال بھی - یہ دور ان دونوں کے
امتزاج کا تھا - ظفر علی خاں کو اس امر کا پورا پورا
احساس تھا کہ وہ اسلامیان ھند کے جذبات و احساسات کی
ترجمانی اور اُن کی رھنمائی کا فرض ادا کر رہے ھیں - یہ بات
جا بجا اُن کی تحریر و تقریر سے مترشح ھے - ایک صحیفہ نگار
کے لیے یہ بات ازبس ضروری ھے کہ اُس میں اور اُس کے
قارئین کے مابین ایک مضبوط ذھنی و قلبی رشتہ قائم ھو ، تاکہ
صحیفہ نگار جو کچھ لکھے اُس میں پوری قوم کی روح
بولتی ھو ، اُس کے افکار و خیالات قومی آرزوؤں کے آئینہ دار
ھوں - کوئی صحیفہ نگار اُس وقت تک کامیاب نہیں ھو سکتا
جب تک کہ اُس کا اشہب قلم قومی و ملکی ، سیاسی و
معاشرتی ، تہذیبی و تمدنی ، تعلیمی و اخلاقی ، مادی و روحانی ،

غرض کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر یکساں قدرت اظہار نہ رکھتا ہو، اور اُس کا نکتہ ور ذہن ان مسائل حیات کے بارے میں کوئی ایسا نقطۂ نظر پیش نہ کر دے جو اُس کے قارئین کے لیے قابل قبول ہو۔ اس لیے ایک کامیاب صحیفہ نگار کے لیے کائنات کے وسیع مشاہدے، زندگی کے بھرپور تجربے اور علم و فن کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت ضروری امر ہے، اور پھر جب تک ان مشاہدات، تجربات اور معلومات کا ذخیرہ اُس کے ذہن و قلب سے ہم آہنگی پیدا کرکے صفحۂ قرطاس پر نہیں آجاتا، اُس وقت تک صحیفہ نگاری کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ ایک اچھے صحافی کے سمعی و بصری حواس ہمہ تن چوکنے رہتے ہیں۔ اُس کی بصیرت و آگہی اُسے قدم قدم پر نئے نئے نکات سجھاتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے مسئلے سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی یکساں توجہ سے دیکھتا، سنتا اور اس پر غور و فکر کرتا ہے۔ چونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے جمہور کے لیے کہتا ہے، اس لیے اُس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کثیرالتعداد انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ صحافت کی اصل قوت بھی درحقیقت عوام ہی ہوتے ہیں اور صحیفہ نگار اس قوت کے امین اور پاسبان! ایک صحافی اور اُس کے قارئین کا رشتہ ایک معالج اور مریض کے رشتے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔ رفتار زمانہ کی نبض کو ٹٹولنا،

قارئین کے جذبات و احساسات کو سمجھنا ، اُن کو صحیح حالات سے باخبر رکھنا اور پھر اُن کی مناسب ذہنی تربیت کرنا ، یہ سب اہم فرائض ایک صحیفہ نگار کو انجام دینے ہوتے ہیں ۔ ان حالات میں ایک ضمیردار صحیفہ نگار اگر قوم کو بام ثریا پر لے جا سکتا ہے تو ایک بد طینت اور بے ضمیر صحیفہ نگار قوم کو تحت الثریٰ کی پستیوں میں بھی دھکیل سکتا ہے ۔ اس لیے ایک صحیفہ نگار پر از روئے انصاف بہت بڑی اخلاقی و معاشرتی ذمے داریاں بھی عاید ہوتی ہیں ۔ ”صحیح قسم کے صحیفہ نگار وہی لوگ ہیں جن کے دل اور دماغ اپنے ہیں اور جو اپنے خیالات کی اشاعت کی تڑپ رکھتے ہیں اور عسرت اور تنگدستی کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن انھیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے کا موقع ھاتھ آئے گا ۔ وہ اپنا فرض ایک قومی خدمت کی طرح انجام دیتے ہیں ۔ صداقت اُن کا شعار ہے ، آزادی اور حریت کے وہ علم بردار ہیں ۔ اُن کے فیصلے اٹل اور ارادے غیر متزلزل ہیں ۔ خود گمنامی میں رہ کر وہ دوسروں کو بام شہرت پر پہنچاتے ہیں ، اور جنبش قلم کی قوت سے بڑی بڑی شخصیتوں اور حکومتوں کو مصیبت اور ذلت میں مبتلا کر سکتے ہیں ۔ ظالم کے مقابلہ میں مظلوموں کی دستگیری ، امیر کے مقابلے میں غریبوں کی امداد اور باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کرنا اُن کے فرائض میں داخل ہے ۔ اُن کے راستہ میں

مشکلات ہیں لیکن انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی ' یہی لوگ دراصل صحیفہ نگار اور صحافت کے پاسبان ہیں ۔"[۱]

ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری میں حق پسندی اور حق گوئی کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ اُن کے افکار و خیالات میں ضمیر داری ' آزادیٔ رائے اور حریت پسندی کی لہر بڑی شدت سے رواں دواں ہے ' اور پھر یہ کہ اُن کے یہ افکار و خیالات عمومی جذبات و احساسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ۔ یہ بات انہیں اپنے عہد میں منفرد صحیفہ نگار بنا کر پیش کرتی ہے ۔ ۱۹۱۳ع میں جب "زمیندار" کی دس ہزار کی ضمانت اور پریس جس کا تخمینہ پندرہ ہزار تھا ' بحق سرکار انگریزی ضبط ہوگئے تو اس موقع پر ابوالکلام آزاد نے "الہلال" میں متعدد شذرات سپرد قلم کیے ۔ ایک شذرے میں وہ "زمیندار" کے اسلوب صحیفہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں ۔ "میں شخصاً زمیندار کی بہت سی کمزوریوں سے نہ صرف شاکی بلکہ واقعی طور پر متالم و متاذی تھا ۔ میں اس کے طرز تحریر و انشاء مضامین کو پسند نہیں کرتا تھا ۔ مجھے اس میں بہت زیادہ عامیت اور سوقیت نظر آتی تھی ۔ اس میں عوام کے مذاق کو بہت زیادہ دخل تھا اور حقیقت کبھی کبھی اس کے استیلاء سے دب بھی جاتی تھی ۔"[۲]

---

(۱) بدر شکیب ' اُردو صحافت ' صفحہ ۱۱

(۲) الہلال ' کلکتہ ' ۲۱ جنوری ۱۹۱۴ع

ابوالکلام آزاد کا یہ ارشاد خود اُن کی اور ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری کے درمیان حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابوالکلام جس بلند سطح سے خطاب کرتے ہیں اور جس طرح اپنی شخصیت کو سطح عام سے ماوراء رکھتے ہیں، اُس کا اقتضا یہی تھا کہ وہ اپنی صحیفہ نگاری کی اقدار اور معیار کو بھی عام سطح کے خس و خاشاک سے بلند رکھیں۔ انہیں کبھی عوام کے جذبات کی ترجمانی کی خواہش نہیں ہوئی۔ اُن کا ایک فکری نقطۂ نظر اور رومانی انداز بیان تھا۔ وہ ایک قلۂ کوہ پر کھڑے ہو کر قوم کو دعوت عمل دے رہے تھے اور اس بات سے قطعاً بے نیاز تھے کہ قوم اُن کی آواز پر لبیک کہہ کر اُن کا ساتھ دے گی یا نہیں۔ بہر کیف وہ اپنی انفرادیت کے کوڑے سے (جو رومانی ادیبوں کا خاصا ہوتا ہے) نیند کے ماتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے۔ "الہلال" (۱۹۱۳ء) میں ایک موقع پر جمہور کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگان خواب موت ہشیار ہو جائیں۔ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو درد ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے۔ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوال امت کے زخموں پر ناز ہے۔ کہاں ہیں وہ جگر جو آتش غیرت و حمیت کی سوزش سے لذت آشنا ہوں اور پھر آہ! کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار، اس برباد شدہ قافلے کے نالہ ساز،

اس صف ماتم کے فغاں سنج اور اس کشتیٔ طوفانی کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش، روتے ہیں یا مایوسی سے چپ وراست نگراں، مگر نہ ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ — دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیے ہیں اور گھر والے سوتے ہیں —!"

طرابلس اور بلقان کی آتش جنگ نے عالم اسلامی خصوصاً برعظیم کے مسلمانوں میں جوش و خروش اور حرکت و بیداری کی ایک تیز رو پیدا کر دی تھی۔ ابوالکلام آزاد بیداری و ہشیاری کی اس برق رو کو بھی ناکافی سمجھ رہے تھے اور قوم و ملت کی تساہل پسندی پر متاسف و متالم تھے۔ اسی زمانے کے "الہلال" کے ایک افتتاحیے میں فرماتے ہیں:

"افسوس اس دور جوش و خروش اور بیداری و ہشیاری میں بھی دیکھتا ہوں تو میرے دل کی غمگینی و اضطراب کا علاج کہیں نظر نہیں آتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا اگر بیداری کی کروٹیں لی بھی ہیں تو آنکھوں سے غفلت دوشیں کا خمار ابھی دور نہیں ہوا ہے۔ خواب غفلت کی سرشاری اور چشم نیم باز کی کروٹیں، یہ تو پہلی حالتیں ہیں، لیکن ان کے بعد ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے جو بستر سے تو اٹھ چکا ہے مگر منزل مقصود کے نشان سے بے خبر ہے —!"

الغرض ابوالکلام آزاد اتنی بلند و بالا سطح سے خطاب کرتے ہیں جہاں سے عوام کی سطح بہت ہی پست نظر آتی ہے اور یہ بُعد مکانی کبھی کبھی کچھ اس قدر بڑھ جاتا ہے

کہ بقول قاضی عبدالغفار ''ان کے افکار اُن کی زبان اور قلم سے ایک افسردہ اور رنگین راگ بن کر نکلنے لگتے ہیں۔''[1] ظفر علی خاں کے ہاں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو جمہور کے جذبات و احساسات کا نقیب اور اُن کے جوش و خروش میں شریک سمجھتے ہیں۔ اس طرح اُن کے افکار و خیالات عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔ وہ کسی لمحہ بھی اس گہرے رشتے کو فراموش نہیں کرتے۔ ظفر علی خاں کی یہ عمومیت پسندی اور ابوالکلام آزاد کی یہ انفرادیت پسندی اُن کی اپنی اپنی صحیفہ نگاری میں جھلکتی ہے۔ ظفر علی خاں اپنے معاصرین سے چشمکیں کرتے ہیں، اُن کی ہجویں بھی لکھتے ہیں اور اُنہیں لتاڑتے پچھاڑتے بھی ہیں لیکن ابوالکلام آزاد بعض اوقات دوسروں پر اس لیے تنقید و تعریض نہیں کرتے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی احساس برتری یا کم تری نہیں، بلکہ بقول قاضی عبدالغفار ''ایک ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے، جو میدان جنگ میں اس لیے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا!''[2]

اگر صحیفہ نگاری کے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ یہ جمہور کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے تو

---

(۱) آثار ابوالکلام آزاد: قاضی محمد عبدالغفار ص ۲۱۹

(۲) ایضاً ایضاً ص ۲۲۲

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس امر میں ظفر علی خاں زیادہ کامیاب ہیں ۔ ابوالکلام آزاد کی صحیفہ نگاری اُن کی شخصی خصوصیات، طبعی میلانات و رجحانات اور اُن کے رومانی انداز نگارش کی آئینہ دار ہے اور ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری جمہور کے جذبات و احساسات کی ترجمان ' اور اُن کے مخصوص جذبات انگیز لب و لہجے اور پرخروش انداز بیان سے معمور ہے ---!

جہاں تک محمد علی جوہر کی صحیفہ نگاری کا تعلق ہے ان کا میدان خاص انگریزی صحافت تھا ۔ ''کامریڈ'' میں اُن کے حریت پرور افتتاحیوں نے جہاں برعظیم کے تعلیم یافتہ افراد میں نئی روح پھونکی ' وہاں سامراج کے ایوانوں میں بھی ایک زلزلہ سا آ گیا ۔ محمد علی جوہر کے خامۂ خونچکاں نے پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شمولیت پر مسلسل کئی گھنٹوں میں ''چوائس آف دی ٹرک'' لکھا اور تاریخ صحافت میں ایک نادر روزگار کارنامہ سر انجام دیا ۔ الہلال کے اجرا کے چند روز بعد انھوں نے بھی جمہور کی ضروریات کے پیش نظر ''ہمدرد'' کے نام سے ایک اُردو روزنامہ جاری کیا ۔ میر محفوظ علی بدایونی ''ہمدرد'' کے مدیر تھے ۔ ''ہمدرد'' میں بھی عوام کے نقطۂ نظر سے مضامین لکھے جاتے تھے ۔ تاہم اس کو وہ شہرت و مقبولیت نصیب نہ ہو سکی جو ''زمیندار'' کے حصے میں اس کے دلکش انداز بیان کی وجہ سے آئی تھی ۔ اُردو

صحافت کے میدان میں ظفر علی خاں اس عہد میں سرخیل کی حیثیت رکھتے تھے - انھوں نے اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے علاوہ اسے مقبول خاص و عام بنانے کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ، وہ تاریخ صحافت کا ایک زندۂ جاوید کارنامہ ہیں -

ظفر علی خاں سے قبل اردو صحافت کا دائرہ زیادہ وسیع نہ تھا - اردو صحافت کی روایت کچھ اوپر اسّی برس ہو گئی تھی - اس دوران میں بے شمار صحیفے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے - لیکن معیار صحافت اور حلقۂ اثر کے اعتبار سے ان اخبارات کو کبھی وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو مثلاً ان کے ہم عصر انگریزی اخباروں کو حاصل تھا - ہفتہ وار پرچے بھی اخبار ہی کہلاتے تھے - روزانہ اخبارات کے وسائل بے حد محدود تھے اور وہ زیادہ تر انگریزی اخباروں کی باسی خبروں کے تراجم پر انحصار کرتے تھے - اداریوں میں بھی کوئی کشش اور دلچسپی کا سامان نہ ہوتا تھا - بیسویں صدی کے آغاز میں جب ملک ایک سیاسی اور سماجی انقلاب کے دروازے پر پہنچ چکا تھا ، ضرورت اس امر کی تھی کہ اردو صحافت میں بھی زندگی کی روح پھونکی جاتی اور اس کے معیار کو بلند کرکے اس کی اشاعت میں وسعت پیدا کی جاتی، تاکہ یہ بیداریٔ جمہور کا ایک اہم ذریعہ بن جاتا - اس مقصد کے لیے ظفر علی خاں بہت موزوں ثابت ہوئے - انھوں نے اردو صحافت

کی رہنمائی کر کے اسے اس بلندی پر پہنچا دیا کہ جس سے آگے وہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے ابھی تک نہیں بڑھ سکی۔[1] یہ ظفر علی خاں کا کارنامۂ خاص ہے کہ انھوں نے اردو صحافت کے ننھے سے پودے کو تناور درخت بنا دیا اور ایک مدت تک وہ اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔ ظفرعلی خاں ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ اُن کے اسلوب کی ساخت میں شخصی رجحانات، عصری میلانات اور جذباتی و فکری رویوں کے علاوہ اُن کی ہمہ زبانی نے بھی بڑا حصہ لیا تھا۔ وہ پنجابی نژاد تھے، لیکن اُردو پر انہیں قدرت کاملہ حاصل تھی اور اساتذہ اہل زبان بھی اُن کی زبان دانی کے معترف تھے۔ اُردو پر اس قوت کاملہ کے علاوہ ظفر علی خاں کو عربی، فارسی اور انگریزی زنوباں میں بھی خاصا درک حاصل تھا۔ ظفرعلی خاں کی اس زبان دانی نے بھی اُردو صحیفہ نگاری کی روایت کو عظیم تر بنانے میں حصہ لیا۔ اُردو صحافت میں نئی نئی

---

(۱) موجودہ صحافت خبروں کی بہم رسانی اور طباعت اور اشاعت کی بعض ٹیکنیکل سہولتوں کے اعتبار سے یقیناً پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ لیکن بعض امور میں اس نے ترقیٔ معکوس بھی کی ہے۔ مثلاً اب صحافت میں اُسلوب نگارش اور ادب و انشاء کا وہ معیار باقی نہیں رہا جو آج سے چند برس پہلے نظر آ جاتا تھا۔ کچھ فکر و احساس اور ذمے داری و ضمیر داری کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے موجودہ صحیفہ نگاری جمہور کی ترجمان تو کم نظر آتی ہے البتہ بعض وقتی مصالح اور ذاتی اغراض اس میں زیادہ کارفرما نظر آتی ہیں۔

اصطلاحیں، نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے محاورے اور الفاظ وضع کرنے اور انہیں فروغ دینے میں ظفر علی خاں نے بڑا اہم کام کیا ۔ اخبار کے نثری اسلوب کو دلکش بنانے کے علاوہ ظفر علی خاں نے صحافت میں عمدہ اور مؤثر شاعری کو بھی رواج دیا ۔ ''زمیندار'' کی اشاعت کی ترقی، اور اس طرح اردو صحافت کے فروغ میں اس چیز کو بھی بڑا دخل تھا ۔ اکثر اہل ذوق تو ''زمیندار'' کو پڑھا ہی اس لیے کرتے تھے کہ اس کی نظم و نثر کی لطافت و شیرینی سے محظوظ ہوں ۔ اخبار بینی کے اس شوق عام نے عوام میں اردو زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا اور اردو زبان کو برعظیم کے دور دراز گوشوں تک پھیلا دیا ۔

ظفر علی خاں کی صحیفہ نگاری میں ایک جوش اور ولولہ تھا ۔ یہ جوش اور ولولہ عصری حالات کا آئینہ دار تھا ۔ اس جوش و خروش میں حقیقت کہیں کہیں دب بھی جاتی تھی ۔ حالات کا تجزیہ بھی عقلی کم ہوتا تھا، جذباتی زیادہ، ایک بلند پایہ صحیفہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جذبے کے ساتھ ساتھ فکر سے بھی کام لے اور ہنگامی حالات سے اتنا نہ پسیج جائے کہ مستقبل کے امکانات ہی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہنگامی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے غور و فکر سے بھی کام لے اور مستقبل کی تعمیر کے لیے ملک و قوم کی رہنمائی کرے ۔ ظفر علی خاں کی

صحیفہ نگاری میں غور و فکر کے عنصر کی قدرے کمی محسوس ہوتی ہے ۔ اُن کی صحافت اور خطابت دونوں کے سلسلے ایک ساتھ ملے ہوئے تھے اور دونوں کا رخ ہنگامی حالات کی طرف زیادہ رہتا تھا ۔ با ایں ہمہ ' جہاں تک اُردو صحافت کی ترقی اور اس کے معیار کا تعلق ہے ' ظفر علی خاں نے اُردو صحافت کے دائرۂ اثر کو وسیع کرنے میں نمایاں حصہ لیا ۔ اُن کے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے ملک کے دور دراز گوشوں میں اخباری ذوق پیدا ہوا اور وہ احساس نمودار ہوا ' جس سے کچھ مدت کے بعد حقائق کا شوق اور غور و فکر کا رجحان خود بخود پیدا ہو جایا کرتا ہے ۔

ظفر علی خاں اُردو صحافت کو فن صحیفہ نگاری کی بلند تر منزلوں تک لے جانا چاہتے تھے ۔ اس مقصد کی خاطر جو جو وسائل اُن کو میسر آ سکے ، اُن کو اختیار کرنے میں پوری کوشش کی ۔ خبروں کی بہم رسانی اور عمدہ طباعت و اشاعت کا ہر ممکن بندوبست کیا گیا ۔ صحافت اور ادب کو باہم شیر و شکر کرنے کے لیے اچھے صحافیوں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئیں ۔ ظفر علی خاں خود مخزن علم و ادب تھے اور اہل علم و قلم کے بڑے قدر دان تھے ۔ اُن کی اس قدردانی نے ''زمیندار'' کو محض ایک اخبار ہی نہ رہنے دیا بلکہ یہ اُردو صحافت کا ایک معیاری مدرسہ بن گیا جس کے وہ خود بقول میکش

پرنسپل تھے[1] -

اس مدرسۂ صحافت میں کم و بیش چالیس برس تک صحافتی درس و تدریس کی شمع روشن رہی اور بہت سے بلند پایہ صحیفہ نگار یہیں سے تربیت پا کر اُردو صحافت کے آسمان پر انجمن آرا ہوئے - ظفر علی خاں اگرچہ بڑے مشہور و معروف صحافیوں کو ملک کے مختلف گوشوں سے چن چن کر ''زمیندار'' میں لاتے تھے ، لیکن وہ اخبار نویسی کے اُس معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے کہ جو خود اُن کو پسند تھا ، اور جس پر وہ زمیندار کو چلانا چاہتے تھے - اس لیے وہ ہر نئے آنے والے صحیفہ نگار کی تربیت اپنے پسندیدہ معیار کے مطابق کرتے - چنانچہ بہت سے نئے اور پرانے صحیفہ نگاروں نے ظفر علی خاں کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور اس چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر مختلف اُردو صحیفوں کی باگ ڈور سنبھالی !

غرض ''زمیندار'' اور ظفر علی خاں اُردو صحافت کی تاریخ میں ایک درخشاں باب اور عظیم الشان روایت کے حامل ہیں -

---

(۱) کئی برس ہوئے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (مرحوم) نے راقم سے عندالملاقات ''زمیندار'' اور ظفر علی خاں کی صحافتی خدمات کے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرماتے ہوئے ''زمیندار'' کو مدرسہ صحافت اور ظفر علی خاں کو اس مدرسے کا پرنسپل قرار دیا تھا - علاوہ برین اُنھوں نے از راہ عنایت اس مدرسے کی چند خصوصیات اور روایات پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی تھی - [نیز اس سلسلے میں دیکھیے ''مردم دیدہ'' از چراغ حسن حسرت] - انہی صحافتی خدمات کی وجہ سے قوم کی طرف سے ظفر علی خاں کو ''بابائے صحافت'' کا پُرمعنی خطاب دیا گیا -

غلامی و محکومی کی تاریک فضاؤں میں چراغ ہدایت روشن کرنے ، ظلم و استبداد کی قہرمانی قوتوں سے ٹکرانے اور باطل کے خلاف صدائے حق بلند کرنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ۔[1] اس مسلسل جدو جہد کا خمیازہ انہیں ضمانت ضبطیوں ، قرقیوں اور گرفتاریوں کی صورت میں بھگتنا پڑا لیکن انھوں نے اور ان کے بلند ہمت ساتھیوں نے نامساعد حالات میں بھی صدائے حق کے بلند کرنے میں کوتاہی نہ کی ۔ جنگ طرابلس و بلقان اور سانحہ مسجد مچھلی بازار کانپور کے موقع پر پے بہ پے زر ضمانت اور چھاپہ خانہ کی ضبطی ، تحریک خلافت و ترک موالات کے موقع پر ضمانت ضبطیوں کے علاوہ "زمیندار" کے سارے ایڈیٹروں کی یکے بعد دیگرے گرفتاری اس امر کا بین ثبوت ہیں ۔ سائمن کمیشن اور اس کے بعد تحریک نمک سازی (۱۹۳۰ء) میں بھی انہیں ابتلا و آزمائش کے کٹھن دور

---

(۱) ظفر علی خاں کی ان صحافتی خدمات کے بارے میں حریفوں کی رائے زیادہ مستند کہی جا سکتی ہے ۔ پروفیسر سمتھ لکھتے ہیں :

"Another influential paper of this period was the *Zamindar* of Lahore, edited by a born rebel, Zafar Ali Khan. He was profoundly anti-British, and his vigorous agitations had large influence. He was issuing 20,000 copies of his paper twice a day—an unheard-of circulation for the vernacular press; for the first time the Muslims of north India were awakening to a news-consciousness, and awakening mightily. They eagerly drank in the seditious propaganda that the *Zamindar* offered them."

[Smith, W.C., *Modern Islam in India*
Lahore, Ed. 1963.]

میں سے گزرنا پڑا ۔ اس دور کے دو شعر ہیں :

دل ضبط ، زباں ضبط ، فغاں ضبط ، قلم ضبط
دنیا میں ہوئے ہوں گے یہ ساماں کہیں کم ضبط
آنسو مری آنکھوں کے گئے پہلے ہی سے سوکھ
تھے ورنہ وہ اس فکر میں ان کا بھی ہو نم ضبط

اور یہ سب کچھ حق گوئی وہ حریت پسندی کے جرم کی پاداش میں ہو رہا تھا ۔

غرض ظفر علی خاں کے عہد ادارت میں "زمیندار" کی پوری تاریخ مسلسل قربانیوں سے بھری پڑی ہے اور اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ زمیندار کو زندہ رکھنے میں عوام الناس نے بھی ظفر علی خاں کا پورا پورا ساتھ دیا اور ہر موقع پر دامے ، درمے ، سخنے اُن کی مدد کی ، کیونکہ جمہور ظفر علی خاں اور "زمیندار" کی آواز کو اپنے من کی آواز سمجھتے تھے ۔ جمہور اور صحافت کے باہمی تعلق کی یہ عظیم الشان روایت اب ٹوٹ چکی ہے ۔ اخبار اب بھی نکلتے ہیں ، اور پہلے سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ نکلتے ہیں ، لیکن ان میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے ، جمہور کے دل کی دھڑکن بہت کم محسوس ہوتی ہے ۔ شاید اس لیے کہ اب جد و جہد کا وہ زمانہ بھی بیت چکا ہے ، اور اس کے ساتھ ہی زبان و قلم کے وہ معرکے بھی ٹھنڈے پڑ گئے ہیں جن کے عہد شباب کی داستان پارینہ "زمیندار" کے صفحات پر "گاہے گاہے باز خواں" کا نقش بن کر بیٹھ گئی ہے ۔

شور محشر

اِس باغ میں ہے کیسا یہ مجمع پریشاں
صورت سے فکر ظاہر چہروں سے غم نمایاں
لالہ کی طرح سب کے سینوں میں داغ تاباں
شبنم کی طرح سب کی آنکھوں سے اشک غلطاں

کیوں اوس پڑ گئی ہے اِس باغ پر یکایک
جاتی رہی وہ رونق باقی نہیں وہ خوشیاں
بجتے تھے جس میں کل تک شادی کے شادیانے
شان خدا وہیں ہیں ماتم کے آج ساماں

ماتم بھی ایک دو کا گر ہو تو صبر کر لیں
لیکن یہاں تو صدہا گھر ہو گئے ہیں ویراں
موت اور زندگی میں ہے ایک حد فاصل
لطف جناب باری یا قہر و خشم یزداں

قہر خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر
بن کر قضائے مبرم موسیٰ ندی کا طوفاں
وہ نہر شہر میں ہے جو مدتوں سے جاری
صدہا برس سے ہم پر جو کر رہی تھی احساں

تھا گھونٹ گھونٹ جس کا امرت سے ہم کو بڑھ کر
تھے جرعہ نوش جس کے یکساں گدا و سلطاں
یکساں عنایتیں تھیں خلق خدا پہ جس کی
ہم مشربوں میں جس کے تھے کفر اور ایماں

سمجھے ہوئے تھے جس کو ہم شہر کی رگ جاں
میں جس کے وصف میں تھا کل اس طرح غزلخواں

طبع شگفتہ میری صرف سخنوری ہے
منظور مجھ کو مشق افسون سامری ہے
چشمہ نکالنا ہے پتھر سے آج مجھ کو
موسیٰ سے آج مجھ کو کرنی برابری ہے
کس شان و تمکنت سے بہتی ہے نہر موسیٰ
لہرا رہی ہے ناگن یا جلوہ گر پری ہے
یا موج کہکشاں نے افلاک سے اُتر کر
کی ساحت دکن پر انوار گستری ہے
اے نہر تیرا پانی شیریں ہے اور گوارا
مصری کی اک ڈلی ہے جو تیری کنکری ہے
جاں بخش تیری لہریں دلکش تری روانی
قدرت نے تجھ کو بخشی کیا شان دلبری ہے
واشگری میں یکتا ساق گری میں پُرفن
گوہر سے خوش نما تر فیروزہ سے کھری ہے
موتی لڑھک رہے ہیں ہیرے چمک رہے ہیں
کیا کیا جواہروں سے جھولی تری بھری ہے
خدمت گزار تیرے باد صبا کے جھونکے
آئینہ دار تیرا خورشید خاوری ہے
تیری روانیوں میں رنگ مزاج جاناں
اور پیچ و خم میں تجھ کو کاکل سے ہمسری ہے
وقت خرام بستاں لیلیٰ کی شان تجھ میں
وقت گزار صحرا تو قیس عامری ہے
کھیتوں کی تجھ سے رونق باغوں کی تجھ سے زینت
دہقاں کو تو ہے زہرہ، سلطاں کو مشتری ہے

سوجوں کے آستاں پر سبزے کا لہلہانا
آب رواں کا آنچل جھالر ہری ہری ہے
جنگل میں ہو رہا ہے تیرے قدم سے منگل
تو وضع ایزدی ہے تو شان داوری ہے
چلمن پڑی ہوئی ہے تجھ پر کہیں کنول کی
اور نرسلوں سے تیری دہلیز اخضری ہے
عکس شفق سے تیری رونق ہوئی دوبالا
نکھری ہوئی ہے رنگت بکھری ہوئی زری ہے
ساون میں تو نے اوڑھا جب اگرئی دوپٹا
دنیا یہ سمجھی جوگن کے بھیس میں پری ہے
آتی ہے تو ازل سے جاتی ہے تو ابد کو
تیرا حدی سرا جوں اور ناقہ جنوری ہے
کرتا ہے فیض تیرا پیدا شجر حجر سے
عیسیٰ کا تو نفس ہے یا سحر سامری ہے
ہے تیری مچھلیوں پر ہم کو گماں انجم
گردوں پہ جن کا جھرمٹ صرف شناوری ہے
طبع رواں ہے میری یا آبشار تیرا
یا ساتگین قدرت انوار سے بھری ہے
تیرہ اُدھار سے ہیں نو نقد ہم کو اچھے
یہ وجہ ہے کہ کوثر پر تجھ کو برتری ہے
ہے رود نیل و گنگا سے بڑھ کے رتبہ تیرا
قامت کی کہتری سے قیمت کی بہتری ہے
اُس شہر یار کے گھر میں ہے گزار تیرا
جو نازش اماثل اور زیب سروری ہے
ہیں عتبہ بوس جس کے سال و مہ و شب و روز
حلقہ بگوش جس کا اک چرخ چنبری ہے

آصف کہ جس کے سر پر ہے سایہ کبریا کا
جس کی جبیں سے ظاہر شان سکندری ہے
جو کچھ کہا ہے میں نے اے نہر تیری نسبت
الزام شاعری ہے افسوس میری نسبت

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا
اُلٹا ہے تو نے تختہ یاران آشنا کا
ہم سے تو وہ وفائیں اور تجھ سے یہ جفائیں
بدلا دیا ہے تو نے اچھا ہمیں وفا کا
اچھا کیا ادا حق ہمسائگی کا تو نے
ہم تجھ سے لو لگائیں تو نے ہمیں کو تاکا
اِک کاروان آصف اُترا ترے کنارے
او ناسپاس تو نے ڈالا اُسی پہ ڈاکا
تیری ہر ایک ٹکر داعی بنی اجل کی
تیرا ہر ایک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا
منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر
سر پر ہے رات کالی طوفان ہے بلا کا
تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے
مورد ہو ناخدا کیوں الزام ناروا کا
شب ہے شب قیامت دن ہے حساب کا دن
وقت آ گیا سزا کا عہد آ گیا جزا کا
خالی اُمید کا گھر، دروازہ توبہ کا بند
آئے اثر کہاں سے موقع نہیں دعا کا
اِس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا
کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا

اُمڈی ہوئی ہے ندّی چھایا ہوا ہے بادل
پاٹ اِس قدر بڑھا ہے سب ہو گیا ہے جل تھل

ہے شب نے دن دہاڑے اندھیر ڈال رکھا
خورشید خاوری ہے ابر سیہ کے اوجھل
اکبارگی گئے کھل گردوں کے سب دریچے
بادل چلا ہے بن کر طوفان کا ہراول

قدرت کی طاقتوں کو دست قضا ہی روکے
انساں کی کوششیں ہیں بیکار اور معطل

غصے کا ہے یہ عالم کف در دہاں ہے ندی
وقف شکن ہیں ابرو ماتھے پہ ہیں پڑے بل

جوش و خروش اِس کا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے
سہمی ہوئی ہے خلقت ہوش، حواس ہیں شل

ساحل پہ گھر ہیں جن کے وہ دل میں کہہ رہے ہیں
مرنا ہمیں ہے آخر مرنا ہمیں ھے اول

پانی ہر اک طرف سے گھیرے ہوئے ہے گھر کو
جاں تلملا رہی ہے دل ہو رہے ہیں بیکل

گرنے لگے مکاں جب کہنے لگے مکیں سب
ہے آج کوچ اپنا ساماں چلا گیا کل

ہر ہر کھنڈر میں لاشے صدہا پڑے ہوئے ہیں
بلدہ کا ہر محلہ ہے کربلا کا مقتل

واں موجب اجل تھی پیاسوں کو تشنہ کامی
یاں باعث فنا ہے آب بقا کی چھاگل

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کوبکو ہے
شور نشور برپا بلدے میں سو بسو ہے

وا حسرتا وہ صدہا گھر بار کا اُجڑنا
ہر نخل آرزو کا بنیاد سے اُکھڑنا

وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا
کوہ قضا کا سر پر پل بھر میں ٹوٹ پڑنا

دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا
سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا
وہ جسم بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا
وہ جان ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا

اس ہاتھ کا، نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی
بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا
ماں سے لپٹ لپٹ کر بچے کا وہ بلکنا
اور ضد سے اس کے سینے پر ایڑیاں رگڑنا

بچے کا ہاتھ آ کر پھر ماں سے چھوٹ جانا
زخم جگر کے ٹانکوں کا یک بیک ادھڑنا
سب دل کے ولولوں کا پیوند آب کرنا
اک رات کی دلہن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا

وہ ڈوبتے ہوؤں کا سب کو سلام کرنا
اور ان کی حسرتوں کا جا کر دلوں میں گڑنا
تھا فتنۂ قیامت اے سیل رود موسیٰ
من کر ترا مچلنا بن کر ترا بگڑنا

شان جلال باری قہر خدا کا نقشہ
ہر لہر کا بپھرنا ہر موج کا اکڑنا
کیوں ساتھ ساتھ اپنے لے کر چلا نہ ہم کو
جو قافلہ چلا ہے سر منزل عدم کو

چمکے ہیں جو شرارے اڑ کر مرے بیاں سے
وہ مستعار میں نے مانگے ہیں سوز جاں سے
اِس مرثیہ میں میں نے رنگ انیس اڑایا
لایا ہوں اِس زمیں کو میں جا کے آسماں سے
پھر بھی نہیں ہے لیکن یہ غم وہ غم کہ جس کا
حق ہو ادا زباں سے یا چشم خونفشاں سے

منت کش شنیدن قصہ نہیں ہمارا
آتی ہے بوئے حسرت اِس غم کی داستاں سے

صدہا ہزارہا گھر ڈوبا ہوا ہے غم میں
کیا خاک اُن کی تسکیں ہو ایک نوحہ خواں سے

آئے قرار کیونکر اُن کے دل حزیں کو
بے خانماں جو ہو کر رخصت ہوئے مکاں سے

جینا ہے اُن کا مرنا اِس سے بھی بلکہ بدتر
جن کے عزیز پیارے گزرے ہیں اس جہاں سے

ایسی مصیبتوں کا جن سے فلک بھی کانپے
کیونکر مقابلہ ہو اک مشت استخواں سے

ندی کے دونوں جانب ہے ایک ہو کا عالم
حیراں ہے عقل آئے اتنے کھنڈر کہاں سے

منظر ہے عبرت افزا ٹوٹے ہوئے پلوں کا
وحشت برس رہی ہے ہر پل کی ہر کماں سے[1]

بازار اُجڑ گئے ہیں ویران ہیں دوکانیں
سنسان ہیں محلے رستے ہیں بے نشاں سے

پامال ہو گئی ہے بستی یہ آفتوں کی
تاراج ہو گیا ہے یہ گلستاں خزاں سے

اللہ کے کرم کے اُمیدوار ہیں ہم
مایوس کیوں ہو بندہ لطف خدایگاں سے

صدہا ہزارہا کو سیل بلا نے مارا
کچھ لوگ بچ کے نکلے اِس سخت امتحاں سے

کیا جانے پیش آتی کیا اِن کو گر نہ ہوتی
اُن کی جبیں کو نسبت آصف کے آستاں سے

---

(۱) دکن میں کماں محراب کو کہتے ہیں۔

طوفاں زدہ رعایا پہنچی ہے شہ کے در پر
بلبل کو ہے شکایت گلچیں کی باغباں سے

یہ محض ہے تصدق شہ کی عنایتوں کا
جو بچ رہے ہیں باقی ہیں امن اور اماں سے

لاکھوں ستم رسیدہ جو فاقہ کر رہے تھے
اٹھے ہیں سیر ہو کر اُس کے کرم کے خواں سے

ڈھکنے کو تن کے کپڑا جن کو نہ تھا میسر
جا جا کے وہ دوشالے لے آئے اُس کے ہاں سے

اُجڑا یہ شہر اُس نے پھر بات میں بسایا
دنیا ہوئی ہویدا جس طرح کن فکاں سے

ظلمت برس رہی تھی جن راستوں پہ کل تک
اب وہ تمام سڑکیں ملتی ہیں کہکشاں سے

احسان مانتے ہیں اپنے نظام کا ہم
منت پذیر دل کی زینت ہے امتناں سے

اظہار درد دل کو ہے جمع شہر سارا
یاں آج اُس کے حکم الطاف ترجماں سے

فیضان عام اُس کا مشہور ہے جہاں میں
برسائے اُس نے موتی دست گہر فشاں سے

جان اور دل نچھاور کر دے نہ کیوں رعایا
ہمدردیاں جب ایسی ظاہر ہوں حکمراں سے

ہم سب کو سیکھنا ہے اُس سے سبق کرم کا
جس طرح ذرہ چمکے خورشید خاوراں سے

جیبوں کو اپنی ہم بھی پیسوں سے کر دیں خالی
نکلے ہیں لعل و گوہر جس طرح بحر و کاں سے

مدراس و بمبئی سے جب آ رہے ہیں لاکھوں
لازم یہ ہے کروڑوں کا چندہ ہو یہاں سے

اشاریہ

مآخذ

۱- آزاد ، محمد حسین ، آب حیات ، مطبوعہ لاہور
۲- ابوالفضل ، آئین اکبری (اردو ترجمہ) مطبوعہ حیدر آباد (دکن)
۳- احسن مارہروی ، انشائے داغ ، ۱۹۴۱ء
۴- احمد شجاع ، حکیم ، خوں بہا ، لاہور ۱۹۴۳ء
۵- اسماعیل پانی پتی ، محمد : مکاتیب حالی
۶- اسماعیل میرٹھی ، کلیات
۷- اشرف عطا ، ظفر علی خاں ، لاہور
۸- اصغر حسین نظیر : تذکرۂ شعرائے جدید ، لاہور ۱۹۵۳ء
۹- اقبال ، ڈاکٹر شیخ محمد ، سر ، بانگ درا ، لاہور
۱۰- اقبال ، ڈاکٹر شیخ محمد ، سر ، بال جبریل ، لاہور
۱۱- اکرام ، ڈاکٹر ، شیخ محمد ، آب کوثر ، لاہور ۱۹۵۲ء
۱۲- اکرام ، ڈاکٹر ، شیخ محمد ، موج کوثر ، لاہور ۱۹۵۲ء
۱۳- اکبر الہ آبادی ، لسان العصر ، کلیات (۳ حصے) مطبع اسرار کریمی الہ آباد ۱۹۴۰ء
۱۴- امین زبیری ، محمد ، مکاتیب محسن الملک و وقارالملک
۱۵- امین زبیری ، سیاست ملیہ ، ۱۹۴۱ء
۱۶- بادشاہ حسین ، اردو میں ڈراما نگاری ، ۱۹۳۵ء
۱۷- باری علیگ ، کمپنی کی حکومت ، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء
۱۸- بدر شکیب ، اردو صحافت ، ۱۹۵۲ء
۱۹- جواہر لال نہرو ، میری کہانی (اردو ترجمہ۔۲ جلد) ۱۹۴۶ء
۲۰- چکبست ، برج نرائن : صبح وطن (مجموعہ کلام) الہ آباد

۲۱- حالی ، الطاف حسین ، حیات جاوید ، ۱۹۰۳ء
۲۲- حالی ، الطاف حسین ، مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ وحید قریشی ، ڈاکٹر) ، لاہور ۱۹۵۳ء
۲۳- حسرت ، چراغ حسن ، مردم دیدہ ، لاہور ۱۹۳۹ء
۲۴- حسرت موہانی ، کلیات ، لاہور
۲۵- رشید احمد صدیقی ، طنزیات و مضحکات ،
۲۶- رضا علی ، سر سید ، اعمال نامہ ، ۱۹۴۳ء
۲۷- زور ، محی الدین ، ڈاکٹر ، روح تنقید ، ۱۹۴۰ء
۲۸- سالک ، عبدالمجید ، سرگزشت ، لاہور ۱۹۵۴ء
۲۹- سرور ، آل احمد ، نئے اور پرانے چراغ ، دہلی ۱۹۴۶ء
۳۰- سلیمان ندوی ، سید ، حیات شبلی ، اعظم گڑھ
۳۱- سودا ، محمد رفیع ، کلیات ، نولکشور لکھنئو
۳۲- سید احمد خاں ، مجموعہ لیکچرز ، ۱۸۹۲ء
۳۳- سید احمد خاں ، آخری مضامین
۳۴- سید احمد خاں ، مضامین تہذیب الاخلاق ، لاہور
۳۵- شبلی نعمانی ، محمد ، شعرالعجم (۴ جلد) اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء
۳۶- شبلی نعمانی ، محمد ، مقالات (تنقیدی) ، اعظم گڑھ
۳۷- شبلی نعمانی ، محمد ، الفاروق ، اعظم گڑھ
۳۸- شورش کاشمیری ، آغا عبدالکریم ، مولانا ظفر علی خاں ، لاہور ۱۹۵۷ء
۳۹- طفیل احمد منگلوری ، سید ، مسلمانوں کا روشن مستقبل ، ۱۹۴۰ء
۴۰- ظفر علی خاں ، خیابان فارس ، حیدر آباد ۱۹۰۲ء
۴۱- ظفر علی خاں ، معرکۂ مذہب و سائنس ، لاہور ۱۹۱۰ء
۴۲- ظفر علی خاں ، جنگل میں منگل ، لاہور
۴۳- ظفر علی خاں ، سیر ظلمات ، لاہور

۴۴- ظفر علی خاں ، جنگ روس و جاپان ، حیدر آباد ۱۹۰۵ء ،
لاہور ۱۹۱۴ء
۴۵- ظفر علی خاں ، سید جمال الدین افغانی ، لاہور ۱۹۱۴ء
۴۶- ظفر علی خاں ، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ، لاہور
۴۷- ظفر علی خاں ، میری عینک ، لاہور
۴۸- ظفر علی خاں ، معاشرت ، لاہور ۱۹۱۳ء
۴۹- ظفر علی خاں ، سنہرا گونگا ، لاہور
۵۰- ظفر علی خاں ، روح معانی ، لاہور ۱۹۲۰ء
۵۱- ظفر علی خاں ، غلبۂ روم ، لاہور ۱۹۲۶ء
۵۲- ظفر علی خاں ، لطائف الادب ، لاہور ۱۹۲۵ء
۵۳- ظفر علی خاں ، حقیقت و افسانہ ، لاہور ۱۹۴۰ء
۵۴- ظفر علی خاں ، حقائق و معارف ، لاہور ۱۹۴۰ء
۵۵- ظفر علی خاں ، جواہرالادب ، لاہور
۵۶- ظفر علی خاں ، حبسیات ، لاہور ۱۹۲۶ء و ۱۹۶۳ء
۵۷- ظفر علی خاں ، بہارستان ، لاہور ۱۹۳۷ء و ۱۹۶۵ء
۵۸- ظفر علی خاں ، نگارستان ، لاہور ۱۹۴۲ء و ۱۹۶۳ء
۵۹- ظفر علی خاں ، چمنستان ، لاہور ۱۹۴۴ء و ۱۹۶۳ء
۶۰- ظفر علی خاں ، ارمغان قادیاں ، لاہور
۶۱- عابد حسین ، ڈاکٹر ، سید ، ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب ،
جامعہ ملیہ ، دھلی
۶۲- عبداللہ ، ڈاکٹر ، سید ، اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ، لاہور ۱۹۴۱ء
۶۳- عبداللہ ، ڈاکٹر ، سید ، چند نئے اور پرانے شاعر ، لاہور ۱۹۶۵ء
۶۴- عبداللہ ، یوسف علی ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی
تاریخ ، الہ آباد ۱۹۳۶ء
۶۵- عبدالحق ، ڈاکٹر ، مولوی ، چند ہم عصر ، ۱۹۳۷ء

۶۶- عبدالرزاق کانپوری ، یاد ایام ، حیدرآباد ۱۹۴۶ع

۶۷- عبدالغفار ، قاضی ، آثار ابوالکلام آزاد ، ۱۹۴۰ع

۶۸- عبدالغفار ، قاضی ، آثار جمال الدین افغانی ، ۱۹۴۰ع

۶۹- عبدالغفر ، قاضی ، حیات اجمل ، علی گڑھ ۱۹۵۰ع

۷۰- عبدالقادر سروری ، جدید اردو شاعری ، حیدر آباد ۱۹۳۲ع

۷۱- عبدالماجد دریابادی ، خطوط مشاہیر ، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور

۷۲- عتیق صدیقی ، محمد ، ہندوستانی اخبار نویسی ، علی گڑھ ۱۹۵۷ع

۷۳- غالب ، اسد اللہ خاں ، دیوان ، مطبع نظامی ، بدایون

۷۴- فوق ، محمد دین ، اخبار نویسوں کے حالات زندگی ، لاہور ۱۹۱۲ع

۷۵- مجنوں گورکھپوری ، ادب اور زندگی ، ۱۹۴۴ع

۷۶- محمد شاہ ، سید ، اقبال پر ایک نظر ، لاہور ۱۹۴۴ع

۷۷- ملا ، آنند نرائن ، مضامین چکبست ، ۱۹۳۶ع

۷۸- نورالرحمٰن ، حیات سر سید ، علی گڑھ ۱۹۵۰ع

79. Browne, E. G.; *The Persian Revolution (1905-1909)*, London 1910.

80. Curzon, G. N.; *Persia and the Persian Question*, London 1892.

81. Draper, Dr. J. W.; *A History of the Conflict between Religion and Science*, London 1882.

89. Hunter, W. W.; *The Indian Mussalmans*, London 1872.

83. Kipling, Rudyard; *The Jungle Book*, London 1894.

84. Lajpat Rai, Lala; *Unhappy India*, Calcutta 1928.

85. Murray, J. Middleton; *The Problems of Style*, London 1922.

86. O'Dwyer, Sir Michael; *India as I knew it*, London 1925.

87. Smith, W. C., *Modern Islam in India*, London 1946, Lahore 1963.

88. Sunderland, J. T.; *India in Bondage*, Calcutta 1929.

89. Zafar Ali Khan; *Al-Farooq* (Tr.), Lahore 1939.

(اخبارات و رسائل)

۹۰- احسان (روزانہ) لاہور، متفرق پرچے
۹۱- ادب لطیف (ماہنامہ) لاہور متفرق پرچے
۹۲- ادبی دنیا (ماہنامہ) لاہور، اکتوبر ۱۹۵۳ء و متفرق پرچے
۹۳- الہلال، البلاغ (ہفتہ وار) کلکتہ، ۱۹۱۲ء-۱۹۱۴ء
۹۴- امروز (روزانہ) لاہور، متفرق پرچے
۹۵- انقلاب (روزانہ) لاہور، متفرق پرچے
۹۶- پنجاب ریویو (ماہنامہ) لاہور، ۱۹۱۰ء-۱۹۱۱ء
۹۷- تاریخ و سیاسیات، کراچی، مئی ۱۹۵۲ء
۹۸- چٹان (ہفتہ وار) لاہور، ۸ و ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء و متفرق پرچے
۹۹- دکن ریویو (ماہنامہ) حیدرآباد و بمبئی، متفرق پرچے
۱۱۰- زمیندار (ہفتہ وار و روزانہ) کرم آباد، لاہور، ۱۹۱۰ء-۱۹۵۵ء
[بعض جلدیں نامکمل]
۱۰۱- ستارۂ صبح (ہفتہ وار و روزانہ) کرم آباد، لاہور، ۱۹۱۶-۱۹۱۸ء
[مکمل]
۱۰۲- سہیل، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۲۶ء
۱۰۳- شاہکار، لاہور، اپریل ۱۹۳۵ء
۱۰۴- شیرازہ (ہفتہ وار) لاہور، متفرق پرچے
۱۰۵- عالم گیر (ماہنامہ) لاہور، متفرق پرچے
۱۰۶- علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء-۱۹۵۵ء
۱۰۷- کریسنٹ، فروغ اردو نمبر، لاہور، ۱۹۳۹ء
۱۰۸- لمعات (روزانہ) لاہور، ۱۹۱۵ء متفرق پرچے
۱۰۹- مخزن (ماہنامہ) لاہور، ۱۹۰۱ء-۱۹۴۹ء متفرق پرچے
۱۱۰- نوائے وقت (روزانہ) لاہور، متفرق پرچے
۱۱۱- نیرنگ خیال (ماہنامہ) لاہور، متفرق پرچے

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	[illegible]	شخصنوں	شخصیتوں
۹	۹	حاجی امداد علی	حاجی امداد اللہ
۵۷	۲۱	انکا	انکار
۹۰	۳	نحمد	محمد
۱۲۱	۱۱	تہنایوں	تنہایوں
۱۲۲	۱۰	مام	عام
۱۲۲	۱۹	جھکابا	جھکایا
۱۷۸	۲۸	قایم	قائم
۱۸۳	۱	لو	کو
۱۸۶	۲۵	ہنیوں	ٹہنیوں
۱۸۹	۱۷	حانا	جانا
۱۹۳	۱۷	لردنیں	گردنیں
۲۱۸	۱۱	ہوٹل سے سے	ہوٹل سے
۲۲۲	۹	پر	پہ
۲۲۳	۲۴	پر	پہ
۲۲۴	۱۸	پہ	پر
۲۲۵	۶	دبی	دبی
۲۳۲	۷	۹۱۷ع	۱۹۱۷ع
۲۴۲	۶	مرکب	مرکب
۲۵۴	۵	مغربی	مغربی
۲۸۲	۳	ثخیف	سخیف
۲۸۷	۲۶	نہس	نہیں
۳۲۹	۱۲	زنوباں	زبانوں

مکتبہ خیابان ادب اور ایجنسی کی مطبوعات

ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیفات

- اشارات تنقید .... ۸ روپے
- ولی سے اقبال تک .... ۸ روپے
- تعلیمی خطبات .... ۱۸ روپے
- اردو ادب ۱۸۵۷ء سے اب تک .... ۷ روپے

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تصانیف

- شاہ حاتم — حالات و کلام .... ۹ روپے
- مضامین سر سید — منتخبات تہذیب الاخلاق ۵ روپے
- خیالات آزاد (نواب سید محمد آزاد) .... ۵ روپے
- نذر رحمٰن .... آفسٹ کاغذ ۲۵ روپے
  کارٹریج کاغذ ۳۵ روپے

ممتاز منگلوری کی تالیفات

- اندر سبھا (امانت لکھنوی) .... ۳٫۵۰ روپے
- باغ و بہار (میر امن دہلوی) .... ۶ روپے
- نوابی دربار (سید محمد آزاد) .... ۳٫۵۰ روپے
- سوغات .... ۷ روپے
- فردوس بریں (شرر لکھنوی) .... ۳ روپے

- قاموس الاصطلاحات شیخ منہاج الدین ۳۰ روپے
- نفسیات پروفیسر سی اے قادر ۱۱ روپے
- قانونی لغت تنزیل الرحمٰن ۱۲ روپے

جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور